

محبت ایسا دریا ہے

Season 2



از فضلہ بتول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محبت ایسا دریا ہے (سیزن 2)

از فضلہ بتول

ہماری ویب میں شائع ہونے والے ناولز کے تمام جملہ و حقوق بمعہ مصنفہ کے نام محفوظ ہیں۔ ہمیں اپنی ویب نیو ایرا میگزین (New Era Magazine) کیلئے لکھاریوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ہماری ویب پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل، شاعری، پوسٹ کروانا چاہیں تو اردو میں ٹائپ کر کے مندرجہ ذیل ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں بھیج سکتے ہیں۔

(Neramag@gmail.com)

(انشا اللہ آپ کی تحریر ایک ہفتے کے اندر اندر ویب پر پوسٹ کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات کیلئے اوپر دیئے گئے رابطے کے ذرائع کا استعمال کر سکتے ہیں۔

شکریہ ادارہ: نیو ایرا میگزین



شہر اقتدار پر امارس کی رات اتری تھی۔ آسمان پر دھند میں لپٹے مدھم ستارے جیسے اونگھ رہے تھے۔ سردی کی شدید لہر نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ گزشتہ روز ملکہ کوہسار میں بر فباری کے باعث اسلام آباد میں درجہ حرارت منفی ایک تک جا پہنچا تھا۔ ابھی رات کے گیارہ ہی بجے تھے اور سڑکوں کی سنسانیت دیکھ کر یوں گمان ہوتا تھا کہ جیسے مانو آدھی رات بیت چکی ہو۔ ہر سو ایک گہرا سناٹا طاری تھا۔ جیسے کبھی کبھی کسی سردی کے مارے کتے کی چیّاؤں توڑنے کی کوشش کرتی۔ اس سرد ترین رات میں سی ڈی زے آفیس سے متصل ایدھی ہوم کا ادھیڑ عمر چوکیدار صدر دروازے سے ملحق اپنے چھوٹے سے کیمین کے باہر چھوٹے سے اسٹول پر سکڑا بیٹھا تھا۔ اسکے سامنے زمین پر پڑے ٹین کے چھوٹے سے کنستر میں کونسلے دھک رہے تھے۔ جسم پر ایک گرم اونی سویٹر اور جیکٹ ہونے کے باوجود سردی کم نہ ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا اسٹول کنستر کے اور قریب کھسکایا اور ہاتھ سینکنے لگا۔ کبھی کبھی وہ سردی کی شدت سے جھلا کر بڑبڑاتے ہوئے موسم سے اپنی ماں بہن کا رشتہ ظاہر کر دیتا۔ کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ سڑک پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ چوکیدار کے کان کھڑے ہو گئے۔ گاڑی محض دو تین سیکنڈ کیلئے رکی اور پھر دوسرے ہی لمحے زن سے نکلتی چلی گئی۔ حالانکہ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، یہ سروس روڈ ایک چلتی شاہراہ تھی دن رات یہاں سے سینکڑوں گاڑیاں گزرتی تھیں مگر نجانے کیوں اس وقت اس گاڑی کے رکنے اور جانے کی آواز نے چوکیدار کو

تجسس میں مبتلا کر دیا۔ وہ اٹھا اور اپنی گن شانے سے لٹکا کر گیٹ سے متصل چھوٹا سا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ نجانے کیوں آج سڑک کنارے لگے بجلی کے کبے روشن نہ تھے۔ عمارتوں کی بیرونی روشنیاں سڑک کو روشن کرنے میں ناکافی تھیں۔ اس نے اپنے موبائل کی ٹارچ روشن کر کے روشنی کا دائرہ ارد گرد گھمایا۔ یکلخت وہ چونک سا گیا۔ دائیں جانب سیاہ رنگ کے کپڑوں کا ایک ڈھیر سا پڑا تھا۔ چوکیدار کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور کپڑوں کے ڈھیر کے قریب رک کر روشنی ماری۔ اسے پھر حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ کیونکہ یہ محض کپڑوں کا ڈھیر نہیں بلکہ انسانی وجود تھا جو اوندھا پڑا تھا۔ وہ بے تحاشہ اکڑو بیٹھا بائیں ہاتھ میں موبائل تھام کر دائیں ہاتھ سے اسے سیدھا کیا۔ وہ ایک جوان العمر عورت تھی جو بادی النظر میں تو مردہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اسکی ہاتھ کے قریب ہاتھ لے جا کر اسکے تنفس کی آمدورفت کو چیک کرنا چاہا۔ سانس بہت مدہم تھی۔ مگر چوکیدار کو یک گونہ تسلی ہوئی کہ وہ زندہ تھی۔ اس نے بڑی پھرتی سے اسے ہاتھوں میں اٹھایا اور اسے لیئے اسپتال کی طرف چلا آیا۔ اس لڑکی کو فوراً طبی امداد بہم پہنچائی گئیں۔ ہوم کی انچارج میڈم آمنہ بھی فوراً وہیں چلی آئیں تھیں۔ ابتدائی معائنے سے یہ معلوم ہوا کہ لڑکی حال ہی میں زچگی کے مرحلے سے گزری ہے اور بہت کمزور ہے۔ میڈم آمنہ نے اس لڑکی کو ترحم آمیز نظروں سے دیکھا جس کے چہرے پر کم عمری اور معصومیت کی داستان رقم تھی۔ وہ شاید ایک قبول صورت لڑکی رہی ہوگی مگر فی الوقت تو

وہ ایک زرد چہرے والی لاغر، فاقہ زدہ لڑکی اور صدیوں کی بیمار لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے اس لڑکی کے ہوش میں آنے پر انکو فوری مطلع کرنے کی ہدایت جاری کی اور اپنے آفیس میں چلی آئیں۔



ایہا نے زور و شور سے بجتے فون کا ریسپور کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں بولی۔ ہیلو۔

ہیلو! کیسی ہو ایہا؟ روحی بات کر رہی ہوں دوسری جانب روحینہ کی فریش سی آواز سن کر وہ مسکرا اٹھی اور ریسپور کان سے لگائے لگائے قریب ہی رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

اسلام علیکم! میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟

ایک دم فٹ۔ تم اپنی طبعیت کا سناؤ۔ ڈاکٹر کے پاس باقاعدگی سے جا رہی ہوں ناں؟

جی جی۔ کل ہی گئی تھی۔ اور طبعیت آج کل کچھ ڈاؤن ہے شاید موسم کی تبدیلی کی وجہ سے۔ اس نے تفصیل بتائی۔

اوہو تو تم ریسٹ کیا کرو ناں یار۔ آگے ہی اتنی ویک ہو۔۔۔ مجھے یقین ہے تم اپنی ہیلتھ کو اگنور کر رہی ہو۔ روحینہ فکر مندی سے بولی۔

نہیں ایسی بات نہیں ہے روحینہ۔ میں اپنا خیال رکھتی ہوں لیکن تھوڑی بہت اونچ نیچ تو چلتی ہی ہے ناں۔

ہاں یہ تو ہے۔ لیکن تم اپنا بہت سا خیال رکھا کرو۔ ولی بھیا کیسے ہیں؟
بلکل ٹھیک ہیں۔ آج صبح ہی آپ کو یاد کر رہے تھے۔

Aaww my sweet bro

اچھا ابیہا تم لوگ اسلام آباد کب آؤ گے؟

پتہ نہیں۔ ولید سے پوچھوں گی۔ خیریت ہے ناں؟

ہاں ہاں بلکل خیریت ہے۔ اصل میں سعدیہ آنٹی شادی کی ڈیٹ لینے آنا چاہ رہی ہیں۔ روحینہ نے اپنے ہونے والی ساس کا تذکرہ کیا۔

واہ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ میں ولید سے بات کرتی ہوں ہم انشاء اللہ ضرور آئینگے۔ اور اگر ولید نہ بھی آسکے تو میں ضرور آؤں گی۔ ابیہا کو دلی مسرت محسوس ہوئی تھی۔

ہاں شیور اور یار ولی بھیا جب گھر آئیں تو ان سے میری بات یاد سے کروادینا۔
ممی کو بھی ان سے بات کرنی ہے۔ اور ہاں ایک بات تو بتانا بھول ہی گئی جولائی کے فرسٹ ویک میں جمیلہ خالہ اور لیلیٰ پاکستان آرہے ہیں۔ روحینہ نے اپنی کینیڈا مقیم خالہ کا تذکرہ کیا۔

یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ایسا نے خوشی کا اظہار کیا۔

اچھا یار اب میں کال بند کرتی ہوں۔ تم یاد سے میری بات ولی بھیا سے کروادینا اور اپنا بہت سارا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔

اللہ حافظ۔ اس نے ماؤتھ پیس میں کہا اور ریسور کریڈل پر ڈال دیا۔



بیٹا آپ کا نام کیا ہے؟ ڈاکٹر نے انتہائی مشفق لہجے میں اس لڑکی سے پوچھا جو گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سوال پر اس نے گردن گھما کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھیں ہر طرح کے جذبات سے عاری تھیں۔

آپ کا نام کیا ہے بیٹے؟ ڈاکٹر نے پھر اسی لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔ وہ کچھ نہ بولی۔

بولیں بیٹا۔ میڈم آمنہ نے اسکے شانے پر ہاتھ رکھا۔

پتہ نہیں وہ بہت مدھم آواز میں بولی۔

آپ کو یاد ہے کہ آپ کو یہاں کون چھوڑ کر گیا تھا؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔

پتہ نہیں۔ اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

ہوں۔ ڈاکٹر نے ہنکارا بھرا اور میڈم آمنہ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے کمرے سے باہر نکلا۔

میڈم میرا خیال ہے کسی حادثے سے گزرنے کی وجہ سے جزوی طور پر انکی یادداشت متاثر ہوگئی ہے۔ بہر حال بات نیورو سرجن معائنہ کر کے ہی بتا سکیں گے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ کراچی گئے ہوئے ہیں اور انکی واپسی میں ابھی پانچ دن باقی ہیں۔ ڈاکٹر نے میڈم آمنہ کو بتایا۔

چلیں وہ بھی واپس آجائینگے، سب سے اہم بات تو اس وقت یہ ہے کہ اس بچی کے ورثاء کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے تھانے کے انچارج کو بلوایا ہے اسکے علاوہ اخبارات میں بھی اشتہارات دینے کا ارادہ ہے۔ اگر بچی کے ورثاء مل جائیں تو اچھا ہوگا۔ نجانے کون ہے بیچاری اور کون اتنی سرد رات میں اس حالت میں اس کو سڑک پر ڈال گیا۔ میڈم آمنہ کے لہجے میں ترحم آمیز تاثر تھا۔

یس میڈم! نجانے یہ دنیا میں یہ بے حسی کی کیسی ہوا چل پڑی ہے۔ ڈاکٹر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

واقعی ڈاکٹر۔ اور ہم سے بہتر انسانی رویوں کی بے حسی کون سمجھ سکے گا۔ دن رات ایسے کئی دکھیا رہے ہمارے پاس آتے ہیں۔ میڈم آمنہ کا لہجہ یاسیت لیئے ہوئے تھا۔

اللہ غریقِ رحمت کرے ایدھی صاحب کو جنھوں نے ہمیں انسانیت سے محبت کا درس دیا۔

آمین! میڈم آمنہ نے عقیدت سے کہا۔ خیر میں اپنے کین میں ہوں جب تھانے کے انچارج تشریف لائیں گے تو تب آپ کو طلب کر لوں گی۔ انھوں نے ہدایت جاری کی۔

بہتر میڈم۔ ڈاکٹر نے مؤدبانہ لہجے میں کہا اور وہ دونوں مخالفت سمتوں میں مڑ گئے۔



آج روحینہ کا فون آیا تھا۔ رات کے کھانے کی میز پر ایسا نے ولید کو بتایا۔ ویری گڈ۔ کیا کہہ رہی تھی؟ کیسی ہے وہ ولید کا دھیان کھانے کی طرف تھا۔ بتا رہی تھی کہ سعدیہ آنٹی اگلے ہفتے شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آنا چاہ رہی ہیں۔ اسی سلسلے میں ممی نے آپ سے بات کرنی ہے۔

اچھا۔ میں پھر پہلے ممی کو کال کر لوں بعد میں کھانا ختم کروں گا۔ وہ ڈائننگ روم سے نکل کر لاؤنج میں آ بیٹھا۔

ہیلو! ممی اسلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ وہ ماں کی آواز سن کر خوشگوار لہجے میں بولا۔ ایسا بھی وہیں چلی آئی۔ ولید فون پہ مصروف تھا۔ وہ چپ چاپ ایک جانب صوفے پر بیٹھ گئی۔

جی جی۔۔۔۔۔ ویری گڈ۔۔۔۔۔ ضرور ممی۔۔۔۔۔ کوشش کروں گا۔۔۔۔۔ ستمبر کی

تاریخ دے دیں مئی۔۔۔۔۔ جی مجھے چھٹیاں مل جائیں گی۔۔۔۔۔ جی جی۔۔۔۔۔ اوہ
 خالہ آرہی ہیں۔۔۔۔۔ اچھا چلیں ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ہاں تو۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔ تو آپ
 لوگ بھی آجانا پھر۔ ایسا کو بھی کمپینی مل جائیگی۔۔۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے وہ۔۔۔۔۔
 جی ڈائٹ بھی پراپر ہے۔۔۔۔۔ جی جی مئی میں اتنا بھی کیئر لیس شوہر نہیں
 ہوں۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ چلیں ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ اوکے۔ سب کو میرا سلام دیجئے گا۔ اور
 اپنا خیال رکھیے گا۔ اوکے اللہ حافظ۔ وہ بہت خوشگوار موڈ میں بات ختم کر کے
 اسکی طرف متوجہ ہوا۔

مئی کو یہ فکر ہے کہ کہیں میں تمہاری طرف سے لاپرواہی تو نہیں برت رہا۔ وہ
 ہنس کر بولا۔
 NEW ERA MAGAZINE
 Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews
 مئی بہت اچھی ہیں۔ وہ بھی مدھم سا مسکرائی۔

آخر کو میری مئی ہے۔ وہ فرضی کالر جھاڑ کر بولا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ تم نے کھا لیا
 کھانا؟

جی۔

اچھا پھر آؤ کمپینی دو مجھے۔ وہ اسکا ہاتھ تھام کر اسے زبردستی ڈائننگ روم میں
 لے آیا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھا لیا۔

مئی بتا رہی تھیں کہ جمیلہ خالہ بمعہ فیملی پاکستان آرہی ہیں اگلے مہینے۔

جی۔ روحینہ نے بتایا تھا مجھے۔

ہوں۔ اور خالہ سیدھا لاہور ہی آئیگی سو انکی مہمان نوازی کی ذمے داری ہم پر
آن پڑی ہے۔ اس نے عادتاً نوالہ اسے کھلایا تھا۔

یہ تو اچھی بات ہے۔ میں سارا دن اکیلی بور ہوتی ہوں۔ وہ لوگ آجائینگے تو گھر
میں رونق ہو جائیگی۔

ہاں میں نے ممی سے کہا ہے کہ وہ لوگ بھی کچھ روز کیلیئے ادھر ہی آجائیں
جب خالہ آئیگی۔ چند دن اکٹھے انجوائے کر لینگے۔

ہاں اور روحینہ کی شادی کا کیا کہہ رہی تھیں ممی؟ اس نے پوچھا۔
یار وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ مجھے کب چھٹیاں مل سکتی ہیں سو میں نے
ان کو ستمبر کا کہہ دیا ہے۔ تب تک تمہاری طبعیت بھی اسٹیبل ہو جائے گی۔ اس
نے کھانا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

آپ کیلیئے چائے بناؤں؟ اس نے پوچھا۔

نہیں دل نہیں کر رہا۔ آؤ کوئی مووی دیکھتے ہیں۔ وہ کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
ایسا بھی اٹھی۔

مووی کا دل نہیں کر رہا۔ باہر چلیں واک کرنے۔ چھاؤنی کی صاف ستھری سڑکوں
پر واک کرنا ایسا کو بہت اچھا لگتا تھا۔

او کے میڈم جو آپکا حکم۔ چلیں۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر مؤدبانہ انداز میں بولا۔
چلیں۔ میں چادر اوڑھ کر آتی ہوں۔ اس نے مسکرا کر کہا اور ڈائننگ روم سے
باہر نکل گئی۔ ولید جیب سے موبائل نکال کر چیک کرنے لگا۔



اخبارات میں اشتہارات دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میڈم۔ اس طرح کی
لڑکیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی لیئے ہی تو انکے گھر والے انہیں یوں
پھینک جاتے ہیں۔ اگر یہ اتنی ہی اپنے ماں باپ کے آنکھوں کا تارا ہوتی تو کوئی
اسکو یوں سرد رات میں مرنے کے لیئے سڑک پر نہ پھینک جاتا۔ میری مائیں تو
اس بیچاری کو کراچی بھیج دیں۔ ادھر اپنا گھر میں جہاں اتنے لاوارث پل رہے
ہیں یہ بھی پل جائے گی۔ تین چار دن کی اوپری اوپری کاروائیوں کے بعد
تھانے کے انچارج نے میڈم آمنہ کو مشورہ دیا تھا۔ ایک لاوارث اور اپنے نام
تک سے نا آشنا لڑکی کے وارثین کو ڈھونڈنے میں کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی
تھی۔ میڈم آمنہ کو بھی یہ مشورہ بہتر لگا اور اس لڑکی کو چند دنوں کے اندر ہی
اندر کراچی بھیج دیا گیا۔ یہاں نیورو سرجن نے اسکا باقاعدہ تفصیلی معائنہ کر کے
یہ رپورٹ دی کہ دوران زچگی کسی شدید شاک کے باعث یہ لڑکی جزوی طور
پر اپنی یاداشت کھو چکی ہے۔ انکے مطابق ایسے مریضوں کی یاداشت دھیرے
دھیرے بحال ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ساری عمر ایسے ہی بتا
دے۔ اپنا گھر میں رضاکارانہ طور پر کام کرنے والی خواتین نے مشترکہ مشاورت

سے اس لڑکی کا نام سلمیٰ رکھ دیا تھا اور اسے زندگی کی طرف واپس لانے کی کوشش کرنے لگیں۔



پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں۔۔۔۔

کوئی جدا کرنے نہ پائے۔۔۔۔

میں بھولوں تو میں مرجاؤں۔۔۔۔

ولید پلیز۔۔۔۔۔ ابیہا نے اسے بے اختیار ٹوکا۔

کیا ہوا؟؟ ولید جو بہت ترنگ میں اسے گانا سنا رہا تھا چونک پڑا۔

یہ مرنے ورنے کی باتیں مت کیا کریں آپ۔۔ وہ جھلا کر بولی۔

پگلی۔۔۔۔۔ یہ تو صرف ایک گانا ہے۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

جو بھی ہو لیکن آپ اپنے مرنے کی باتیں مت کیا کریں۔

اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں سچ مچ تم سے پہلے مرجاؤں۔ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

تو مرنے سے قبل مجھے بھی گولی مار دیجئے گا۔ وہ یکدم روتے ہوئے اٹھ کر بھاگتے ہوئے بالکونی میں نکل گئی۔ ولید نے ایک طویل سانس بھری اور اٹھ کر اسکے پیچھے آیا۔ وہ رینگ کے پاس کھڑی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

آئم سوری۔۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا تو ایسا نے مڑ کر اسکی طرف دیکھا۔

صرف چار ماہ ہوئے ہیں ہماری شادی کو اور آپ مرنے کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ یہ، سراسر ظلم ہے۔۔ وہ روئے ہوئے لہجے میں بولی۔

موت برحق ہوتی ہے بیا۔ ایک فوجی کی بیوی کو موت سے خائف نہیں ہونا چاہیئے۔ ولید کے لہجے میں سختی در آئی۔

میں آپکو کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اسکی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

تو کرو تصور۔۔۔۔ اور یہ رونا بند کرو۔ بلاوجہ کی بسورتی ہوئی لڑکیاں مجھے بالکل نہیں پسند۔ اس نے اس کے سر کو ٹھوکا دیا۔

آپ اتنے کٹھور کیوں بن رہے ہیں۔ اسنے اپنی بھیگی پلکے اٹھا کر انتہائی معصومیت سے پوچھا تو ولید کو وہ اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

کٹھور نہیں حقیقت پسند بن رہا ہوں۔ تم ایک فوجی کی بیوی ہو۔ اپنے ذہن کو ہر وقت موت کے لیئے تیار رکھا کرو۔ اس نے نرمی سے اسکے آنسو اپنی پوروں پر سمیٹتے ہوئے کہا۔

مجھے آپ سے بات ہی نہیں کرنی۔ وہ رخ موڑ کر کھڑک ہو گئی۔

بات بے شک مت کرو لیکن رخ مت پھیرا کرو غصہ آجاتا ہے مجھے۔ اس

نے اسکا رخ اپنی جانب موڑا۔

آپکو میرا بلکل احساس نہیں ہے۔۔۔ وہ خفا ہوئی۔

اور کوئی الزام؟

آپکو مجھ سے پیار بھی نہیں ہے۔۔۔

بلکل۔۔۔ زہر لگتی ہو تم مجھے۔ اب وہ بہت ہشاش بشاش لہجے میں بول رہا تھا۔

مجھے بھی آپ بلکل اچھے نہیں لگتے۔۔۔ اس نے بھی بدلا چکایا۔

افسوس کہ اس نا پسندیدہ ترین شخص سے آپکی شادی کروادی گئی ہے۔۔۔ وہ ہونٹوں کے گوشوں میں مسکراہٹ دبا کر بولا۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

آپکی بھی تو ایسی لڑکی سے شادی ہوگئی ہے جو آپکو زہر لگتی ہے۔۔۔ ایسا اس کا موڈ سمجھ چکی تھی سو مزے سے بولی۔

ظلم ہو گیا ہے ہم دونوں کے ساتھ۔۔۔ وہ مصنوعی دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

آپ منائیں یہ دکھ۔۔۔ میں سونے لگی ہوں۔ وہ کہتے ہوئے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ولید اسکے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

وہ لائٹس بند کر کے لیٹ گئی۔ کمرے میں صرف بالکونی سے چھن کر آتی چاند

کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی جس میں سب کچھ غیر واضح تھا۔ ولید اسکے

سرہانے جا بیٹھا اور گنگنانے لگا۔

میں بھولوں تو میں مر جاؤں۔۔۔

تو بھولے تو تو مر جائے۔۔۔۔

ایہا نے کانوں پر تکیہ رکھ لیا۔ ولید نے ان دو مصروں کی تکرار کرتے ہوئے
تکیہ جھپٹ کر دور اچھال دیا۔

آپ میں آدھی رات میں مہدی حسن کی روح کیوں آگئی ہے۔ وہ جھلا کر بولی۔
تم نے مجھے ناپسند کیوں کہا؟ اب میں ساری رات تمہارا سر کھا جاؤں گا۔ وہ
جیسے لڑنے پر آمادہ تھا۔

آپ نے بھی تو مجھے زہر کہا تھا۔ اس نے ماتھے پر بل ڈالے۔
مذاق کیا تھا ناں۔ اس نے آنکھیں نکالیں۔

تو میں نے بھی مذاق ہی کیا تھا۔ اب پلیز سونے دیں مجھے۔ وہ اکتا کر بولی۔
گانا تو سن لو۔ اس نے پیار سے اسکے بال سہلائے۔

اچھا۔۔ چلیں سنائیں۔ اس نے اس کے شانے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ولید نے
بیڈ کے کراون سے ٹیک لگالی اور اس کے بال سہلاتے ہوئے مدھم اور گھمبیر
لہجے میں اسے گانا سنانے لگا۔ وہ چند ہی منٹوں میں گہری نیند سو گئی تھی۔



وہ چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھی اپنی ہاتھوں کی لکیروں میں نا جانے کیا کھوج رہی تھی ٹی وی مناسب آواز میں چل رہا تھا اور وہاں بیٹھی سبھی عورتیں آپس میں گپ شپ میں مصروف تھیں۔

بھارتی فوج کہ نکیاں سیکٹر پر بلا اشتعال فائرنگ پانچ سپاہی زخمی۔ نیوز کاسٹر کی تیز سائرن کے جیسی آواز پر اس لڑکی نے ایک جھٹکے سے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر ٹی وی اسکرین کی جانب دیکھ رہی تھی۔

جہاں بھارت کی جانب سے ایل او سی پر اشتعال انگیز فائرنگ کے متعلق بتایا جا رہا تھا اور اسکرین پر نظر آتے مناظر میں بارڈر پر گشت کرتے پاک فوج کے بہادر جوان نظر آرہے تھے۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی پھر اٹھ کر خواب کے عالم میں چلتی ہوئی ٹی وی کے قریب آئی۔ تب تک خبر ختم ہو چکی تھی ٹی وی پر مناظر تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ یکدم چیخنے لگی اور زور زور سے رونے لگی۔ ہنستی مسکراتی عورتیں اسکی جانب متوجہ ہو گئی۔ وہ منہ سے کچھ ناقابل فہم سی آوازیں نکال کر رو رہی تھی۔

ارے ارے کیا ہوا؟ امینہ نامی ادھیڑ عمر عورت نے اسکے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیئے۔

وہ۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔ وہ ٹی وی اسکرین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بولی۔

بس بیٹا بس۔ چلو ادھر بیٹھو۔ ٹی وی بند کر دو لڑکیوں اور اس کے لیے پانی لاؤ۔ انھوں نے لڑکوں کو ہدایت جاری کرتے ہوئے اسے صوفے پر بٹھایا۔

لو بیٹا پانی پیو۔ امینہ نے پر شفقت انداز میں گلاس اسکے لبوں سے لگایا وہ ڈری ڈری نظروں سے ادھر ادھر تکتے ہوئے غٹا غٹ سارا گلاس چڑھا گی اور پھر صوفے کی پشت پر سر رکھ کر ہانپنے لگی۔ اسکے چہرے پر نقاہت کے آثار تھے۔ کچھ کھاؤ گی بیٹا؟ انھوں نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

نہیں۔۔۔۔۔ وہ چونک کر بولی پھر اٹھ کر کمرے سے نکل گی۔

بیچاری۔ امینہ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ باقی سب کے چہروں پر بھی اس لڑکی کیلئے رحم اور ہمدردی کے تاثرات تھے۔



محض ایک دن کی چھٹی لے کر ولید ایہا کے ساتھ اسلام آباد آیا تھا۔ اسی روز شام کو روحینہ کی ساس آئیں اور باہمی مشاورت کے ساتھ ستمبر کی پندرہ تاریخ طے کر گئی۔ ولید کو لاہور کیلئے نکلنا تھا مگر ایہا ایک دو دن اپنے میکے میں گزارنا چاہتی تھی۔ ولید نے کوئی اعتراض نہ کیا اور صبح صبح لاہور کیلئے نکل گیا۔ ایہا دوپہر کے وقت ڈرائیور کے ساتھ اپنے میکے چلی آئی۔ عامر اور ابو گھر پر نہ تھے۔ دادو اور امی صحن میں تخت پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بھی سلام کر کے وہیں بیٹھ گئی۔

کھاتی پیتی نہیں ہے کیا اتنی کمزور ہو گئی ہے۔ دادو نے فکر مندی سے اس کے زرد چہرے کی جانب تکتے ہوئے پوچھا۔

یہ تو صدا کی لاپرواہ ہے اماں جان۔ امی نے اٹھ کر کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

اپنا خیال رکھا کر ناں بیٹا۔ دادو نے نرم لہجے میں کہا تو اس نے سر ہلادیا۔
ولید تیرا خیال نہیں رکھتا کیا؟ کچھ لمحوں بعد دادو نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا تو وہ ہنس دی۔

وہ تو بہت خیال رکھتے ہیں میرا دادو مگر ان کے پاس وقت کی قلت ہوتی ہے، اس لیے مجھے اپنی صحت کی طرف سے لاپرواہی برتنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس نے مزے سے بتایا۔

بہت فخر کی بات ہے ناں یہ۔ امی نے کچن سے آتے ہوئے اسے گھورا۔ انھوں نے ہاتھوں میں ایک پلیٹ تھام رکھی تھی جس میں سیب کاشوں میں کاٹ کر سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔

افوہ امی! میں نے نہیں کھانا سیب۔ چائے پلوادیں ناں۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔
امی نے پلیٹ اس کے سامنے فرش تخت پر رکھی۔

کوئی نہیں پینی چائے۔ چائے سے صحت تھوڑا ہی بنتی ہے۔ یہ لو کھاؤ۔ انھوں نے

ارے دادو شکر تو ہر وقت کرتی ہوں اللہ کا مگر-----

نیہا آپنی کا کیا حال ہے امی کافی دن ہو گئے بات نہیں ہوئی ان سے۔ اس نے
چند ثانیے بعد پوچھا۔

ٹھیک ہی ہوگی۔ ادھر تو دو ماہ سے نہیں آئی۔ فون بھی اسکا زبیر نے بند کر دیا ہے۔ امی نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

یہ کیا بات ہوئی امی آپنی پھپھو کے گھر کی بہو ہیں یا قیدی۔ دادو آپ بات کیوں نہیں کرتی پھپھو سے۔

وہ کچھ سننے کو تیار ہو تو کہو ناں۔ دادو نے بھی مایوسی سے کہا۔

آپ تو اس طرح مت کہیں دادو۔ آپ سب سے بڑی ہیں۔ پھپھو پر آپ کی

بات کا ضرور اثر ہوگا۔

کوئی اثر نہیں ہوتا کسی پر۔ آپا تو اب پروں پر پانی بھی نہیں پڑنے دیتی۔ تمہارے ابو گئے تھے پچھلے ہفتے مگر زبیر اور آپا نے بجائے انکی کچھ سننے کے نیہا کی شکایتوں کے انبار لگا دیئے۔ آپا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ انہیں اس طرح کی بہو کی کوئی ضرورت نہیں ہے چاہیں تو نیہا کو ہمیشہ کیلیئے اپنے ساتھ لے جائیں۔ تمہارے ابو بے چارے بھی کیا کرتے چپ چاپ واپس چلے آئے۔ بیٹی بیاہ کر ہم تو اپنے ہاتھ کٹا بیٹھے ہیں۔ امی جانے کب سے بھری بیٹھیں تھیں، اسکے سامنے پھٹ ہی تو پڑی تھیں۔

یہ تو بالکل غلط طریقہ ہے پھپھو لوگوں کا۔ یہ تو یوں لگتا ہے جیسے ہماری فیملی سے کوئی پرانا بدلہ نکال رہا ہے۔

تیری شادی جمیلہ کی نند کے بیٹے سے نہ کرنے کا بدلہ لے رہی ہے اور کیا۔ دادو نے جلے ہوئے انداز میں کہا تو ابیہا کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

ویسے عامر بالکل ٹھیک کہتا ہے کہ پھپھو پوری ڈرامہ کوئین ہیں۔ وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی تو کوئی کچھ نہ بولا۔



میرے خیال کے مطابق آپ کو اپنی شادی کی شاپنگ کے لیئے کپڑوں کی خریداری لاہور سے کرنی چاہیئے۔ وہاں ورائٹی بھی بہت اچھی ملتی ہے اور اسلام

آباد کے مقابلے پہ دام بھی مناسب ہوتے ہیں۔ وہ اور روحینہ ٹی وی لائونج میں بیٹھی روحینہ کی متوقع شادی کی تیاریوں کے متعلق گفتگو کر رہی تھیں جب ایہا نے اسے مشورہ دیا۔ قریب ہی کاؤچ پر شزاء نیم دراز ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ایہا کی بات پر اس نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ جو اس وقت سفید رنگ کے سادہ سے کاٹن کے شلوار قمیص میں ملبوس بالکل عام سی نظر آرہی تھی۔۔۔ ناقابل توجہ۔۔۔

اچھرہ اور انارکلی سے تمہی شاپنگ کر سکتی ہو ایہا۔ ہمیں مڈل کلاس عورتوں کی طرح دکانداروں سے قیمت پر جھگڑنا نہیں آتا۔ بظاہر مسکراتے ہوئے اس نے درحقیقت اس پر طنز کیا تھا۔

میں اچھرہ یا انارکلی کی بات کر بھی نہیں رہی شزاء بھی میں نے اب تک کینٹ ایریا کے علاوہ کچھ دیکھا ہی نہیں لاہور میں۔ ولید بتاتے ہیں کہ کپڑوں کی شاپنگ کے لیئے لاہور بیسٹ ہے۔ اس نے سادہ لہجے میں جواب دیا۔ شزاء ایک لمحے کو چپ ہو گئی شاید وہ یہ بھول گئی تھی کہ سامنے بیٹھی لڑکی اب عام سی مڈل کلاس ایہا نہیں بلکہ کیپٹن ولید حسن کی بیوی تھی۔

یار جب لیلیٰ اور جمیلہ خالہ آئینگی ناں پھر میں بھی لاہور آؤنگی تمہارے پاس۔ خالہ لوگ تو ویسے بھی ڈائریکٹ لاہور میں ہی لینڈ کرینگے تو تم لوگوں کے ہاں ہی ٹھہریں گے۔ میں بھی آجاؤں گی تو کافی مزہ آئے گا۔ لیلیٰ کو لاہور بھی

گھمائیں گے اور شادی کی شاپنگ بھی کریں گے۔ روحینہ نے ایہا کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

یہ جمیلہ خالہ ڈائریکٹ لاہور کیوں لینڈ کریں گی روحی؟ شزاء نے ناک چڑھا کر پوچھا۔

خالو کی قبر ہے لاہور میں اور خالہ کے کچھ سسرالی رشتہ دار بھی اس لیئے وہ جب جب پاکستان آتی ہیں سب سے پہلے لاہور ہی جاتی ہیں۔ روحینہ نے اسے بتایا۔

آئی سی۔۔ شزاء نے نزاکت بھرے انداز میں اپنی گردن کو خم دیا اور پھر سے ٹی وی اسکرین کی جانب متوجہ ہو گئی۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

آپکی خالہ کے کتنے بچے ہیں روحینہ؟ ایہا نے پوچھا۔

بس ایک بیٹی ہے لیلیٰ۔ ولی بھیا کی ہم عمر ہیں۔

اچھا۔

اصل میں خالو ہمیشہ سے کینیڈا میں ہی مقیم تھے۔ لیلیٰ بھی وہیں پیدا ہوئیں۔

جب وہ دو سال کی تھیں تو خالو کو کسی کام سے چند دنوں کے لیئے پاکستان آنا پڑا اور اپنے قیام کے دوران ہی ایک روز اچانک ہارٹ اٹیک سے انکی وفات ہو گئی۔ تب خالہ کو سب نے کہا کہ وہ مستقلاً پاکستان آجائیں مگر وہ چند دن

یہاں گزار کر واپس چلی گئیں۔ خالو کی کافی جائیداد تھی سو انکے لیئے وہاں رہنا بھی اتنا مشکل نہ تھا۔ خالہ لیلیٰ کو کبھی پاکستان نہیں لے کر آئیں۔ انہوں نے اس کو بالکل وہاں کے ماحول کے مطابق پالا ہے۔ مکمل آزادی کیساتھ۔ روحینہ نے اسے تفصیل بتائی۔

یعنی آپ اپنی کزن سے کبھی نہیں ملیں۔

نہیں فیس ٹو فیس تو کبھی ملاقات نہیں ہوئی مگر ویڈیو کال پر کافی بار بات ہوتی رہی ہے۔ شی از آ نائس گرل۔ ڈریس ڈیزائنر ہے۔ اینڈ یونو وہ اسپیشلی تم سے ملنے پاکستان آرہی ہیں۔

مجھ سے ملنے۔۔؟ ایہا کو حیرت ہوئی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ہاں۔ وہ ایکچوئیلی ولی بھیا سے بہت انسپارڈ ہے حالانکہ ولی بھیا سے اسکی ایک دو بار ہی بات ہوئی ہوگی مگر وہ انکے کلچرڈ اور مینرڈ انداز سے بہت متاثر ہوئی۔ جب سے اس نے تمہارے متعلق سنا ہے تو اسے تجسس ہے کہ وہ لڑکی کون ہے جس نے ولید حسن کے دل کو فتح کر لیا۔ میں نے تو کہا تھا کہ تصویریں بھیج دیتی ہوں مگر اس نے کہا کہ وہ خود آکر تم سے ملے گی۔ روحینہ نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔

مایوسی ہی ہوگی اسکو ویسے۔ شزاء نے طنزیہ لہجے میں لقمہ دیا تو ایہا کے چہرے ک رنگ تاریک ہو گیا۔ وہ ایک دم اٹھی اور کمرے سے چلی گئی۔

بری بات ہے شزاء بھابھی۔ آپکو اسے اس طرح نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ روحینہ نے متاسف لہجے میں کہا۔

میں تو سچ کہتی ہوں۔

جی نہیں آپ اسکی دل آزاری کرتی ہیں۔ روحینہ کو اسکا ہتک آمیز انداز ایک آنکھ نہ بھایا تھا سو فوراً جتا دیا۔ جواباً شزاء نے لاپرواہی کے اظہار میں شانے جھٹکے اور ٹی وی اسکرین کی جانب متوجہ ہو گئی۔ روحینہ تاسف سے سر ہلاتی اٹھ کر کمرے سے چلی گئی۔



دو دن کا کہا تھا آج تین دن ہو گئے ہیں۔ کب واپس آؤ گی تم؟ ولید اس کے سامنے تھا۔ کچھ خفا خفا سا۔۔۔ ابیہا نے لیپ ٹاپ کی اسکرین ذرا آگے کی طرف جھکائی اور بستر کے کراؤن سے ٹیک لگالی۔

کل آجاؤں گی۔

رہنے دو۔ میرا پرسوں پنڈی کا چکر لگے گا تو واپسی پر تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔

یہ تو بہت اچھا ہے۔ مجھے روحینہ کیساتھ مزید کچھ وقت مل جائے گا۔ وہ مزے سے بولی۔

روحینہ کے ساتھ وقت گزارنے کی کتنی خوشی ہو رہی ہے اور روحینہ کے بھائی کا کیا؟ اس نے پیشانی پر بل ڈالے۔

چند ماہ بعد وہ بیاہ کر امریکہ چلی جائیگی ولید پھر کہاں موقع ملے گا ان سے ملنے کا۔

ارے تو امریکہ کونسا دور ہے۔ تم دسمبر کی چھٹیوں میں اس سے ملنے چلی جایا کرنا۔ ولید نے چٹکی بجاتے حل پیش کیا۔

واہ بڑے فالتو پیسے ہیں کیا آپ کے پاس۔

سب کچھ تمہارا ہی ہے وانٹی۔ یہ بندہ بھی اور اس کے پیسے بھی۔ وہ شرارت آمیز مسکراہٹ کیساتھ بولا تو وہ ہنسنے لگی۔

ویسے آپکی اطلاع کے لیئے عرض ہے کہ مجھے آپ کے پیسوں سے نہیں آپ سے محبت ہے۔

آئی لو یو ٹو۔ وہ برجستگی سے بولا تو ابیہا منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہنستے بے دم ہو گئی۔

آپ کتنے بڑے ایکٹر ہیں ولید۔ اس نے بمشکل ہنسی روک کر کہا۔

زیادہ کھی کھی مت کرو اب سو جاؤ کافی ٹائم ہو گیا ہے۔

ابھی نیند نہیں آرہی مجھے۔

نو بہانے بازی۔ چپ کر کے سو جاؤ۔ رات کو دیر تک جاگنے سے صحت گرجاتی ہے اللہ حافظ۔

اف کسی بھی لڑکی کی شادی فوجی سے نہ ہو۔ ہر وقت نظم و ضبط لیکچر۔۔۔ صحت اور فٹنس کی فکر۔ وہ منہ بنا کر بولی۔

اب تو ہو گئی ہے شادی اب کچھ نہیں ہو سکتا سو صبر کرو اور اب میں لاگ آف کر رہا ہوں بائے بائے۔ وہ تیز تیز بولتے ہوئے واقعی لاگ آف کر گیا تھا۔ ایہا نے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو گھورا اور پھر اسے شٹ ڈاؤن کر کے پرے کھسکایا اور نیم دراز ہو گئی۔ نیند تو اسے واقعی نہ آرہی تھی مگر ولید کو میسج یا کال کرنے کا مطلب تھا حفظانِ صحت کے اصولوں پر پورے ایک گھنٹے کا لیکچر۔۔۔ سو اسے موبائل اٹھایا اور یکم کھینے لگی کہ وقت گزاری کا اس سے اچھا طریقہ اور کوئی نہ تھا۔



روحینہ بتا رہی تھیں کہ آپکی کزن لیلیٰ خصوصی طور پر مجھے دیکھنے اور ملنے کے لیئے پاکستان آرہی ہیں۔ وہ پنڈی سے لاہور واپس جارہے تھے ولید اپنی گاڑی میں آیا تھا اور اسی پہ واپسی تھی وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایہا اسکے برابر بیٹھی تھی۔

ہیں وہ کیوں؟ تم کیا کسی نایاب نسل کا بندر ہو جس کو دیکھنے کے لیئے دور

دور سے لوگ آرہے ہیں؟ ولید نے مضحکانہ انداز میں پوچھا۔

جی نہیں۔ وہ ایکجونیلی آپ سے بہت انسپارڈ ہیں تو دیکھنا چاہتی ہیں کہ آپ جیسے کلچرڈ اور مینرڈ انسان کی بیوی کیسی ہے۔ ابیہا نے خود کو نایاب نسل کا بندر سے تشبیہ دیئے جانے کا بالکل بھی برا مانے بغیر اسے بتایا۔

لیلیٰ مجھ سے انسپارڈ ہے۔ یہ میرے لیئے بالکل نئی اطلاع ہے۔ ولید نے شانے اچکا کر کہا۔

دور دور تک شہرت پھیلی ہوئی ہے آپ کی۔

بس کبھی غرور نہیں کیا۔ اس نے اک شان بے نیازی سے کندھے جھٹکے۔ ویسے لیلیٰ کو تمہیں دیکھنے کا اتنا شوق کیوں ہے؟ روجی نے اس کو ہماری شادی کی تصویریں نہیں بھیجیں کیا؟

نہیں۔ روحینہ نے کہا تھا انہیں کہ تصویریں بھیج دیتی ہیں مگر انہوں نے منع کر دیا اور کہا کہ وہ خود کر فیس ٹو فیس ملیں گی۔ ابیہا نے اسے بتایا۔

کمال ہے بھی۔ ولید نے تعجب کے اظہار میں شانے اچکائے۔



میں انکو پسند تو آ جاؤنگی ناں ولید؟ چند لمحوں بعد اس نے اپنے مخصوص کم اعتمادی سے پر لہجے میں پوچھا۔

کن کو؟ ولید لے لہجے میں لا پرواہی کا عنصر نمایاں تھا۔
آپکی خالہ اور لیلیٰ کو؟

آر یو سیریس بیا۔ ولید نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر حیرت سے اسکی طرف دیکھا۔ مطلب تم واقعی اس بات کو لے کر پریشان ہو کہ خالہ اور لیلیٰ کو تم پسند آؤ گی کہ نہیں۔۔۔۔ مطلب کہ انتہا ہے بے وقوفانہ سوچ کی۔ وہ غصے کے مارے جیسے پھٹ پڑا تھا۔ نہیں پسند کرینگے تو کونسی قیامت آجائے گی اور اگر پسند کر لیں گی تو کونسا اکیس توپوں کی سلامی دے ڈالیں گی تمہیں۔

مگر۔۔۔۔ ایسا ہکلائی۔

چپ کرو اچھا۔ زہر لگتی ہو ایسی بے کار باتیں کرتے ہوئے۔ اس نے ناگواری سے اسکی بات کاٹی۔

غصہ کیوں کر رہے ہیں۔ وہ روہانسی ہوگی تھی۔

غصے والی بات بھی ہے۔

اچھا سوری۔ خفا مت ہوں۔ اس نے مصالحتی انداز میں کہتے ہوئے اسٹیرنگ پہ دھرے اسکے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

ایسا نہیں سوچا کرو میری جان۔ بی کانفیڈنٹ۔ تم جو ہو، جیسی ہو، بیسٹ ہو۔ اس نے اسکا ہاتھ تھپتھپا کر نرم لہجے میں کہا تو ابیہا نے تابعداری سے سر ہلادیا۔

بھوک لگی ہے؟ چند لمحوں بعد ولید نے اس سے پوچھا۔
تھوڑی تھوڑی۔

مطلب پیزا والی۔ وہ مسکرایا۔

جی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ اور یہ چیز ایسا
کیلئے سب سے زیادہ تقویت کا سبب تھا کہ اسکا شریک حیات اس کے ہر ہر
روپے سے اچھی طرح واقف تھا۔



ایسا نے ولید کے ساتھ گاڑی سے اترتی ہوئی دونوں خواتین کو دیکھا اور پھر
دیکھتی ہی رہ گئی۔ جینز اور مردانہ شرٹس میں ملبوس وہ دونوں مکمل طور پر
مغربی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ ولید نے ملازم کو گاڑی سے سامان نکال کر
اندر پہنچانے کی ہدایت کی اور ان دونوں کو ساتھ لیئے برآمدے میں آیا۔ ایسا
خیر مقدمی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے کھڑی تھی۔

ہیلو! یہ ایسا میری بیوی۔ اور ایسا یہ خالہ ہیں اور یہ انکی اکلوتی بیٹی لیلیٰ۔ ولید نے
مسکراتے ہوئے انگریزی میں انکا آپس میں تعارف کروایا تھا۔ ایسا حیرت زدہ
تھی کیونکہ وہ دونوں دیکھنے میں ماں بیٹی کم اور بہنیں زیادہ لگتی تھیں۔

اسلام علیکم! آئیے۔ وہ مہمان نوازی کو آچے بڑھی۔ لیلیٰ نے سر سے پاؤں تک
اس کا جائزہ لیا جو کاٹن کی سادہ سی گلابی قمیض اور سفید ٹراؤزر میں ملبوس سفید

دوپٹہ سینے پر پھیلائے کافی کمزور اور زرد سی دکھائی دے رہی تھی۔ لیلیٰ کو مایوسی ہوئی تھی۔ وہ ولید کی بیوی کو جیسا سوچتی تھی ایسا تو اس پیکر کے پاسنگ بھی نہیں تھی۔ ولید کے برابر کھڑی وہ عام سی لڑکی اسکی شاندار پرسنیلٹی کے سامنے بالکل ہی دب گئی تھی۔

چلیے خالہ اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ آئیں لیلیٰ۔ ولید نے کہا تو وہ چونکی۔ ایسا تب تک اندر جانے کیلئے پلٹ چکی تھی۔ اسکی پشت پر گھنے سیاہ بالوں کی چوٹی گھٹنوں سے کچھ اوپر تک تھی۔ لیلیٰ اگر مشرقی خیالات کی حامل لڑکی ہوتی تو ایسا کے لمبے بالوں سے ضرور متاثر ہوتی۔۔۔۔۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں ایسا کو ولید کی لائف پائٹز کے طور پر مسترد کر دیا تھا۔



اف ولید آپکی خالہ کتنی خوبصورت ہیں۔ اور اتنی ینگ لگتی ہیں کہ لگتا ہی نہیں کہ اتنی جوان بیٹی کی ماں ہیں۔ اور لیلیٰ باجی۔۔۔۔۔ وہ تو بالکل سنو وائٹ لگتی ہیں۔ ایسا کافی دیر سے جمیلہ خالہ اور لیلیٰ کی تعریفوں میں رطب اللسان تھیں۔ ولید نے بلاخر اکتا کر اسکی طرف دیکھا۔

کیا تم مجھے کتاب پڑھنے دوگی؟ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

ہر روز تو آپ پڑھتے ہیں کتاب۔ آج اگر مجھ سے باتیں کر لیں گے تو کیا ہو جائے گا۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔

مجھے تم سے باتیں کرنے میں کوئی عار نہیں۔ لیکن اس وقت تم صرف خالہ اور لیلیٰ کے حسن کے قصیدے پڑھنے میں دلچسپی رکھتی ہو اور میرے کان یہ تذکرہ سن سن کر پک چکے ہیں۔ ولید نے بے مروتی سے تجزیہ کرتے ہوئے نظریں پھر سے اپنے ہاتھ میں پکڑی فخم کتاب پر مرکوز کر دی۔

کیا کسی کی خوبصورتی کی تعریف کرنا بری بات ہے؟ اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

نہیں بری بات تو قطعی نہیں ہے لیکن یہ تو سراسر زیادتی کہ بات ہے کہ میری بیوی میری خوبصورتی کی تعریف تو کبھی نہ کرے اور دوسروں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دے۔ اس نے بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔

شوہر صاحب خود ہی جو اپنی تعریفوں کرتے رہتے ہیں، مجھے موقع ہی نہیں ملتا۔ اس نے طنزاً کہا۔

میں نے کب اپنی تعریفیں کی ہیں۔ لڑکی توبہ کرو۔ ولید نے کتاب سے نظریں ہٹا کر اسکی طرف دیکھا۔

آپ کریں توبہ۔ میں سونے لگی ہوں۔ ان نے تکیہ ٹھیک کر کے لیٹتے ہوئے کہا۔ ولید نے کتاب میز پر رکھی اور اٹھ کر اس کے سرہانے آن رکا۔ ابیہا نے آنکھوں پر بازو رکھا ہوا تھا۔

اے لڑکی! اس نے اس کی آنکھوں سے بازو ہٹایا۔

جی کیا ہوا؟ اس نے آنکھیں کھولیں۔

ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ولید نے اپنے چہرے پہ از حد سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

جی کہیں۔ وہ بھی سمجھی غالباً کوئی ضروری بات ہے۔

آئی لو یو۔ ولید نے ذرا سا جھکتے ہوئے سرگوشی کی اور ہنر واپس اپنی لکھنے والی میز کی طرف چلا گیا۔ ایسا بے اختیار مسکرائی۔

مجھے پتہ ہے۔ پرسکون انداز میں اسے جواب دے کر اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں موند لی۔ ولید نے مسکراتے ہوئے پھر سے کتاب اٹھالی۔



اگلے روز روحینہ بمعہ شکلیہ بیگم اور شہزاد لاہور چلی آئی تھیں۔ ان سب کے آتے ہی گھر میں خوب رونق لگ گئی تھی۔ شہزاد اور روحینہ نے لیلیٰ کو لاہور گھمانے کا منصوبہ بنایا۔ ولید نے تو انکے ساتھ جانے سے معذرت کر لی تھی۔ شکلیہ بیگم اور جمیلہ خالہ کو بھی لاہور گھومنے کا کچھ خاص شوق نہ تھا۔ باقی رہ گئی ایسا تو اس کو روحینہ کے علاوہ اور کسی نے سرسری سی بھی دعوت نہ دی تھی ساتھ چلنے کو۔ لیلیٰ اور شہزاد کا رویہ اس کے ساتھ بس لیئے دیئے کا سا ہی ہوتا تھا۔ وہ خود بھی گھر پر رہنا ہی پسند کرتی تھی اور کچھ طبعیت بھی ٹھیک نہ تھی سو وہ گھر پر ہی رکی تھی۔ ولید آج کل بہت مصروف تھا۔ گرمیوں کے

لبے کبے بے کیف دنوں کا زمانہ تھا۔ سارا سارا دن شزاء، لیلیٰ اور روحینہ خوب ہلہ گلہ کیئے رکھتیں مگر وہ تو کچھ دیر انکے ساتھ بیٹھ بھی جاتی تو جلد ہی گھبرا کر اٹھ جاتی۔ اسکی طبعیت ہی کچھ ایسی جارہی تھی کہ اسے کچھ بھی اچھا نہ لگتا۔ روحینہ اسکا خیال رکھنے کی خوشش کرتی مگر لیلیٰ اور جمیلہ خالہ کی وجہ سے اس کو بھی زیادہ وقت نہ مل پاتا تھا۔ انہی دنوں ولید کو ایک ہفتے کیلئے راولپنڈی جانا پڑا تھا۔ ابیہا کا دل شدت سے امی ابو سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ مگر مہمانوں کی وجہ سے اس نے اپنی خواہش کا اظہار نہ کیا۔ ولید اسے اپنا بہت سا خیال رکھنے کی ہدایت دے کر چلا گیا تو اسکے دل لر بے نام سئی اداسی مسلط ہو گئی۔ ایک روز شام کے وقت مغربی افق سے بادلوں کے پرے کے پرے اڑ کر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا آسمان سرمئی بادلوں سے ڈھک گیا۔ تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ موسم خوشگوار ہونے لگا تو سبھی لان میں رکھی کرسیوں پہ آ بیٹھے۔ شکیلہ بیگم نے خانساں کو پکوڑے اور چائے بنانے کی ہدایت دے دے اور اپنی بہن سے خوش گپیوں میں مصروف ہو گئیں۔ ابیہا برآمدے کی سیڑھیوں پہ آ بیٹھی۔ اس کے کھلے ہوئے لبے بال فرش پر بکھر رہے تھے۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے گم صم سی بیٹھی تھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے وجود سے ٹکرا رہے تھے۔ ارے ابیہا تم ادھر کیوں بھی ہو؟ روحینہ اسکے پاس چلی آئی۔ اسکے پیچھے پیچھے شیزاء اور لیلیٰ بھی تھیں۔

بس۔ یونہی۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

ولی بھائی کو مس کر رہی ہو ناں؟ روحینہ اسکے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔
جی بہت زیادہ، اتنے دن ہو گئے ان کو گئے ہوئے وہ روحینہ سے دل کی ہر بات
کر لیتی تھی۔

ہاں کہ رہے تھے ایک ہفتے تک واپس آ جائیں گے۔ شاید آج یا کل تک واپس
آ جائیں تم فکر مند نہ ہو روحینہ نے نرم لہجے میں کہا۔
تم کبھی ہمارے ساتھ بھی بیٹھ جایا کرو۔ آخر کو ہم تمہارے گھر مہمان ہیں شہزا
نے اپنے ازلی نخرے سے کہا۔

آئم سوری شہزا بھابھی! مگر میری طبیعت بہت عجیب سی ہو گئی ہے۔ گھبراہٹ
ہوتی رہتی ہے۔ کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔ اسنے معذرت خواہانہ لہجے میں کیا۔
تمہارے منہ پر اتنے پمپلز ہیں۔ تم کوئی سکن ٹریٹمنٹ کیوں نہیں کروائی۔

complexion

بھی اتنا پھیکا سا ہے تمہارا۔ لیلی نے اس آدھی اردو اور آدھی انگریزی میں اسے
مخاطب کیا تھا۔ ابیہا کے چہرے پر پریگنسنسی کی وجہ سے جو دانے ابھر آئے تھے
اور کمزوری کی وجہ سے جو رنگت پیلی پڑ گئی تھیلیلی نے اسے مستقلاً سمجھ لیا تھا۔
کمزوری کی وجہ سے ہے لیلی باجی۔ ڈلیوری کے بعد ٹھیک کو جائے گا۔ اس نے
جواب دیا۔

کم آن! یہ باجی کیا ہوتا ہے۔ لیلی کہا کرو مجھے یہ باجی واجی بالکل پسند نہیں۔ لیلی نے ناک چڑھا کر کہا۔

تبھی آسمان سے موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں تو وہ تینوں لان میں بھاگ گئیں جبکی ایہا وہیں بیٹھی رہی۔ اس کے دل نے شدت سے ولید کو پکارا۔ بارش بہت تیز تھی۔ اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔ تینوں لڑکیاں خوب شور مچا رہی تھیں۔ بادل گرج رہے تھے۔ تیز ہوا پیڑوں سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ تبھی ولید کی جیب پورچ میں آکر رکی۔ وہ فل یونیفارم میں جیب سے اتر۔ دور لڑکیوں کو مسکرا کر ہاتھ ہلاتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھا۔

ایہا اب تک چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے بال ہلکی ہلکی بوچھاڑ سے بھیگ رہے تھے۔ وہ اس کے پاس آن رکا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ایہا نے چونک کر سر اٹھایا پھر ولید کو غیر متوقع طور پر دیکھ کر اس کے چہرے پر چمک دوڑ گئی۔

وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ لمبے بال اڑاڑ کر سلیڈ کے سینے سے ٹکرانے لگے۔ آپ، مجھے یقین نہیں آ رہا۔ وہ خواب کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

چھو کر یقین کر لو۔ ولید نے مسکرا کر کہا۔ ایہا نے ڈرتے ڈرتے اسکا چہرہ چھوا اور پھر کھل کر ہنس دی۔

بارش میں مانگی گئی گئی دعائیں قبول ہوتی ہیں ولید۔ میں نے ابھی ابھی دعا مانگی

کہ آپ آجائیں اور

اور میں آگیا۔ ولید نے اسکی بات کاٹ کر کہا

ہاں۔ سنے سر ہلایا۔

تمہارا دل مجھے پکارے اور میں نہ سنوں یہ ممکن ہی نہیں ہے بیا۔ ولید نے اس کے بال سمیٹتے ہوئے اسے دائیں بازو کے حلقے میں لیا تھا۔ وہ دونوں اب بارش دیکھ رہے تھے۔ ایہا کے چہرے پر بہت سکون تھا۔ ولید مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ سرشار سی سن رہی تھی۔ بارش زور و شور سے جاری تھی۔



ولید آپکو آنٹی بلا رہی ہیں۔ وہ رات کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا تھا جب ایہا نے آکر اسے اطلاع دی

وہ کتاب رکھ کر اٹھا اور اپنے کمرے سے نکل کر شکیلہ بیگم کے کمرے میں آیا۔ وہ اسی کی منتظر تھیں۔ وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا

۔ جی مئی آپ نے بلایا

جی آپ کو خود تو توفیق نہیں ہوتی ماں کے پاس آ کر بیٹھنے کی۔ انکا لہجہ طنزیہ تھا۔

آم سوری مئی! آپکے سامنے ہی ہے سب کچھ۔ میرے پاس وقت ہی نہیں

-ہوتا۔ اس نے سر جھکا کر ادب سے کہا

پہلے بھی آپ کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا ولی مگر آپ فیملی کے لیے وقت نکالتے تھے۔ اب شاید آپ نے اپنی بیوی کو ہی فیملی سمجھ لیا ہے۔ ان کا لہجہ تلخ تھا۔

اسکا نام ابیہا ہے ممی اور آپ جانتی ہیں میں اسے بہت عزیز رکھتا ہوں اور اسکی کنڈیشن

وہ کوئی انوکھی نہیں ہے جو اس کنڈیشن سے گزر رہی ہے۔ ہر عورت اس مرحلے سے گزرتی ہے کسی کا بھی شوہر یوں اس کے ناز نہیں اٹھاتا جیسے آپ اٹھا رہے ہیں۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ بے حس مرد ہوتے ہیں ممی جو بیوی سے محبت نہیں کرتے بس ضرورت پوری کرتے ہیں۔ ولید کا سر ابھی بھی جھکا ہوا تھا۔ شکلیہ بیگم نے اپنے خو برو بیٹے کی طرف دیکھا۔

وہ لڑکی جو آپکے لائق بھی نہیں اس کے لیئے آپ اتنے دیوانے ہو رہے ہیں۔

ممی پلیز! ولید نے ایک جھٹکے سے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ آپ یہ کس بنیاد پر کہہ رہی ہیں کہ وہ میرے لائق نہیں۔

ہر لحاظ سے وہ آپ سے کم تر ہے بیٹا۔ خاندانی پس منظر، شکل و صورت ہر لحاظ سے۔ انہوں نے صاف گوئی کی حد کر دی تھی۔

ممی پہلے تو آپ کو ایہا پر اعتراضات نہیں ہوئے تھے۔ اس نے بے یقینی سے ماں کی طرف دیکھا۔

کیونکہ پہلے میں نے کبھی اس کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارا تھا۔ اب یہاں رہ رہی ہوں تو احساس ہو رہا ہے کہ میں نے بہت بڑی غلطی کر دی ہے اسے اپنی بہو بنا کر۔ اس میں تو زندگی گزارنے کا سلیقہ ہی نہیں بالکل گنوار ہے۔ وہ اسکے خلاف زہر اگل رہی تھیں۔ ولید کی آنکھوں میں حیرانگی تھی۔

اسکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ممی اور بیماری میں تو کوی بھی

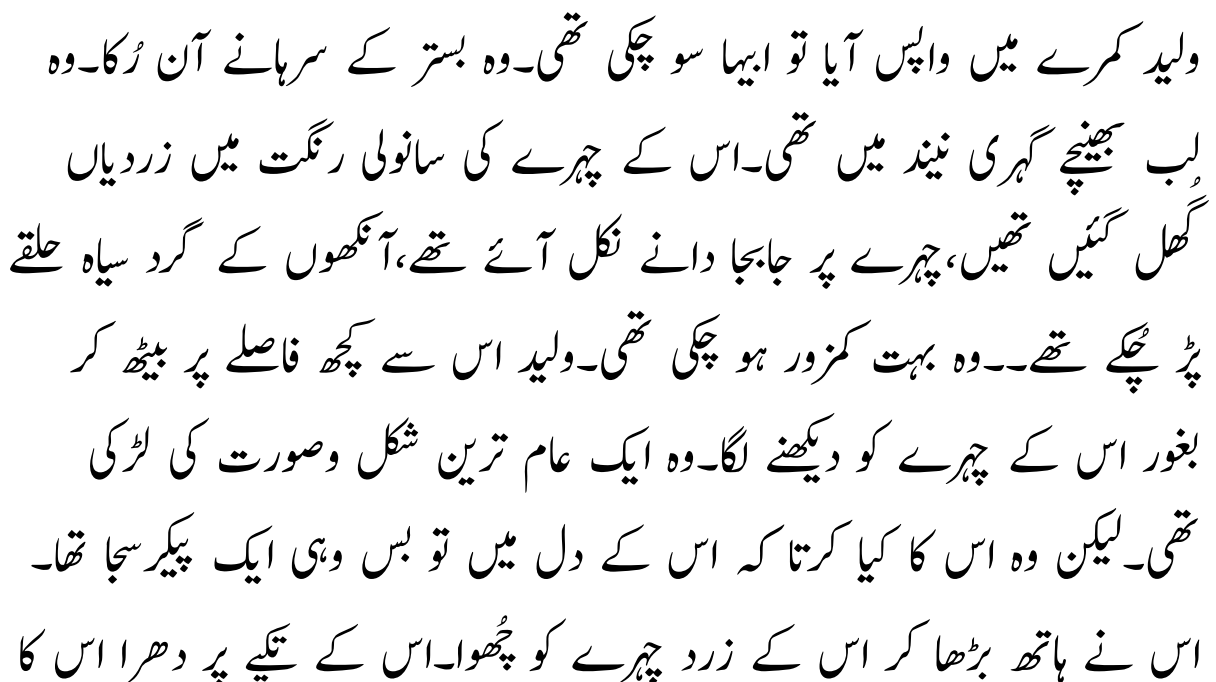
unreasonable

ہو جاتا ہے۔ آپ تو ایک عورت ہیں اچھی طرح جانتی ہیں ایہا کی کنڈیشن کو۔

ہاں ہاں سب جانتی ہوں میں۔ میں نے بھی تین بچے پیدا کیے ہیں۔ ایسے نخرے تو نہیں کیے جیسے تمہاری بیوی کرتی ہے انہو نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

اب آپ زیادتی کر رہی ہیں ممی۔ ایہا نے کبھی مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ میں اگر اسکا خیال رکھتا ہوں تو اس لیے کیونکہ وہ میری بیوی ہے۔ میرا فرض ہے کہ اسکی ہر ضرورت کا مکمل خیال رکھوں

میرے خیال میں مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیئے۔ اس نے اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ اس کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔ ہاں ہاں جاییے ماں کی عزت ہی کیا ہے؟ مطلب کیا ہے آپ کا اس بات سے؟ انہوں نے ماتھے پر بل ڈالے۔ مطلب صاف ہے۔ می ٹیپکل سی عورتوں کی طرح رویہ مت اپنائیں۔ کیونکہ میں آپ کے اس۔ رویے سے آشنا ہوں نہ عادی۔ گڈ نائٹ۔ وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں ایک ایک لفظ ادا کر کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے چلا گیا۔ شکلیہ بیگم کے چہرے پر سوچوں کا جال پھیل گیا۔



ہاتھ اپنے میں لے کر سینے پر رکھ لیا۔ کوئی میرے دل سے پوچھے بیہا کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔ اس نے مدھم سی سرگوشی کی تھی۔ ابیہا نے کچھ ڈسٹرب ہوتے ہوئے دوسری جانب کروٹ بدل لی۔ ولید نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بستر کے کراون سے ٹیک لگا لی۔ اس رات وہ دیر تک جاگتا رہا تھا۔



آپ لوگوں کی شاپنگ کہاں تک پہنچی می؟ اتوار کا دن تھا اور شان کی چائے پر ولید بھی موجود تھا۔ کافی خوشگوار ماحول میں چائے کا دور چل رہا تھا۔

کپڑوں کی شاپنگ تو قریب قریب مکمل ہے۔ اب بقیہ شاپنگ ہم اسلام آباد سے ہی کریں گے۔ جواب روحینہ کی طرف سے آیا تھا۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

آپ لوگ اپنے گھر واپس جا رہے ہیں کیا؟ ابیہا نے روحینہ سے پوچھا۔

کیا مطلب ہے آپ کا؟ یہ جتنا چاہ رہی ہیں آپ کہ یہ آپ کا گھر ہے اور ہم یہاں آپ کے سر پر سوار ہیں۔ شکیلہ بیگم اچانک ہی جیسے پھٹ پڑی تھیں۔ سب ہی کچھ تحیر آمیز انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔ شکیلہ بیگم ایک مضبوط اعصاب کی مالک بااخلاق عورت تھیں یوں بے وجہ ان کا برہم ہو جانا سب کے لیے ہی اچھنبے کا باعث تھا۔

نہیں نہیں آنٹی۔۔۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ ابیہا نے گھبرا کر وضاحت دینا چاہی۔

بس بس۔۔۔ سب جانتی ہوں میں آپ کے مطلب۔ سب کچھ کہہ کر بھی معصوم اور بھولی بھالی بن جاتی ہیں آپ۔ روحی پہلی ممکنہ فلائٹ بک کروائیں اسلام آباد کی۔ ہم اپنے گھر واپس جائینگے۔ زہر خند لہجے ہیں ما سے کھری کھری سنا کر انہوں نے روحینہ کو ہدایت جاری کر دی۔ وہ بے چاری خود کو ہکا بکا ماں کی صورت تک رہی تھی اس ہدایت پر جی بھی نہ کہہ سکی۔

آنٹی! میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔ پلیز آپ خفا تو نہ ہوں۔ ایسا گھبرا گئی تھی۔ اسکے چہرے پر خفت کے آثار تھے۔ ولید کہ سنجیدہ سی نظریں ماں کے چہرے پر تھیں۔

ایسا! آپ کی میڈیسن کا وقت ہو گیا ہے۔ چلیے میں آپ کو میڈیسن دے دوں۔ اور روحی میں فلائٹ بک کروادیتا ہوں تم رہنے دو۔ سرد لہجے میں روحینہ سے کہہ کر وہ اٹھا اور ایسا کا ہاتھ تھام کر اس کے گریز کے باوجود اسے کمرے میں لے گیا تھا۔ شکیلہ بیگم کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔



آپ آنٹی کو روک لیں ولید۔ انکو یوں نہ جانے دیں۔ ایسا مسلسل یہی راگ الاپ رہی تھی۔

سوجاؤ ایسا۔ ولید کی توجہ اپنے موبائل کی جانب تھی۔

ولید پلیز! میں ان سے معافی مانگ لوں گی، آپ ان سے بات کریں۔ ایسا نے

لجابت آمیز لہجے میں کہا۔

تم کیوں معافی مانگو گی ولید نے حیرت سے پوچھا۔

کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ میری وجہ سے خفا ہوئی ہیں۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ان لوگوں کو واپس تو جانا ہی ہے۔ روجی کی شادی کے دن قریب آرہے ہیں اور سو کام ابھی باقی ہیں۔ اس نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

مگر۔۔

بس۔۔ سو جاؤ۔ میں اسٹڈی روم میں ہوں۔ کچھ کام ہے۔ گڈ نائٹ۔ اس نے بات سمیٹ دی اور اپنا لپ ٹاپ اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ ابیہا کے چہرے پر بے چینی کے آثار تھے۔ وہ دیر تک جاگتی رہی تھی۔



آپ کی فلائٹ بک کروادی ہے مئی۔ صبح نو بجے کی فلائٹ ہے تیاری کر لیں۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر سیدھا شکیلہ بیگم کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ کوئی کتاب دیکھ رہی تھیں اسکی آہٹ پر چونک کر اسکی جانب متوجہ ہوئیں اور اسکی بات سن کر انکی پیشانی پر واضح شکنیں پڑ گئیں تھیں۔

آپ کی اس قدر پھرتیوں کا یہ مطلب نکالوں کہ آپ بیوی کی باتوں میں اس

قدر آچکے ہیں کہ آپکو بھی ماں کی موجودگی کھٹکنے لگی ہے۔ انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔

ممی! میرے لیے آپ کی موجودگی باعثِ مسرت ہے۔ اپنے دل میں بدگمانیاں مت پالیں۔ وہ انکے پاس بیٹھ کر انکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بہت ادب سے بولا تھا۔ اسکی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

تبھی مجھے واپس بھجوانے کے لیے فلائٹ کی بکنگ کروانے میں دو منٹ نہیں لگائے آپ نے۔ انہوں نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

آپ خود بھی تو واپس جانا چاہتی ہیں ممی اور اب روجی کی شادی میں بہت کم وقت رہ گیا ہے کتنا ہی کام باقی ہے۔ فرنیچر کے آرڈرز زیورات اور باقی انتظامات۔ یہ سب بھی تو آپ نے ہی کرنے ہیں ناں۔ وہ رسان سے کہہ رہا تھا۔ اسکا لہجہ اتنا نرم اور محبت بھرا تھا کہ شکیلہ بیگم کا دل موم ہونے لگا۔

آپ کب آئینگے اسلام آباد؟ انہوں نے چند ثانیے بعد پوچھا۔

میں تو ممی شادی سے ایک ہفتہ قبل ہی آسکوں گا ہاں مگر ابیہا کو بھیج دوں گا جب آپ کہیں گی۔

وہ کیا کرینگے آکر سارا دن ادھر بھی منہ لیپٹے اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہیں۔ ایک دن بھی انہوں نے جمیلہ اور لیلیٰ کو مکمل کمپنی نہیں دی۔ روجی کی شادی کی تیاریوں میں بھی انہوں نے کوئی حصہ نہیں لینا جانتی ہوں میں اچھی طرح۔

سی ایہا سے سخت نالاں تھیں۔

اس کی طبیعت خراب ہے ممی اور وہ فطرتاً شرمیلی بھی ہے آپ تو جانتی ہی ہیں۔ وہ ایہا کا دفاع کرنے سے خود کو کبھی روک نہ پاتا تھا۔

آپ انکی اتنی طرفداری نہ کیا کریں ولید۔ ٹھیک ہے وہ آپکی بیوی ہیں مگر ایک عام انسان ہیں ان میں بھی خامیاں ہو سکتی ہیں یہ تسلیم کر لیں آپ۔ وہ چمک کر بولیں۔

میں سب تسلیم کرتا ہوں ممی۔ آپ خود کو ہلکان مت کیا کریں۔ چھوٹی سی زندگی ہے مل جل کر محبت سے بتالی جائے تو کیا حرج ہے۔ اسنے ساری گفتگو میں پہلی بار نظریں اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا تھا۔ اسکی سیاہ آنکھیں جیسے التجا کر رہی تھیں۔

اچھا جاکر سو جائیے۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ وہ چاہ کر بھی اپنے جگر گوشے کی آنکھوں کی التجا کو ٹھکرا نہ سکی تھیں اور اس التجا کو مان لینا انکے بس سے باہر ہو چکا تھا سو انہوں نے بات ہی بدل ڈالی۔

اچھا۔ گڈ نائٹ۔ اسنے ایک طویل سانس بھری اور اٹھ کر ماں کی پیشانی چوم کر کمرے سے چلا گیا تھا۔ شکیلہ بیگم سر جھٹک کر سونے کے لیے لیٹ گئیں۔



اگلے روز وہ سب اسلام آباد چلے گئے تھے۔ جاتے سمے روحینہ نے ایہا کو جلد

از جلد اسلام آباد آنے کی ہدایت کی تھی مگر شکلیہ بیگم ٹھس بیٹھی رہیں۔ ایکبار بھی اسے شادی کی تیاریوں میں حصہ لینے کی آفر نہ کی تھی۔ وہ تو اس سے ملی بھی نہ تھیں۔ جمیلہ خالہ اور لیلیٰ تو اسکے ساتھ ہمیشہ ہی لیے دیئے انداز میں رہتی تھیں۔ جاتے سے بھی رسمی سے الوداعی کلمات دہرائے اور بس۔۔۔

انکے جانے کے بعد گھر میں مکمل سناٹے نے پنچے گاڑ لیے تھے۔ ایسا کوشدت سے تنہائی محسوس ہونے لگی۔ ولید ہر ممکن اسکو کمپنی دینے کی کوشش کرتا مگر وہ چوبیس گھنٹے اسکے سرہانے تو نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ ایسا کا دل انجانے خدشات میں گھرا رہتا۔ اسے یوں لگتا جیسے کسی بہت بڑے طوفان کی آہٹ ہے۔ اسکا وجدان اسے وارننگ دیتا مگر وہ کچھ بھی سمجھ نہ پاتی، بس دل کی بے چینی تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ایک روز تو ولید نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

آخر تم اتنی پریشان سی کیوں رہتی ہو ہر وقت؟ کوئی ایشو ہے تو مجھے بتاؤ۔ پتہ نہیں ولید میرا دل بہت گھبراتا ہے۔ اس نے اپنی ہتھیلیاں باہم جکڑتے ہوئے جواب دیا۔ انداز اضطراری تھا۔

لیکن کیوں بیا؟ ولید نے اپنے ازلی نرم لہجے میں پوچھا۔

معلوم نہیں۔ مگر مجھے لگتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے ولید۔ جیسے۔۔۔۔۔ وہ بولتے بولتے رک گئی یوں جیسے الفاظ نہ مل رہے

ہوں۔ ولید بغور اسکے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

بیا۔ کیا ہوا ہے۔۔ ہوں۔۔۔ وہ اٹھ کر اسکے برابر آبیٹھا۔ ایسا اپنی ہتھیلیاں باہم جکڑے سخت الجھی الجھی نظر آرہی تھی۔ ولید نے نرمی سے اسکے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

ادھر دیکھو۔ اسنے نرم لہجے میں کہا۔ ایسا نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں نامعلوم خوف کی داستان رقم تھی۔

میں تمہارے ساتھ ہوں ناں۔ پھر تمہیں کسی طوفان سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے میری جان۔ میں ہوں ناں ہر طوفان سے مقابلہ کرنے کے لیے۔ تم کیوں ڈرتی ہو۔ اسکے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اسنے نرم مگر مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ اسکے لہجے میں سچائیاں تھیں۔ ایسا نے اسکے شانے سے سر ٹکا دیا۔

مجھے بہت ڈر لگتا ہے ولید۔ پتہ نہیں کیوں۔ وہ جیسے خواب کے عالم میں بول رہی تھی۔ لگتا ہے جیسے کوئی آپکو مجھ سے دور لے جا رہا ہے۔

بیکار وہم کرتی ہو تم۔ ولید حسن کو ایسا سے صرف موت دور کر سکتی ہے یہ ہمیشہ یاد رکھنا۔ اسکا لہجہ پختہ تھا۔ ایسا کو پھر بھی دلی اطمینان محسوس نہ ہوا تھا۔ اسکے ہاتھ ولید کی مضبوط گرفت میں تھے۔ اسکے شانے پر بازو پھیلا کر ولید نے اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا اور ہولے ہولے گنگنانے لگا۔

سورج نکلے دیکھ کے تجھ کو ساتھ تیرے ڈھل جائے

مرتے مرتے میرے لبوں پر تیرا نام ہی آئے

جس دن تیری یاد نہ آئے

اس دن مجھ کو موت آجائے

ولید۔۔۔ وہ بے اختیار اسے ٹوک بیٹھی حالانکہ اسکی مدھر آواز میں گایا ایک

اک لفظ اسکی سماعتوں میں جیسے امرت اتار رہا تھا۔۔

جی۔۔

کچھ نہیں۔۔۔۔۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی بس آنکھیں موند کر اپنے رفیق کی چاہتوں

سے پُر رفاقت کو محسوس کرنے لگی۔ ولید پھر سے وہی جملے گنگنانے لگا تھا۔

اب کی بار ابیہا نے اسے نہ ٹوکا۔۔ اسے یہ وعدہ بار بار سننا تھا۔۔ حفظ کرنا

تھا۔



دن بھر کا جلتا بلتا سورج آغوشِ مغرب میں جا چھپا۔ طائر بھی اپنے اپنے گھروں

کو لوٹنے لگے۔ افق پر پھیلی سرخی دھیرے دھیرے سیاہی میں ڈھل رہی تھی۔

فضا میں اک عجیب سی مہک تھی۔۔ جیسے کہیں دور بارش ہو رہی تھی یا شاید

بادل اپنی راہ پر تھے۔۔ ابیہا برآمدے کے پلر کے قریب آن رکی۔ اسنے نماز

کے انداز میں سیاہ چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اسکے ہاتھ میں ایک سفید تسبیح تھی جس کے دانے گراتے ہوئے وہ زیر لب کوئی ورد کر رہی تھی۔

وہ کچھ لمحے پلر کے پاس کھڑی رہی پھر زینے طے کر کے لان پہ اتر آئی اور دھیرے دھیرے ٹہلنے لگی۔ ماحول میں ابھی کچھ حدت باقی تھی مگر ہلکی ہلکی ہوا میں اتنی تپش نہ تھی۔ وہ تسبیح پڑھتی ٹہلتی رہی۔ کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ یکدم تیز ہوا چلنے لگی ساتھ ہی فضا میں بارش کی میٹھی سی باس بکھر گئی۔ ایسا نے افق پر نظریں دوڑائیں۔ مشرق کی جانب سے گہرے سرمئی بادل اڑا کر آسمان پر اکٹھے ہو رہے تھے۔ اسکے دل کو مسرت سی محسوس ہوئی۔ پچھلے دو ہفتوں سے شدید گرمی کی لہر نے سارے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا سو اب بادلوں کی جھلک نے ایک اچانک سی خوشی دی تھی۔ وہ ویسے بھی اسلام آباد اور راولپنڈی کے خوشگوار موسم کی عادی تھی لاہور جیسے شہر جہاں کی گرمی ویسے ہی اظہر من الشمس ہے میں آکر اس قدر سخت گرمی سے بہت اکتا جاتی تھی۔ اس نے تسبیح ختم کر کے دعا مانگی اور تسبیح کلائی پہ لپیٹ کر دوپٹے کی بندش ڈھیلی کر دی مگر سر سے نہ اتارا اور ایک لان چیئر پر بیٹھ گئی۔ ہوا میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا آسمان سرخ بادلوں سے ڈھک گیا۔ ایسا کا موڈ بہت اچھا ہوتا جا رہا تھا۔ اسنے ملازمہ کو آواز دے کر اپنا موبائل کمرے سے منگوایا اور اسے اپنے لیے جوس بنانے کی ہدایت دے کر بھیج دیا۔ موبائل پر ولید کا نمبر ڈائل کر کے موبائل کان سے لگایا۔ بیل تو

جارہی تھی مگر وہ کال اٹینڈ نہ کر رہا تھا۔

جلدی آجائیں۔۔۔ اسنے پیغام لکھ کر ہوا کے ہاتھ تھمایا۔

کیوں اسکا جوابی پیغام فوراً ہی آیا تھا۔

کیونکہ میں کہہ رہی ہوں۔ اسنے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر جوابی پیغام ٹائپ کیا۔

میرے میجر صاحب میری کارکردگی سے بہت خوش ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ڈیوٹی ٹائمنگز میں اپنی بیوی سے کہیں لگتا رہوں۔ اسکا اگلا میسج پڑھ کر وہ بے اختیار ہنس دی۔

ان سے کہہ دیں آپکی بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں اسیلئے گھر جانا ہے۔ اسنے جلدی سے حل پیش کیا۔

شٹ اپ۔ آتا ہوں۔ اسکا میسج پھرتی کے سب ریکارڈ توڑتا ہوا آیا تھا۔ ابیہا نے مطمئن انداز میں موبائل کی اسکرین آف کی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اسکے ذہن میں اپنے ہونے والے بچے کا تصور گھوم رہا تھا اور وہ جیسے ہواؤں میں رقصاں تھی۔ ابھی چند سیکنڈز ہی گزرے تھے کہ ملازمہ کی آواز پر وہ چونکی۔ وہ فریش جوس کا گلاس لیے مودبانہ سی کھڑی تھی۔ ابیہا نے شکریے سے گلاس تھام لیا، ملازمہ پلٹ گئی۔ وہ بسم اللہ پڑھ کر جوس کے گھونٹ بھرنے لگی۔ تبھی ولید کی گاڑی کے ہارن کی تیز آواز آئی۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا اور اسکی گاڑی روش پر دوڑتی ہوئی پورچ میں جارکی۔ وہ فل یونیفارم میں گاڑی سے اترا اور اسے لان میں بیٹھے دیکھ کر اسی طرف چلا آیا۔

السلام علیکم! اسنے حسب عادت سلام کیا۔

وعلیکم السلام! اکیلے اکیلے جوس پیا جا رہا ہے لڑکی۔ وہ اسکے سر پہ ہلکی سی چپت لگاتا ہوا سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابیہا نے گلاس اسکی طرف بڑھایا۔ آدھا میں نے پیا آدھا آپ پی لیں۔

تھینک یو۔ ولید نے گلاس اسکے ہاتھ سے تھام لیا اور ایک گھونٹ بھرا۔ ویسے آپکو چھٹی کیسے مل گئی۔ میرا بتایا ہو بہانہ بنایا تھا ناں۔ ابیہا نے شوخی سے پوچھا۔

نہیں میں نے میجر صاحب کو کہا کہ سر میری گرل فرینڈ کیساتھ ڈیٹ ہے نازک صورتحال ہے تو ذرا کرم کریں۔ انکو بھی حالات کی نزاکت کا اندازہ تھا سو آرام سے چھٹی دے دی۔ وہ بہت ہی پکا سا منہ بنا کر مذاق کرتا تھا اور ابیہا اب اسکی اس عادت کو بالکل اچھی طرح سمجھ چکی تھی سو ہنسنے لگی۔ تو پھر جائیں ناں گرل فرینڈ کے پاس۔

ارے کپڑے بدل کر جاؤنگا ناں۔ یونیفارم میں کون ڈیٹ مارتا ہے۔

جائیں پھر جا کر تیار ہوں۔

انسان بنو۔ ولید نے اسے گھورا۔

خود ہی تو کہہ رہے ہیں کہ ڈیٹ پر جانا ہے۔

وہ تو مذاق کر رہا تھا۔ بائے داوے جب تمہارا میسج آیا تھا تب میں رستے میں تھا۔ اسنے جوس ختم کر کے گلاس تپائی پر رکھا۔ اسی سمے آسمان سے ہلکی ہلکی بوندیں برسنے لگیں۔

اوہ واہ۔۔۔ بارش۔ وہ سرخوشی کے عالم میں آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ چل کر برآمدے میں بیٹھو۔ میں چیخ کر کے آتا ہوں۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا وہ بھی اٹھی۔

بارش میں بھگنے کا اتنا دل چاہ رہا ہے۔ اسنے منہ بنایا۔

بیمار پڑ جاؤ گی چندا۔ ادھر بیٹھ کر بھی تو بارش انجوائے ہو سکتی ہے ناں۔ وہ اسکا ہاتھ تھامے اسے برآمدے تک لیجاتے ہوئے نرم لہجے میں سمجھا رہا تھا۔ ابیہا نے سر ہلا دیا۔ دل اسکا شدت سے ہمک رہا تھا برش میں بھگنے کے لیے۔

چلو تم بیٹھو میں فریش ہو کے آتا ہوں پھر اچھی سی چائے پیتے ہیں۔ وہ اسے برآمدے کی ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ وہ بیٹھ گئی۔ ولید اندر چلا گیا تھا۔ بارش اب بہت تیز ہو گئی تھی۔ ابیہا کے لب مسکرا رہے تھے۔

وہ آج بہت دنوں کے بعد بہت خوش تھی۔ کچھ دیر بعد ولید بھی چلا آیا تھا۔ اسکے پیچھے پیچھے ملازمہ لوازمات سے بھری چائے کی ٹرالی گھسیٹ کر لا رہی تھی۔ ولید سفید شلوار قمیض میں عام سے حلیے میں بھی اتنا خاص لگ رہا تھا کہ ابیہا کو اپنی قسمت پر رشک ہونے لگا۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ملازمہ نے انہیں چائے سرو کی اور چلی گئی۔ بارش اب بہت تیز ہو چکی تھی۔

جی میڈم تو پھر کیسا گزرا آپکا آج کا دن ولید نے پوچھا۔

اچھا گزرا۔ ولید ایک بات بتائیں۔

پوچھو۔ ولید کی توجہ کیک کی جانب تھی۔

آپ نے اس کا نام کیا سوچا ہے

کس کا

ہمارے بے بی کا۔

اوہ اچھا۔ ہاں سوچا ہے ناں بتاؤں۔ اسنے سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔ ابیہا نے سر اثبات میں ہلایا۔

فاطمہ۔

اور اگر بیٹا ہوا تو۔

تو تم رکھ لینا جو تمہیں پسند ہو۔

یعنی آپکو بس بیٹی ہی چاہیے۔

ہاں۔ پہلے بیٹی پھر بیٹا۔

مگر مجھے تو پہلا ہی بیٹا چاہیے۔ اور میں نے نام بھی صرف بیٹے کا سوچا ہے۔
زین۔

اچھا نام ہے۔ لیکن تمہیں صرف بیٹا ہی کیوں چاہیے بیٹی بھی تو ہو سکتی ہے
ناں۔ اسنے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

بس مجھے شوق ہے کہ میرا پہلا بیٹا ہو۔

اچھا بھی جو اللہ کی مرضی۔ ہم تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔ وہ دھیرے سے
مسکرایا وہ ابیہا سے بحث نہیں کرتا تھا۔ یہ کیک لونان خالی چائے پی رہی ہو۔
اسنے کیک اسکے سامنے کیا ابیہا نے ناک بھوں چڑھا کر آدھا پیس اپنی پلیٹ
میں نکالا۔ بارش کا زور اب ٹوٹنے لگا تھا۔ وہ اس موسم اور چائے سے لطف
اندوز ہوتے چند بہترین لمحات گزار رہے تھے۔



روحینہ کی شادی میں محض پندرہ دن رہ گئے تھے، ولید کو چھٹیاں ملنا مشکل
تھیں سو اس نے ابیہا کو اسلام آباد بھیج دیا۔ ابیہا اسکے بغیر آنا تو نہ چاہتی تھی مگر
معاملہ اکلوتی نند کی شادی کا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اگر وہ نہ گئی تو شزاء
بالخصوص بہت باتیں بنائے گی۔ ولید نے اسے بذریعہ ہوائی جہاز بھجوا دیا تھا اور

اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر ڈرائیور نے اسے ریسیو کیا تھا۔ وہ گھر پہنچی تو روحینہ نے اس کا پر تپاک استقبال کیا تھا۔ گھر میں شادی کی تیاریوں کا بھرپور سماں تھا۔ سرِ شام ہی ولید وغیرہ کی کزنز اکٹھا ہو کر ڈھولک لے کر بیٹھ جاتیں۔ اور رات گئے تک گھر کے درودیوار ڈھولک کی تھاپوں اور سریلے قہقہوں سے گونجتے رہتے۔ شادی کی قریب قریب سب تیاریاں اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھیں۔ زیادہ تر رشتہ داروں نے تو شادی تک مستقلاً یہیں ڈیرے ڈال لیے تھے۔ ایک بات ابہا نے یہاں آتے ہی شدت سے محسوس کی تھی کہ شکلیہ بیگم کا رویہ اس کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہ تھا وہ اسے جیسے خاطر میں ہی نہ لارہی تھیں۔ اس نے یہ بات بھی محسوس کی تھی کہ شادی کی سب تیاریوں میں شزاء کے علاوہ لیلی آگے آگے تھی۔ شکلیہ بیگم نے اسے تو بھول کر بھی شادی کی تیاریوں میں حصہ لینے کی دعوت نہ دی تھی۔ وہ بالکل مہمانوں کی طرح سارا سارا دن اپنے کمرے میں بور ہوتی رہتی۔ ایک دن اس نے اپنے امی ابو کی طرف جانے کا سوچا اور شکلیہ بیگم سے اجازت لینے ان کی تلاش میں انکے کمرے میں آئی۔ وہ فراغت سے بیٹھی تھیں۔ وہ اجازت لے کر اندر آئی۔ انہوں نے سرسری سی نظر اس پہ ڈالی۔

آنٹی میں کچھ دیر کے لیے امی کی طرف چلی جاؤں؟ اس نے جھجھکتے ہوئے پوچھا۔ شکلیہ بیگم نے ایک تیکھی نظر ابہا پر ڈالی اور ماتھے پر بل ڈالے ہوئے گویا ہوئیں۔

میری طرف سے تم ہمیشہ کے لیئے چلی جاؤ۔ ادھر رہ کر تم نے کون سا کاموں میں حصہ لینا ہوتا ہے، سارا دن تو اپنے کمرے میں بند رہتی ہوں مہمانوں کی طرح۔ انکا لہجہ خاصا تلخ سا تھا۔ ایسا نے انکو کبھی کسی کے ساتھ تم کا صیغہ استعمال کرتے نہ دیکھا تھا۔

آنٹی! میں تو کاموں میں حصہ لینا چاہتی ہوں، آپ ہی منع کر دیتی ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے پھسل گیا تھا۔

خوب! یعنی کہ اب تم اپنی ہڈ حرامی کا ملبہ بھی مجھ پہ ڈالو گی۔۔۔ چہ خوب ایسا بی بی۔۔۔ تم تو بہت ہی عقلمند نکلی۔ انہوں نے سراسر طعنہ دیا تھا۔ ایسا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

میں نے ایسا تو نہیں کہا آنٹی۔ اس نے پست آواز میں کہا۔

ہاں بھی تم تو کچھ بھی نہیں کہتی ہمارے ہی کان بجتے ہیں۔ جاؤ بی بی جاؤ! ہمیں مڈل کلاس عورتوں والی چالبازیاں نہیں آتیں۔ تم ہم سے دور ہی رہا کرو۔ انہوں نے اس کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔ ایسا کو شدید ہتک کا احساس ہوا تھا، وہ کچھ بھی کہے بغیر اٹھ کر ان کے کمرے سے باہر نکل آئی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ ملازمہ نے اسے روحینہ کا پیغام دیا، وہ اسے لاؤنج میں بلا رہی تھی۔ ایسا نے اٹھ کر منہ دھویا اور بال سلجھا کر نیچے لاؤنج میں چلی آئی۔ وہاں اس سے

روحینہ اور اس کی سبھی کزنز جمع تھیں۔ جمیلہ خالہ بھی ایک ان شکیلہ بیگم کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ روحینہ کزنز کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی ایہا کو دیکھ کر اس نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ جھجھکتی ہوئی اسکے پاس آ بیٹھی۔

ایہا تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھا کرو ناں یار۔ روحینہ نے اس سے کہا۔ وہ بس ہلکا سا مسکرا کر رہ گئی۔

ایہا شاید ہمارے ساتھ بیٹھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہیں۔ لیلیٰ نے انگریزی میں اپنے مخصوص مسکراتے ہوئے انداز میں کہا تھا

نہیں ایسی بات نہیں ہے میری کچھ طبیعت ٹھیک نہیں اسلیے ہجوم میں گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ لیلیٰ کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

میں مذاق کر رہی تھی یار، تمہیں واقعی آرام کی ضرورت ہے۔

مجھے تو دنیا سے نرالی ہی بہو ملی ہیں جمیلہ، جتنا میرا ولید خوش اخلاق اور سب سے گھل مل جانے والا ہے اتنی ہی آدم بیزاریبوی ملی ہیں انکو۔ اب شزاء بھی تو ہے۔ جب سے روحینہ کی شادی طے ہوئی ہے ہر کام احسن طریقے سے سنبھال رکھا ہے انہوں نے۔ مگر ایہا نے تو کسی کام کو ہاتھ لگا کر نہیں دیا۔ شکیلہ بیگم اس کے سامنے بیٹھی اسکے متعلق گل افشائیاں کر رہی تھیں۔ وہ شرمندہ شرمندہ

سی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

ہاں میں نے بھی یہ بات نوٹ کی ہے، ایسا کے گھر بھی ہم جتنے دن ٹھہرے اس نے ہمیں بالکل کمپنی نہیں دی۔ اور شادی کی تیاریوں میں بھی انہوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط طریقہ ہے اصولاً تو اسکو بھی شہزاد کے ساتھ سب انتظامات سنبھال لینے چاہئیں تھے تاکہ آپ کو تھوڑا وقت مل جاتا اپنی بچی کے ساتھ، مگر ادھر تو اب کام آپکے ہی سر پر پڑے ہوئے ہیں دو دو بہوؤں کے ہوتے ہوئے بھی۔ جمیلہ خالہ نے بھی بہن کی تائید کی۔

بس قسمت ہی خراب ہے میری تو، سوچتی تھی جب دونوں بہوئیں آجائیں گی تو سب ذمے داریوں سے الگ ہو کر اطمینان سے باقی کی عمر بتاؤں گی ساری زندگی گزر گئی ذمے داریاں اٹھاتے اٹھاتے۔ بولتے بولتے شکلیہ بیگم کی آواز رندھ گئی تھی۔ جمیلہ خالہ اور لیلیٰ فوراً انہیں دلاسا دینے لگے۔ ایسا اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

ولید کو تو جیسے مجھ پر اعتبار ہی نہیں ہے، شادی کے بعد فوراً ہی ایسا کو ساتھ لے گئے۔ اب وہ آنسو بہا رہی تھیں۔

بس آپا صبر کریں۔ شادی کے بعد اکثر بیٹے بدل جاتے ہیں۔ اور پھر پسند کی شادی کے بعد تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔ جمیلہ خالہ انکو مزید بڑھاوا دے رہی تھیں۔ ایسا کے لیے وہاں بیٹھنا محال تھا سو چپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں

چلی آئی۔ اسکا دل بہت اداس ہو گیا تھا۔



رات کا جانے کون سا پہر تھا جب ہلکے سے کھٹکے کی آواز سے سوئی ہوئی ایہا کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے کی روشنی جل رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اور پھر باتھ روم سے برآمد ہوتے ولید کو دیکھ کر اسے بہت خوشگوار سی حیرت ہوئی تھی۔ وہ سیاہ ٹراؤزر اور سفید ٹی شرٹ میں ملبوس گیلے چہرے سے ٹپکتے پانی کے قطرے انگلی سے جھٹکتا اسکی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ایہا بھی جواباً مسکرائی۔ ولید کا سوٹ کیس ایک جانب رکھا تھا۔

آپ کب آئے؟ اس نے پوچھا
 NEW ERA MAGAZINE
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 جب آپ گہری نیند سو رہی تھیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارتے ہوئے اس نے بتایا

پہلے سے بتا دیتے تو میں نہ سوتی۔

میں نے سوچا کیوں نہ تمہیں اور باقی سب کو سرپرائز دیا جائے۔ وہ آئینے کے پاس سے ہٹ کر چلتا ہوا بستر کے دوسرے کنارے پر نیم دراز ہو گیا۔ ایہا نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ رات کے اس پہر بھی فریش اور چاق و چوبند نظر آرہا تھا۔

کچھ زیادہ ہی شوق نہیں ہو گیا آپکو سرپرائز دینے کا۔ وہ مسکرائی

آف کورس! اچھا یہ بتاؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟

بالکل ٹھیک، آپ آنٹی سے ملے؟

نہیں یار ابھی تو کسی سے بھی نہیں ملا سب سو رہے ہیں صبح مل لوں گا۔ اسنے کہتے ہوئے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

کچھ کھائیں گے؟ ایہا نے پوچھا۔

نہیں بس سوؤں گا، تم بھی سو جاؤ۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا تھا، ایہا نے سائیڈ لیپ بجھا دیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔



اگلے روز ناشتے کی میز پر ولید کو دیکھ کر سبھی کو خوشگوار سی حیرت نے آلیا تھا۔ خصوصاً روحینہ تو بہت خوش ہوئی تھی۔

سچی ولی بھیا! آپ کے بغیر تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا مجھے۔ اسنے لاڈ بھرے انداز میں کہا تو ولید مسکرا دیا

آپ رات کو آئے تھے تو اسی وقت ہم سے کیوں نہیں ملے؟ شکلیہ بیگم نے ولید کو مخاطب کیا۔

ممی! تب آپ سب سو رہے تھے سو میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس نے رسان سے جواب دیا۔

یوں کہیے کہ آپ کو ماں اور بہن سے ملنے کی کوئی جلدی ہی نہیں تھی، جس سے ملنے کی جلدی تھی ان سے مل لیے بس کافی تھا۔ شکلیہ بیگم کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ایہا کے حلق میں نوالے پھنسنے لگے۔

روحی تم ابھی میرے ساتھ چلو تم کو کچھ شاپنگ کروانی ہے میں نے ایہا تم بھی تیار ہو جاؤ، تمہاری بھی شاپنگ باقی ہے۔ اسنے شکلیہ بیگم کی بات ہنس کر ٹال دی اور روحینہ اور اسے ہدایت دے کر کھانے کی میز سے اٹھ گیا تھا۔



شاپنگ کے بعد وہ تینوں ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے رکے تھے۔ اس روز موسم بہت خوشگوار تھا اور ان تینوں نے بہت انجوائے کیا تھا۔ وہ کھل کر ہنسنے لگے، بہت سی باتیں کی تھیں۔ واپسی پر وہ کچھ دیر کے لیے ایہا کے امی ابو کے گھر چلے گئے۔ وہاں پر کچھ دیر بیٹھ کر انہوں نے گھر واپسی کا قصد کیا۔ ایک بہترین دن گزار کر وہ واپس گھر آئے تو شکلیہ بیگم کا موڈ خاص بگڑا ہوا تھا۔ انہوں نے دروازے پر ہی انہیں خوب لتاڑا۔ اسکے بعد انہوں نے ولید کو ہوٹل کے انتظامات دیکھنے کے لیت بھیج دیا۔ شادی میں اب ایک ہفتہ ہی رہ گیا تھا۔ روحینہ کو رخصت ہو کر کراچی جانا تھا سو جہیز کا سامان زیادہ نہ تھا، شکلیہ بیگم نے زیورات اور کپڑوں کے علاوہ اسے خاصی بھاری رقم دے دی تھی۔

ایہا کافی تھکن محسوس کر رہی تھی سو ملازمہ کو چائے کا کہہ کر اپنے کمرے

میں چلی آئی۔ کچھ ہی منٹ بعد ملازمہ بھاپ اڑتا چائے کا مگ دے گئی تھی۔
رہی ولید کرے میں داخل ہوا۔

بیا! تم ادھر بیٹھی ہو یا نیچے سب پوچھ رہے ہیں اتنے مہمان اکٹھا ہیں یا اچھا
نہیں لگتا۔ چلو شاباش نیچے۔ اس نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

میں وہ ذرا ریسٹ۔۔۔

ریسٹ بھی ہوتا رہے گا جاناں! ابھی چلو نیچے بھی تو جسٹ بیٹھنا ہی ہے ناں
کم آن۔ اس نے اس کی بات کاٹ کر عجلت آمیز انداز میں کہا اور اسکا ہاتھ
تھامے اسے ساتھ لیے نیچے آگیا جہاں لاؤنج میں خوب محفل جمی ہوئی تھی۔
کارپٹ پر لڑکیاں گول دائرہ بنائے بیٹھی ڈھولکی پر گانے گارہی تھیں۔ روحینہ زرد
لباس میں ان سب کے درمیان ہی بیٹھی تھی۔ ولید، سکندر کے برابر صوفے پر
بیٹھ گیا۔ ابیہا کو روحینہ نے اپنے برابر بٹھالیا۔ ولید کی سب کزنز بہت ہی ماڈرن
اور جان محفل قسم کی لڑکیاں تھیں، خصوصاً علیشا جو آج ہی اپنے سسرال سے
خاص طور پر روحینہ کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ اسکا حسن پہلے
سے زیادہ بلا خیز ہو چکا تھا۔ وہ ساری محفل پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ روحینہ کے
علاوہ واحد تھی جس کا رویہ ابیہا کے ساتھ بھی بہت اچھا تھا۔ بارہ بجے کے
قریب وہ دب گانے گا گا کر تھک گئے تو چائے کا نعرہ بلند ہوا۔ ملازمہ چائے بنا
کر لے آئی تو ابیہا بھی اٹھ کر اس کے ساتھ چائے سرو کرنے لگی۔

شرزاء! مجھے چائے دو بیٹے۔ شکیلہ بیگم نے شرزاء کو مخاطب کیا تو ایہا نے جلدی سے کپ میں چائے انڈیلی اور انکے پاس چلی آئی۔

آئی چائے۔ اس نے جھجھکتے ہوئے کہا شکیلہ بیگم نے اسکے ہاتھ سے کپ تھام لیا ایہا کی جان میں جان آئی۔ وہ پلٹی ہی تھی کہ شکیلہ بیگم نے ناگواری سے کپ میز پر پٹھا۔

یہ چائے ہے یا زہر۔ سعیدہ سعیدہ میری چائے میں چینی کیوں نہیں ڈالی؟ انہوں نے ملازمہ کو پکارا

آپکی چائے چھوٹی بی بی نے ڈالی تھی بیگم صاحبہ۔ سعیدہ مودبانہ انداز میں بولی۔ ایہا اپنی جگہ چور بن گئی۔

اپنا کام دوسروں پر مت ڈالا کرو ہر کسی کو اچھے گھرانوں کے طور طریقے نہیں معلوم ہوتے، چائے لاکر دو مجھے ڈھنگ کی۔ انہوں نے درپردہ اسے اچھا خاصا لتاڑا تھا ملازمہ سر جھکائے پلٹ گئی جبکہ وہ حد سے زیادہ کنفیوزڈ سی انگلیاں مروڑتی رہی کمرے میں موجود سبھی نفوس کہ نظریں اس پہ جمی ہوئی تھیں، اسے اپنا آپ آکورد لگنے لگا تو وہ تیزی سے لاؤنج سے باہر نکلی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسے بہت ذلت کا احساس ہو رہا تھا۔



روحینہ کی مایوں کا دن تھا۔ فنکشن گھر میں ہی تھا۔ بڑے سے لان میں سب

انتظامات کیے گئے تھے۔ ایہا نے زرد رنگ کا ڈھیلا ڈھالا سا شلوار قمیض پہنا، آئینے کے سامنے کھڑی وہ اپنے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اسکے چہرے کا رنگ بہت زرد ہو گیا تھا۔ وہ ہولے ہولے اپنے لمبے بال سلجھا رہی تھی۔ تبھی کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر علیشا اندر داخل ہوئی۔

یار ایہا تمہارے پاس بلو ڈرائز ہے تو مجھے دے دو میرا پتہ نہیں سامان میں کدھر گم ہو گیا ہے مل ہی نہیں رہا۔ وہ اپنے ازلی بے تکلف انداز میں بولتی ہوئی اندر آئی تھی

ایہا نے ڈریسنگ ٹیبل کہ دراز سے بلو ڈرائز نکال کر اسی طرف بڑھا دیا تھینکس ویسے تمہارے بال بہت ہی خوبصورت ہیں۔ لاؤ فرنیچر چوٹی بنادوں تم پہ اچھی لگے گی۔ وہ از خود ہی اسکے بالوں کی فرنیچر چوٹی بنانے لگی

تم کافی کمزور ہو گئی ہو ولید خیال نہیں رکھتا کیا؟ وہ شرارت سے بولی

وہ تو بہت اچھے ہیں میں خود ہی کچھ لاپرواہ ہوں۔ اس نے مسکرا کر کہا

تھوڑی توجہ دیا کرو خود پر، ماشاء اللہ اتنی پیاری صورت ہے تمہاری آجکل تو عام سے عام بلکہ بد صورت لڑکیاں بھی خود کو جاذب توجہ بنا لیتی ہیں۔ تم بھی ذرا خیال رکھا کرو اپنا۔ وہ اسکے بالوں کو بل دیتے ہوئے اسے مشورے دے رہی تھی۔ اور وہ چپ چاپ سن رہی تھی۔

یہ تو ہو گئی واؤ! تمہارے بال بہت گھنے ہیں اسلیے بہت اچھی لگ رہی ہے اسنے
فرینچ چوٹی بنا کر کہا تھا۔ ایسا مسکرا دی۔ اسکے بالوں کی موٹی سی چوٹی واقعی بہت
اچھی لگ رہی تھی۔

لاؤ تھوڑا سا میک اپ کر دیتی ہوں تمہارا، کافی پیل سا ہو رہا ہے تمہارا فیس۔ اس
نے اس کا جواب سننے بغیر ہی اسکے چہرے پر اپنے کمالات کا مظاہرہ کرنے لگی،
کچھ ہی دیر بعد ایسا کا چہرہ جاذب توجہ لگنے لگا تھا۔

اب دیکھو خود کو کتنی پیاری لگ رہی ہو۔ اسنے اسکا رخ آئینے کے سامنے موڑا۔
تھینک یو سو مچ علیشا! ایسا کھل کر مسکرا دی تھی۔ علیشا مینشن ناٹ کا نعرہ لگا کر
بلو ڈرائر لے کر کمرے سے چلی گئی۔ ایسا نے خود پر ایک مطمئن سی نگاہ ڈالی
اور اپنا دوپٹہ اچھی طرح اپنے سر اور وجود پر پھیلایا اور کمرے سے باہر آگئی۔
زینوں پر ولید سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ وہ میلی سے حلیے میں غالباً ابھی ابھی لان
سے انتظامات کروا کر لوٹا تھا۔ اسے دیکھ کر متبسم انداز میں مسکرایا۔

بڑی اچھی لگ رہی ہو۔

تھینک یو! وہ مسکرائی

دو منٹ کمرے میں آنا۔ اسنے آنکھوں سے کمرے کی جانب اشارہ کیا تھا،
آنکھوں میں شرارت تھی۔

آپ جاکر جلدی سے تیار ہو جائیں فنکشن شروع ہونے والا ہے۔ اسنے اسے تنبیہ کی اور اسکے سائیڈ سے ہو کر نچلے زینے کی طرف بڑھی۔

بات تو سن لو ناں۔ ولید نے اسکی کلائی تھام کر مدھم لہجے میں کہا

بعد میں سن لوں گی ابھی جاکر تیار ہوں۔ ایہا نے اپنی کلائی چھڑوائی اور زینے جلدی سے طے کر گئی ولید کی مسکراتی نگاہوں نے دور تک اسکا پیچھا کیا تھا۔



رات بہت تاریک تھی، ساری فضاء میں اک غبار سا تھا۔ ستارے بھی مدھم سے تھے، اور آخری تاریخوں کا رزد رو چاند بھی کچھ مدقوق سا لگ رہا تھا۔ اوائل جولائی کی اس گرم ترین شب میں ایدھی سنٹر میں بالکل سناٹا تھا۔ تمام عورتیں کھانا کھا کر سوچکی تھیں۔ لیکن سلمیٰ جاگ رہی تھی۔ اب اسکی ذہنی و جسمانی حالت بہت بہتر تھی مگر وہ مکمل نارمل لوگوں کی فہرست میں وہ شامل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ زیادہ تر گرم صم سی کسی ایک کونے میں بیٹھی رہتی، اکثر خلا میں گھورتی رہتی۔ اگر کوئی کام دے دیا جاتا تو چپ چاپ کر دیتی، کھانا کھانے کے لیئے اگر کوئی بلا لیتا تو چلی جاتی ورنہ سارا سارا دن بھوکی گزار دیتی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق حالت زچگی میں کسی شدید ترین صدمے نے اسکے نروس سسٹم پر بہت برا اثر ڈالا ہے جس کے باعث اسکی گزری زندگی کی یادداشتیں شعور سے لاشعور میں چلی گئی ہیں، اسکی یادداشت ٹھیک ہو جانے کے لیئے یہ

ضروری تھا اس کو اسکی گزری زندگی کے واقعات یاد دلائے جاتے مگر یہ ممکن ہی نہ تھا وہ تو لاوارث تھی۔ سو اسے اسی طرح زندگی گزارنا تھی۔ اور لاوارث لوگوں کے اس محفوظ ٹھکانے میں سبھی کو اس معصوم سی لڑکی کے ساتھ ہمدردی تھی وہ سب ہر ممکن اس کا خیال رکھتے اکثر عورتیں اس سے باتیں کرتی رہتی مگر اس کی جانب سے جواب نہ پا کر آخر چپ ہو جاتیں۔ سلمیٰ کی زندگی سی بھول بھلیوں سے کم نہ تھی۔ اسکا ذہن ایک صاف سلیٹ تھا جس پر کبھی کبھی کچھ دھندلے دھندلے عکس ابھرتے اور جوں ہی وہ ان عکسوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی وہ آنِ واحد میں معدوم ہو جاتے۔ وہ چاہ کر بھی کچھ سمجھ نہ پاتی تھی۔



روحینہ کی مایوں کا فنکشن عروج پہ تھا۔ بڑے سے لان میں اس تقریب کا زبردست اہتمام کیا گیا تھا۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا۔ روحینہ، اس گھر کی اکلوتی بیٹی تھی سو شکیلہ بیگم کا بس نہ چلتا تھا کہ آسمان سے چاند تارے بھی توڑ کر اپنی بیٹی کے سنگ کر دیں۔ روحینہ کا نکاح چھ ماہ قبل (یعنی ولید کی شادی کے چند ہی دنوں بعد) ہو چکا تھا اور اسکا شوہر شکیلہ بیگم کا دور پار کا بھانجا ہوتا تھا۔ اسکا سارا خاندان امریکہ میں مقیم تھا اور شادی کے بعد روحینہ کو بھی امریکہ چلے جانا تھا۔ شکیلہ بیگم بیٹی کی شادی پر مسرور بھی تھیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اسکے اتنے دور چلے جانے کا سوچ سوچ کر اداسی کا غلبہ بھی تھا۔

دوسری جانب ولید اور سکندر بھی اکلوتی لاڈلی بہن کو رخصت کرنے کے خیال سے دل ہی دل میں افسردہ تھے۔ اور ایہا۔۔ افسردہ تو وہ بھی تھی کیونکہ اس گھر میں ولید کے بعد اسکی واحد ہمدرد روحینہ ہی تھی۔ اسکی واحد سہیلی۔ جس سے وہ اپنے دل کی ہر بات کر سکتی تھی۔

فنکشن امراء کے ٹپیکل فنشنسز کی طرح فیشن پیسے کی نمود و نمائش اور کسی فیشن پریڈ جیسا تھا۔ بغیر آستینوں کے لمبے لمبے فرائک پہنے، جدید اندازوں میں کٹے چمکیلے بالوں کو مختلف سٹائلز میں سیٹ کیئے، رات کی مناسبت سے کیئے گئے اسموکی میک اپ کیے ہوئے لڑکیاں نزاکت سے ہنستی، باتیں کرتی ادھر سے ادھر گھومتی پھر رہی تھیں۔ اس ماحول میں ایہا بالکل ہی غیر موافق تھی۔ قیمتی لباس اور میک اپ کے باوجود اسکا وجود اس فیشن پریڈ کا حصہ نہیں بن سکتا تھا، کیونکہ اسکا سراپا سادگی اور پاکیزگی کا مظہر تھا۔ بے حیائی کے اس عام مظاہرے میں اسکی واقعتاً کوئی جگہ نہیں بنتی تھی۔ وہ چپ چاپ ایک جانب کھڑی کسی تماشائی کی طرح ولید کے کزنز کو ہلہ گلہ کرتے دیکھ رہی تھی۔ میوزک کا شور اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ رسم ہو چکی تھی اور اب ناچ گانے کا دور چل رہا تھا۔ سب کزنز جوڑے بنا بنا کر کسی گانے پر پرفارمنس دیتے اور باقی سب انکو خوب ہی داد دیتے۔ روحینہ بھی اسی ہجوم میں کھڑی شور مچا رہی تھی۔ ایہا کی نگاہیں ولید کو تلاش کر رہی تھیں، اور پھر وہ اُسے نظر آ ہی گیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر علیشا سے محو گفتگو تھا۔ سفید شلوار قمیص

میں بڑھی ہوئی شیو کیساتھ عام سے حلیئے میں بھی ہمیشہ کی طرح بہت شاندار۔ وہ اسکے پاس چلی آئی۔ ولید نے اسے دیکھ لیا تھا وہ ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

ویسے ایک پر فارمنس تمہاری اور تمہاری بیوی کی بھی ہونی چاہیے۔ علیشا نے لقمہ دیا۔

میری بیوی کو یہ سب پسند نہیں ہے۔ ولید نے مسکرا کر جواز پیش کیا۔

کم آن یار! یہی تو میموریز ہوتی ہیں وہ دیکھو سکندر اور شزاء کو کتنے پیارے لگ رہے ہیں۔ علیشا نے سامنے کی جانب اشارہ کیا جہاں اب سکندر اور شزاء پڑوسی ملک کے کسی گانے پر پر فارم کر رہے تھے۔ بیک لیس زرد ساڑھی سے جھانکتا شزاء کا چاندی چلکاتا وجود وہاں موجود ہر مرد کی نگاہوں کا مرکز تھا۔ ابیہا نے دل ہی دل میں استغفار پڑھی۔

ولی! تم بھی آؤ یار۔ اب تمہاری اور ابیہا کی باری۔ ولید کے کزن عمر نے اسے پکارا۔ باقی سب بھی انہی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

نہیں یار تم لوگ انجوائے کرو۔ ولید نے بلند آواز میں جواب دیا۔

کم آن یار! چلو عمر تو اسکے پاس ہی چلا آیا تھا۔ باقی سب بھی ولید ابیہا کے نام کی ہوٹنگ کرنے لگے۔ ابیہا کی ہتھیلیوں پر پسینہ اترنے لگا۔ اگر اسکا ہاتھ ولید کے ہاتھ میں نہ دبا ہوتا تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بناء اندر کی جانب بھاگ

جاتی۔

ارے یار ڈانس وانس سے میرا دور دور تک کا کوئی واسطہ نہیں۔ ولید نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے مضحکانہ انداز میں کہا۔
ٹھیک ہے تو پھر گانا سناؤ۔ لیلیٰ نے لقمہ دید۔

اوہ یس۔۔۔ ولی تم گانا سناؤ گے بس۔ علیشا تالی بجا کر بولی۔ باقی سب نے بھی بیک زبان ہو کر یہی مطالبہ دہرایا تو ولید کو مانتے ہی بنی۔ اندر سے گیتار منگوایا گیا۔ میوزک بند کر دیا گیا۔ ولید کے لیے کرسی رکھی گئی۔ اور باقی سب اسکے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ ولید کرسی پر گیتار سنبھال کر بیٹھ گیا۔ مووی میکر نے کیمرہ آن کیا۔ زرد چمکیلی روشنی نے ولید کے پرکشش وجود کا احاطہ کیا۔ روحینہ اور علیشا فرشتوں کی طرح ایسا کے دائیں بائیں کھڑی تھیں۔۔۔ ایکسائیڈ سی۔۔۔ عمر نے مائیک بھی سیٹ کر دیا۔ اور ولید نے گیتار کے تاروں ہر قوس پھیرا۔ ایک جلت رنگ سی فضاء میں بکھری اور دور دور ٹولیلوں میں کھڑے مہمان بھی ادھر متوجہ ہو گئے۔ ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ کی آوازیں بھی دم توڑ گئی تھیں۔

بیا! ولید کی دلکش آواز مائیک میں ابھری۔ ایسا سراپا سماعت بن گئی۔ یہ گانا صرف اور صرف تمہارے لیے۔۔۔ اسکے محبت سے گندھے لہجے اور دلکش مسکراہٹ پر زوردار تالیاں پڑی تھیں۔ ایسا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بے طرح

جھینپ گئی تھی۔ ولید نے اسے نظروں کے حصار میں گانا شروع کیا۔
 پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں،

سب کی طویل اونے ہوئے کی گونج میں ولید کی آواز دب گئی۔ بیہا کا دل
 دھڑک اٹھا۔

پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں۔۔۔

اسنے پھر اسی مصرعے کی تکرار کی۔۔

کوئی جدا کرنے نہ پائے

اس نے جیسے بہت ڈوب کر دل سے تان لگائی تھی۔ سارے مجمع پر مکمل سکوت
 طاری ہو گیا۔

میں بھولوں تو میں مرجاؤں، تو بھولے تو تُو مرجائے۔۔

پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں۔۔۔

وہ سر جھکا کر گیتار کے تاروں پہ قوس پھیرنے لگا۔ مدھر سی دھن نے سب کو
 لگن کر دیا تھا۔

میری پہلی خواہش تُو ہے، آخری حسرت تُو ہے۔۔

تو روٹھے تو روٹھے خدائی، میری قسمت تُو ہے۔۔

ایہا نے نظریں اٹھائیں، وہ اسی کی جانب متوجہ تھا۔ اس سمے ولید کی سیاہ آنکھوں میں اسکے لیے محبتوں کا سمندر موجزن تھا۔ ایہا کا دل اس بحر محبت میں دھیرے دھیرے ڈوبنے لگا۔

رک جائے یہ دل کی دھڑکن۔۔

سانس بھی لوں تو سانس نہ آئے۔۔

پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں۔۔

اب وہ کرسی سے اٹھا اور گیتار رکھ کر مائیک ہاتھ میں لیے اسی کی طرف چلا

آیا۔ NEW ERA MAGAZINE

سورج نکلے دیکھ کے تجھ کو، ساتھ تیرے ڈھل جائے

وہ عین اسکے سامنے آن رکا۔

مرتے مرتے میرے لبوں پہ تیرا نام ہی آئے۔۔

اس نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ سارے ماحول پر ایک فسوں قائم تھا۔

جس دن تیری یاد نہ آئے،

اس دن مجھ کو موت آجائے

پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں۔۔

وہ اب ابیہا کا ہاتھ تھامے اسے ساتھ لیے سب کے درمیان میں آگیا۔
کوئی جدا کرنے نہ پائے۔۔

میں بھولوں تو میں مرجاؤں، تو بھولے تو تو مرجائے۔۔ پیار کا وعدہ ایسے
نبھائیں۔۔

اسے کسی اعزاز کی طرح اپنے ساتھ لیے کھڑا وہ گانے کے اختتامی مصرعے دہرا
رہا تھا۔ ابیہا کا ہاتھ اسکے مضبوط ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ جو نہی گانا ختم ہوا تالیوں کا
اک شور گونجا۔ ولید کی مدھر آواز نے تو سارے ماحول پر جیسے سحر قائم کر دیا
تھا۔ اسکی آواز رکتے ہی طلسم چھن سے ٹوٹ گیا تھا۔

ولید ابیہا کا ہاتھ تھامے اسے ساتھ لیے مجمع سے باہر نکلا۔ اب وہ سب کسی اور
ایکٹوٹی کے متعلق تبادلہ خیال کرنے لگے تھے۔ شکیلہ بیگم نے ولید کو آواز دی تو
وہ دونوں ہی اس طرف چلے آئے وہ اپنی کسی جاننے والی خاتون کے ہمراہ کھڑی
تھیں۔

مسز عامر یہ میرا بیٹا ولید۔ یہ کیپٹن ہے ماشاء اللہ۔ انہوں نے خاتون سے ولید
کا تعارف کروایا۔ انداز فخریہ تھا۔ اور ولی یہ میری بہت اچھی دوست مسز عامر
ہیں۔

السلام علیکم آنٹی۔ ولید خوش اخلاقی سے مسکرایا۔

وعلیکم السلام! ہاؤ آر یو بیٹا۔ آپکی ممی آپکا بہت ذکر کرتی ہیں۔ وہ خاتون مسکرا کر نزاکت سے بولیں۔

ایکپوٹیلی میری ممی سے ملاقات کم کم ہوتی ہے ناں اسلیے یہ مس کرتی ہیں مجھے اور مس تو میں بھی بہت کرتا ہوں ممی کو۔ اسنے مسکرا کر ماں کس بازو کے حصار میں لیا تھا اسی اثناء میں ابیہا کا ہاتھ اسکے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ابیہا یکدم عقب میں چلی گئی۔

سکندر بھی میرا بہت اچھا بیٹا ہے مگر ولی سے میرے دل کا عجیب سا رشتہ ہے مسز عامر۔ شکلیہ بیگم ان خاتون کو بتا رہی تھیں۔ ابیہا کو یکدم اپنا آپ اس جگہ پر اضافی لگا وہ ایک قدم پیچھے ہٹی اور پھر جانے کو پلٹی عین اسی لمحے ولید پلٹا اور اسکا ہاتھ تھام کر اسکو روکا۔

آئی یہ میری بیوی ہیں ابیہا۔ اسنے خاتون سے اسکا تعارف کروایا۔ ابیہا نے جلدی سے سلام جھاڑا۔ خاتون نے مسکرا کر ابیہا کا سرتاپا جائزہ لیا۔

وعلمک السلام! مبارک ہو بھئی شکلیہ دادی بننے جارہی ہیں آپ۔ انہوں نے متبسم لہجے میں رخِ سخن شکلیہ بیگم کی طرف موڑا۔ شکلیہ بیگم کے چہرے پر واضح ناگواری ابھری۔

جی جی بس اللہ کا کرم ہے۔ وہ بمشکل مسکرائیں۔

اور کیا ایکٹیویٹیز ہیں آپکی؟ خاتون نے ابیہا سے پوچھا۔

جی کچھ خاص نہیں بس گھر میں ہی ہوتی ہوں۔ اسنے جواباً مدھم لہجے میں کہا۔
ایسا ایک پرفیکٹ ہاؤس وائف ہے آنٹی۔ عین میری پسند کے مطابق۔ ولید نے
مسکرا کر کہا۔

لو میرج ہے؟ خاتون نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

آپکو کوئی شک ہے اسمیں۔۔ ولید نے شرارتی لہجے میں جواب دیا۔

ہا ہا ناٹ ایٹ آل۔ وہ تو سب کو نظر آرہا ہے۔ اتنا رومانوی گانا بیوی کے لیے
کم ہی کم لوگ گاتے ہیں۔ خاتون محظوظ ہوتے ہوئے بولیں۔

ایسا جیسی بیوی بھی تو کسی کی نہیں ہوتی ناں آنٹی۔ ولید نے بازو وا کر کے ایسا
کو خود سے قریب کر لیا۔ ایسا بہت کنفیوز ہو رہی تھی اور اس پر مستزاد شکلیہ
بیگم کے چہرے کے بگڑتے زاویے۔۔ کافی آکورڈ سچویشن تھی۔

ولید مجھے کچھ کام ہے۔ میں آتی ہوں ایکسیوزمی آنٹی۔ وہ بروقت بہانہ بنا کر
وہاں سے ہٹ گئی تھی۔



کیا ضرورت تھی آپکو ایسا کو مسز عامر سے متعارف کروانے کی؟ رات گئے
فنکشن اختتام پذیر ہوا تو شکلیہ بیگم نے ولید کو اپنے کمرے میں بلایا۔
اسمیں کیا حرج تھا ممی؟ ولید کے لہجے میں لاپرواہی تھی۔

حرج تھا بہت حرج تھا۔ آپکے ہٹتے ہی وہ مجھ سے کہنے لگیں کہ مڈل کلاس سے بہو لائیں ہیں کیا آپ۔ اتنی شرمندگی ہوئی مجھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے مجھے یہ بھی سنا دیا کہ اتنے پرکشش بیٹے کو اتنی شکل لڑکی پسند آئی جو اسکے پہلو میں کھڑی اسکے ساتھ ایک فیصد بھی نہیں جچتی۔ شکیلہ بیگم دبے دبے لہجے میں بول رہی تھیں۔

ممی! لوگوں کو باتیں بنانے کی عادت ہوتی ہے۔ انکو منہ توڑ جواب دے کر چپ کروادینا چاہیے۔ وہ اطمینان سے بولا۔

یعنی تمہاری اس چھوٹے خاندان کی بیوی کی خاطر میں اپنے حلقہء احباب سے جھگڑے مول لے لوں۔ وہ چمک کر بولیں۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

ممی۔۔ ولید نے تنبیہ کرنے والے لہجے میں کہا۔

شٹ اپ۔۔ جایی دور ہو جائیے میری نظروں کے سامنے سے۔ جس طرح آپ نے آج ایہا کے لیے گانا گا کر مجھے میرے حلقہء احباب میں شرمندی کروایا ہے اسکے بعد میرا آپکی اور ایہا کی صورت دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا۔

ممی۔۔ آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ ولید کو انکی بات اور انکا لہجہ برا لگا تھا۔

جایی پلیز۔۔ شکیلہ بیگم ہاتھ ہلا کر بیزاری سے بولیں۔

ممی۔۔ آپ کا رویہ بدل جانے کی وجہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ ابیہا اس گھر کی بہو ہے۔ آپ نے اسے جس طرح ہر فنکشن میں سائیڈ لائن کیا ہوا ہے وہ مجھے اچھی طرح نظر آرہا ہے۔ اگر روحینہ کی شادی کا سلسلہ نہ ہوتا تو میں اپنی بیوی کی اس قدر ہتک ہر گز بھی برداشت نہ کرتا۔ وہ یکدم غصے سے بولا تھا۔

ہر رشتے کا لحاظ تو آپ بھول چکے ہیں بیوی کی محبت میں۔ اب بہن کو بھی بھول جائیے۔ شکیلہ بیگم دوبدو بولیں۔

یہ آپ کی ذہنی اختراع ہے ممی ورنہ میں وہی ولید ہوں جو سب رشتوں میں انصاف کرنا جانتا ہے۔ ولید نے مضبوط لہجے میں کہا۔
بہت خوب انصاف قائم کر رہے ہیں آپ رشتوں کے مابین۔۔ ساری دنیا کو ہی نظر آرہا ہے۔ شکیلہ بیگم نے طنزاً کہا تھا۔

ممی۔۔ پلیز۔

پلیز ولید۔ آپ مجھ پر رحم کریں۔ میں ابیہا نامہ سن سن کر تنگ آچکی ہوں۔ کسی جگہ بھی متعارف کروانے کے قابل نہیں ہیں وہ۔ ہمارے حلقہء احباب میں کسی سے بھی بات نہیں کر سکتی وہ۔ کم اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہیں ان میں۔ مجھے تو افسوس ہوتا ہے انکو آپکے ہمراہ دیکھ کر۔ وہ کسی طور بھی آپکے لائق نہیں۔ لیلیٰ کو دیکھیں کتنی با اعتماد ہے۔ جہاں کھڑی ہوتی ہے بس وہ ہی وہ نظر آتی ہیں۔

تو میں کیا کروں مُمی۔۔ مجھے کسی لیلیٰ میں کوئی انٹرسٹ نہیں میں اپنی شادی شدہ زندگی میں بہت پرسکون اور خوش ہوں۔ گڈ نائٹ۔ وہ ناگواری سے انکی بات کاٹ کر تیز لہجے میں کہتا ہوا انکے کمرے سے نکل گیا تھا۔ شکیلہ بیگم غصے میں بل کھاتی رہی تھیں۔



وہ سخت جھنجھلایا ہوا شکیلہ بیگم کے کمرے سے نکلا اور اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اسٹڈی روم میں چلا گیا۔ اسکی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ اس کی اچھی بھلی زندگی کو ایک مسئلہ بنا کر رکھ دیا تھا شکیلہ بیگم نے۔ وہ انکے رویے کے اس تغیر کو سمجھنے سے قطعی قاصر تھا۔ وہ ایہا کو بہت پیار سے بیاہ کر لائی تھیں مگر اب نجانے کیوں ان کو اس کی ہر بات سے چڑھنے لگی تھی۔ ایہا کا اس گھر میں جو مقام تھا وہ ولید کے دل کو سلگاتا تھا۔ شکیلہ بیگم شہزاد اور لیلیٰ کو ہر رسم ہر فنکشن میں آگے آگے رکھتی تھیں۔ ایہا کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جا رہا تھا اور یہ بات ولید کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بھلے ایہا زبان سے کہہ کر کبھی شکایت نہیں کرے گی لیکن سسرال کی اس بے اعتنائی ہر اسکا حساس دل بہت دکھتا تھا۔ ولید کا بس چلتا تو ایہا کو کبھی کوئی دکھ نہ پہنچتا مگر وہ مجبور تھا۔ اکلوتی لاڈلی بہن کی شادی کا معاملہ تھا وہ ابھی مُمی کیساتھ دو ٹوک بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اضطراری انداز میں ٹہلنے لگا۔ وہ ساری رات اسنے اسٹڈی میں ہی گزار دی تھی۔



روحینہ کی مہندی کے فنکشن میں بھی ایہا کو مسلسل اگنور کیا گیا تھا۔ اور تب ولید کی برداشت بالکل جواب دے گئی جب شکیلہ بیگم نے گروپ فوٹو میں ایہا کو سائیڈ پر ہو جانے کو کہا۔ ایہا کا چہرہ مارے ہتک کے سرخ ہو گیا تھا۔ قریب تھا کہ وہ رو پڑتی وہ آگے بڑھا۔

می آئی تھنک میں اور ایہا فیملی گروپ فوٹو سے الگ ہی ٹھیک ہیں۔ اسنے مضبوط لہجے میں کہا۔ اسٹیج پر موجود سکندر شہزاد لیلیٰ جمیلہ شکیلہ بیگم اور روحینہ کی سسرال چومک چونک گئے۔

ولی! یہ کیا طریقہ ہے آکر گروپ فوٹو بنوائیے۔ شکیلہ بیگم نے آنکھیں نکالیں۔ میری بیوی کی جس گروپ فوٹو میں جگہ نہیں بنتی وہاں میں کھڑا بھی ہونا پسند نہیں کرتا می۔ آئم سوری روجی۔ چلو بیا۔ وہ ترش روئی سے کہہ کر ایہا کا ہاتھ تھام کے تیز قدموں سے چلتا رہائشی عمارت کی طرف بڑھا۔ سکندر ہڑبڑا کر عجلت میں اسٹیج سے اتر ا۔ روحینہ بھی ولی بھیا پکارتی اسٹیج سے اتر کر انکی طرف آئی۔

کم آن یار۔ یہ ناراض ہونے کا موقع نہیں ہے۔ تم اور بھابھی چلو اسٹیج پر۔ سکندر نے سبھاؤ سے بات سنہبالنا چاہی۔

پلیز ولی بھیا۔ بیا پلیز چلو یار۔ روحینہ نے ایہا کا ہاتھ تھام کر لجاجت آمیز لہجے

میں کہا تھا۔ ولید کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ مگر موقع محل دیکھ کر وہ چپ چاپ واپس پلٹ آیا تھا۔ روحینہ نے مضبوطی سے ابیہا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

اس روز رات گئے ولید شکلیہ بیگم کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ وہ میک اپ اتار رہی تھیں۔

کیا ملا آپکو مئی آج بیا کو سب کے سامنے بے وقعت کر کے۔ وہ اندر آتے ہی دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

اسکو اسکی اوقات یاد دلائی ہے۔ انہوں نے ہموار لہجے میں جواب دیا
 وہ مسز ولید حسن ہے مئی یہ ہے اسکی اوقات۔
 وہ مسز ولید حسن بننے کے لائق نہیں۔

وہ مسز ولید حسن ہے مئی۔ آپکے خاندان کو پہلا پوتا یا پوتی دینے والی ہے۔ یہ مت بھول جایا کریں۔ ولید کا لہجہ جتانے والا تھا۔

یہ سب میری غلطی کا نتیجہ ہے۔ نہ میں آپکی ضد کے آگے گٹھنے ٹیکتی نہ وہ دو ٹکے کی لڑکی آپکی بیوی بنتی۔ وہ کاٹن سنگھار میز پر پٹخ کر اسکی طرف پلٹیں۔
 مئی۔ مت کہیں اسکے لیے وہ الفاظ جو آپکو زیب نہیں دیتے۔ ولید کے ماتھے کی رگیں پھول گئیں۔

آپکو حقیقت کا آئینہ دیکھتے ہوئے اتنی تکلیف کیوں ہو رہی ہے ولید۔ انہوں نے تنکھے لہجے میں پوچھا۔

یہ حقیقت نہیں آپکا احساس برتری ہے مئی۔ ابیہا ہر لحاظ سے ایک اچھی لڑکی ہے۔

ہونہہ اچھی لڑکی۔۔ چادر میں لپٹی گنوار جاہل جس کو بات تک کرنے کی تمیز نہیں اسے آپ اچھی لڑکی کہہ رہے ہیں۔ اچھی لڑکی دیکھنی ہے تو لیلا کو دیکھیے شکیلہ بیگم کا لہجہ اتنا تلخ تھا کہ ولید کو حیرت نے آلیا تھا۔

بھاڑ میں جائے لیلا۔ ولید بری طرح تپ گیا۔

تمیز سے بات کریں۔ وہ میری بھانجی ہے۔

جس کو آپ دو ٹکے کی لڑکی کہہ رہی ہیں وہ میری بیوی ہے مئی۔ میری عزت ہے۔ اسنے ترکی بہ ترکی جواب دیا

بس کر دیں ولید۔۔ میں تو جب سے لیلا سے ملی ہوں پچھتاوے میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ وہ میری بہو بنتی تو میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا۔

مئی۔۔ بس بہت ہو گیا۔۔ مزید ایک لفظ مت بولے گا۔ وہ غصے سے کہہ کر پاؤں پٹختا ہوا انکے کمرے سے نکلا اور سیدھا اپنے کمرے میں آیا۔ ابیہا موجود نہ تھی۔ وہ جو توں سمیت بستر پر گر گیا۔ اسے معلوم تھا کہ آج رات ابیہا نے

روحینہ کے کمرے میں ہی رہنا تھا۔ وہ ساری رات جاگتا رہا تھا۔



تمام رات ان دونوں نے خوب ساری باتیں کی تھیں۔ اگلا روز بہت سی مصروفیات لے کر طلوع ہوا تھا۔ روحینہ پارلر چلی گئی۔ ولید ہوٹل کے انتظامات دیکھنے چلا گیا اور ایہا تیار ہونے لگی۔ اسنے امی ابو کو فون کر کے فنکشن میں شرکت کرنے کی یاد دہانی کروادی تھی۔ گزشتہ فنکشنز میں تو وہ نہ آسکے تھے مگر بارات میں امی ابو کے آنے کا پورا ارادہ تھا۔

ایہا نے نہا کر لباس تبدیل کیا۔ گہرے پرپل رنگ کی ٹخنوں تک آتی فراک جس پر سلور ستارے بکھرے ہوئے تھے ولید نے خاص طور پر اس فنکشن کے لیے اسکے لیے خریدا تھا۔ وہ ڈرائر سے اپنے لمبے گھنیرے بال سکھانے لگی۔ تبھی دروازہ کھلا اور ولید اندر آیا۔ وہ کل والی افید شلوار قمیص میں ہی ملبوس تھا۔ اسکی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

بہت پیاری لگ رہی ہو۔ وارڈروب کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے معمول کے انداز میں اسکی تعریف کی۔

شکریہ جناب۔ وہ بھی مسکرائی۔

انکل آنٹی آئیٹنگے ناں آج؟ اسنے وارڈروب سے اپنا ہینگ شدہ نیوی بلیو تھری پیس سوٹ نکالتے ہوئے اس سے پوچھا۔

جی آئینگے میں نے پوچھا تھا امی سے۔ اس نے جواب دیا۔ ولید سر ہلا کر ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔ ابیہا نے اپنے بال سکھا کر جوڑا بنایا اور ہلکا سا میک اپ کر لیا۔ ہلکی پھلکی جیولری بھی پہن لی۔ ابھی وہ اپنی تیاری کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ ولید ڈریسنگ روم سے باہر نکلا۔

بیا! بال کھول دو ناں اچھے لگتے ہیں۔ اسنے تولیے سے بال خشک کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

اتنے لوگ ہونگے وہاں ولید۔ سب دیکھیں گے میرے بال تو کتنا گناہ ملے گا ناں۔ اسنے سادہ سے لہجے میں جواب دیا اور بال کھول کر چوٹی گوندھنے لگی۔ ٹائی لگاتے ہوئے ولید کے ہاتھ ایک لمحہ لو تھمے تھے۔

لائیں میں باندھ دوں۔ وہ آگے بڑھ کر اسکے عین سامنے آن رکی اور اسکی ٹائی کی گرہ باندھنے لگی۔ اسکے لمبے بال آدھے چوٹی میں بندھے ہوئے تھے۔ ہلکے سے میک اپ کے ساتھ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔۔۔ ولید کے دل کو۔۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھے گیا۔

ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ وہ دھیما سا تبسم ہونٹوں میں دبا کر پوچھ بیٹھی۔ دیکھ رہا ہوں کہ مجھے تو دنیا میں ہی جنت کی حور دے دی اللہ تعالیٰ نے۔۔۔ مجھ جیسا خوش نصیب بھی کوئی ہوگا۔ وہ جذب کے عالم میں بولا۔ ابیہا اسکی ٹائی کی گرہ باندھ چکی تھی مگر اسکے ہاتھ ابھی ٹائی سے ہی الجھے تھے۔۔۔ ولید کہ

دھڑکنوں کے قریب۔۔

کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی۔ جھینپ کر بولی۔

آئی لو یو بیا۔۔ تم بہت اچھی ہو۔ وہ بہت مدھم لہجے میں کہتا اسکی دھڑکنیں
بڑھا گیا تھا۔ وہ مسکرا کر پلٹ گئی۔

کبھی تم جواباً آئی لو یو ٹو بھی کہو گی مجھے یا حسرت ہی رہ جائیگی میری۔ وہ عقب
سے بولا۔

آئی لو یو ٹو۔۔ بس اب خوش۔ اسنے تیز تیز بول دیا تھا۔ ولید مسکرایا۔

لو یو مور مائے سوئیٹ ہارٹ۔ وہ پیار سے کہہ کر کوٹ پہننے لگا۔



روحینہ کی شادی کا فنکشن خوش اسلوبی سے نمٹ گیا تھا۔ اسکی رخصتی کے وقت
ایہا کو عجب سی گھبراہٹ نے آن گھیرا۔ روحینہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔
راویتی سا سماں بندھ گیا تھا۔ شکیلہ بیگم ولید اور سکندر بھی آبدیدہ تھے۔ ادھر
روحینہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئی ادھر ایہا ایک کرسی پر ڈھے سی گئی۔ اسکا
بی پی یکدم لو ہو گیا تھا۔ ولید واپس پلٹا تو اسے دیکھ کر تیزی سے اسکے پاس آیا۔
بیا کیا ہوا؟ اسنے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

پتہ نہیں بس دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ایہا نے نقیہ لہجے میں جواب دیا۔ تبھی شکیلہ

بیگم ، جمیلہ کے ہمراہ پلٹ آئیں۔

ولی بیٹا آپ نے شزاء اور لیلیٰ کو روحی کے ہاں سے پک کرنا ہے رات تک۔
شکیلہ بیگم نے ولید کو ہدایت دی۔ ولید تشویش آمیز نظروں سے ابیہا کی طرف
دیکھ رہا تھا۔

ممی میں ابیہا کو لے کر گھر جا رہا ہوں اسلی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسنے جواباً
تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ شکیلہ بیگم کے ماتھے ہر بل پڑ گئے۔

روحی خاص طور پر یہ تاکید کر کے گئی ہے کہ آپ ہر صورت آئیں اس سے
ملنے۔ انہوں نے ایک اک لفظ پہ زور دے کر کہا۔

ممی میں بعد میں چلا جاؤنگا ابھی بیا کو گھر کے جانا ضروری ہے بلکہ پہلے میں
تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں اٹھو۔ وہ کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں
تھا۔ اسنے ابیہا کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر سب کے درمیان سے ہوتا یہ جا وہ
جا۔ شکیلہ بیگم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی تھیں۔

ولید وہاں سے سیدھا ابیہا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اسکا بی پی لو تھا۔ ڈاکٹر
نے کچھ دوائیں لکھ دی تھیں۔ ولید اسے لے کر گھر پہنچا تب تک شکیلہ بیگم
بھی گھر آچکی تھیں۔ سکندر انکے ہمراہ تھا۔ وہ دونوں بڑے کمرے میں موجود
تھے۔ ولید ابیہا کو کمرے میں کے آیا ابیہا کپڑے تبدیل کر کے لیٹ گئی۔ ولید
کچھ دیر اسکے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا پھر اسے نیند آنے لگی تو وہ بتی بجھا کر

کمرے سے چلا آیا۔ زینے طے کر کے نچلے پورشن میں آیا۔ جہاں بڑے کمرے میں سکندر اور شکیلہ بیگم بیٹھے تھے۔ وہ وہیں چلا آیا۔

ممی میں روحی کی طرف جاتا ہوں۔ آپ چلیں گی۔ اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

رہنے دیں آپ میں اور سکندر جارہے ہیں۔ شکیلہ بیگم نے نروٹھے پن سے کہا۔ ممی میں چلا جاتا ہوں روحی سے مل۔۔۔

روحی سے کل مل لیجئے گا۔ شکیلہ بیگم نے تیز لہجے میں اسکی بات کاٹی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انکے ساتھ ہی سکندر بھی اٹھا۔

چلیں بیٹا۔ اللہ حافظ۔ وہ اپنا سٹائش سائیگ کاندھے پر ڈال کر سکندر کے ہمراہ کمرے سے چلی گئی تھیں۔ ولید نے ایک طویل سانس لی۔ اب وہ ابیہا کو گھر ہر اکیلا چھوڑ کا جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ممی سخت خفا ہیں اور اسکے نہ جانے کے باعث روحینہ بھی بہت خفا ہوگی۔ وہ باہر ہان پر ٹہلنے لگا۔ اسکا ذہن روحینہ اور اسکی متوقع خفگی میں الجھا ہوا تھا۔



آپکو اندازہ بھی ہے کہ آپ نے آج کیا کیا ہے۔۔۔ شکیلہ بیگم نے تلخ لہجے میں کہا۔ ولید سر جھکائے انکے روبرو تھا۔

روحی کتنی شدت سے آپکی منتظر تھی۔ آپکے نہ آنے کی وجہ سے اسکو کتنا دکھ ہوا۔ مگر آپکو کیا پرواہ۔ آپکو تو بس پوری دنیا میں ایک اپنی بیوی نظر آتی ہے۔

ممی میں روحی سے بات کر لوں گا۔ اسنے ہموار لہجے میں کہا۔

کیا بات کر لیں گے آپ اس سے۔۔۔ ہاں۔۔ اسکی زندگی کے سب سے خاص دن میں اسکا سب سے پیارا بھائی اسکی بجائے اپنی بیوی کی ناز برداریوں میں مصروف تھا۔ یہی بات انکو دکھی کر دینے کے لیے بہت کافی ہے۔

ممی مجھے سب کا خیال رہتا ہے۔

ہاں ہاں جانتی ہوں میں جتنا آپ کو سب کا خیال رہتا ہے۔ انہوں نے طنزیہ لہجے میں اسکی بات کاٹی۔

ممی میں شرمندہ ہوں۔

رہنے دیجیے۔ آپ بھی اپنی بیوی کی طرح منافقت چلنے لگ گئے ہیں۔ وہ بھی اوپر سے بہت معصوم اور بھولی بنتی ہے جبکہ اندر سے وہ ٹپیکل تیز طرار چالباز قسم کی مڈل کلاس عورت ہے۔ وہ زہر اگل رہی تھیں۔ کمرے کے باہر سے گزرتی ایسا بے ساختہ ہی رک گئی۔

ممی یہ میرا قصور ہے ایسا کو بلیم مت کریں۔ ولید نے کہا۔

سارا قصور ایسا کا ہی ہے۔ وہ ہی آپکو بہکاتی ہے۔ یہ مڈل کلاس عورتیں اسی

قسم کی بدبودار چالیں چلنے کی ماہر ہوتی ہیں۔ اور ابیہا۔۔ اس نے تو شادی سے پہلے کا ہی آپ کو اپنی انگلیوں پر نچا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ تلخ لہجے میں بولتی جا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر کھڑی ابیہا کا دل دکھ سے بھر گیا۔

یو نو واٹ ولی مجھے بہت خوشی ہوتی اگر آپ شادی کے لیے علیشا یا لیلیٰ میں سے کسی کا انتخاب کرتے۔ کم سے کم وہ دونوں ہمارے خاندان کی ہیں ہمارے جیسی ہیں۔ آپ کی اس مڈل کلاس گنوار بیوی کی طرح سازشی نہیں ہیں۔ وہ اس سے نفرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ ابیہا چپ چاپ پلٹ گئی۔

می پلیز کول ڈاؤن۔ آئندہ آپکو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ آپ پلیز ہر بات کا الزام ابیہا کے سر نہ ڈال دیا کریں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔

بس کر دیں ولید۔ شکیلہ بیگم ہاتھ اٹھا کر اکتاہٹ بھرے انداز میں بولیں۔ وہ جتنی اچھی ہے یہ ساری دنیا کو نظر آرہا ہے۔ کیسے انہوں نے آپکو بس خود ہی تک محدود کر لیا ہے۔

می ایسا مت کہیں۔ آپ مجھے جانتی ہیں میں محبتوں اور رشتوں کو کتنی اہمیت دینے والا انسان ہوں۔ ولید نے انکے خیال کو رد کیا۔

شادی سے پہلے تک آپ سب رشتوں کو اہمیت دیتے تھے مگر شادی کے بعد سے آپکا بس ایک ہی رشتہ رہ گیا ہے شاید اور وہ ہے ابیہا۔۔

می ایسا نہیں ہے۔ اس کنڈیشن میں اسکو سب سے زیادہ میری سپورٹ کی

ضرورت ہے۔ اور مئی میری زندگی ایسی ہے کہ کچھ معلوم نہیں کب رختِ سفر باندھنا پڑے اسلئے میں زیادہ سے زیادہ وقت ایسا کو دینا چاہتا ہوں۔

ہمارے حصے کا وقت بھی۔۔۔

مئی۔۔ ایس انہیں ہے۔۔ کانسڈلی ایسا مت سوچیں۔ م پلیز۔ وہ جیسے تھک ہار گیا تھا۔

ولید آپ نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ میں نے اپنا سب سے فرمانبردار بیٹا کھو دیا ہے۔ اب میرے سامنے میرا بیٹا ولی نہیں بلکہ ایسا کاظم کا شوہر کھڑا ہے۔

میں آپکا ہی بیٹا ہوں مئی۔۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ نے اپنی آنکھوں پر نفرت کی عینک چڑھا لی ہے تبھی تو محبتوں کے عکس دھندلائے ہوئے نظر آرہے ہیں آپکو۔ اور جب انسان نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے تو اسے بے پایاں چاہت بھی ڈھونگ اور ڈھکوسلہ ہی دکھائی دیتی ہے۔ وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں ایک اک لفظ دہرا کر وہاں رکا نہیں تھا وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ جہاں ایسا بستر کنارے ٹکی تھی۔ گم صم سی۔۔۔

- کیا ہوا ہے تمہیں؟ اسنے اسے مخاطب کیا

کچھ نہیں۔ آپ کہاں تھے؟ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

یہیں تھا۔ وہ خشک لہجے میں جواب دے کر بستر کی طرف بڑھا۔ اسکی پیشانی پر تفکرات کا جال بچھا ہوا تھا۔
کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔۔

ضروری تو نہیں ہے کہ جو تمہیں لگے وہی حرفِ آخر ہو۔ وہ یکدم تلخ لہجے میں بولا۔

میں نے یہ تو نہیں کہا۔ مگر آپ کے چہرے سے لگ رہا ہے کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔ مجھ سے شئیر کریں۔ وہ نرم لہجے میں بولی۔

جب میں نے بولا ہے کہ کچھ نہیں ہوا تو کیوں میرے سر پر سوار ہو رہی ہو۔ وہ یکدم غصے سے چلایا تھا۔ ابیہا اس اندازِ مخاطب پر دنگ رہ گئی۔ وہ اسکے سامنے اونچی آواز میں بات تک نہیں کرتا تھا کجا کہ چلانا۔

یہ لائٹ بند کر دو۔ سونا ہے مجھے۔ دو منٹ کا سکون نہیں۔ زندگی ہے کہ عذاب ہے۔ وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گیا اسکی بلند بڑبڑاہٹ باسانی ابیہا کی سماعتوں تک پہنچ رہی تھی۔ اسنے چپ چاپ لائٹ بند کی اور بستر کے دوسرے کنارے آکر لیٹ گئی۔ وہ فطرتاً ڈرپوک تھی سو اسمیں اتنی ہمت تو نہ تھی کہ ہاتھ بڑھا کر ولید کو جھنجھوڑ کر پوچھتی کہ اسکا رویہ اتنا تلخ کیوں ہو گیا۔۔ وہ اتنی باہمت کبھی نہ تھی۔ سو چپ چاپ کڑھتی رہی۔ دوسری جانب ولید بھی شدید ذہنی انتشار کا شکار تھا۔ می کے عجیب و غریب رویے اور شکایتوں کے انبار نے اسکی

پر سکون سی زندگی میں ایک ہیجان برپا کر دیا تھا۔ اسکو سمجھ نہ آرہی تھی کہ اس پل پل بگڑتی ہوئی صورتحال کو کیسے کنٹرول کرے۔ وہ ساری رات ان دونوں نے اپنی اپنی جگہوں پر جاگتے ہوئے گزاری تھی۔ اگلے روز ولید فجر کی نماز پڑھ کر لوٹا تو ذہنی طور پر کافی پر سکون تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو ایہا کو جائے نماز ہر بیٹھے دیکھا وہ ہاتھ بلند کیے دعا مانگ رہی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا اسکے قریب پنچوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہ محو دعا تھی۔ ولید اسے دیکھے گیا۔ سیاہ چادر کے ہالے میں وہ معصوم سا۔۔ عام سا چہرہ اسکے دل پر بنا ہوا تھا۔ ایہا نے دعا مانگ کر چہرے پر ہاتھ پھیرے۔

بی۔۔ اس نے نرم لہجے میں اسے پکارا تو وہ چونکی اور گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

جی۔

طبیعت ٹھیک ہے ناں تمہاری؟

جی۔۔ بالکل ٹھیک ہوں۔

مجھ سے خفا ہو؟

نہیں۔۔ آپ خفا ہیں؟

بالک بھی نہیں۔۔ اسنے نفی میں سر ہلایا۔

بیا! چلو ایک بات طے کرتے ہیں۔

کیسی بات؟

بیا! چاہے کوئی بھی ایشو ہو ہم آپس میں شیئر کیا کریں گے۔ مل بیٹھ کر حل نکالیں گے۔ لیکن ایک دوسرے سے خفا نہیں ہونگے۔ اک دوسرے پر چلائیں گے نہیں۔ وہ بہت مدہم آواز میں بول رہا تھا۔ ابیہا نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ صبح صادق کے ان لمحوں میں وہ عام سے سفید شلوار قمیض میں بھی کیسا خاص اور دلکش نظر آرہا تھا۔ اسکے فوجی کٹ بال ماتھے پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔

اوکے ڈن۔ وہ مدہم سا مسکرائی۔
 NEW ERA MAGAZINE.com
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
 ڈن۔ ولید بھی مسکرا دیا۔

چلو اب سو جاؤ۔ ساری رات جاگتی رہی ہو۔ وہ اسکا گال تھپتھپا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ بھی سو جائیں ساری رات جاگتے ہیں۔ وہ بھی اٹھ کر جائے نماز تہہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

اوکے میم۔ ولید نے سر ہلایا تھا۔ ابیہا اپنی چادر کی بندش ڈھیلی کرتے ہوئے بستر کی جانب بڑھ گئی۔



روحینہ کے ولیمے کا فنکشن بہت خوش اسلوبی سے گزر گیا تھا۔ ابیہا اور ولید اس روز بہت خوش تھے۔ مگر وہ ان لمحات میں یہ نہ جانتے تھے کہ انکی خوشیوں کو کسی کی نظر بد بری طرح لگ چکی تھی۔ اور نظر بد سے بھلا کون بچ سکا ہے۔



اگلے روز ولید کی سیاچن پوسٹنگ کے آرڈرز آگئے اور وہ بہت بو جھل دل کیساتھ چلا آیا تھا۔ جاتے سے اسنے ابیہا کو بہت دیر تک اپنی بانہوں کے حصار میں لیے رکھا تھا۔ وہ جیسے اسکی خوشبو کو خود میں جذب کر لینا چاہتا تھا۔ وہ دونوں چپ تھے۔۔۔ دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔ وقتِ رخصت سر پر آن پہنچا تو ولید حسن نے ایک طویل بوسہ اپنی شریک حیات کی پیشانی پر ثبت کیا اور اپنا مختصر سا سامان لیے پلٹ گیا تھا۔ ابیہا حدِ نگاہ تک اسے تکتی رہی تھی۔ ولید بھی جاتے جاتے کئی بار اسے پلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا تھا۔ ان دونوں کے دل بے چین تھے۔۔۔ انکی شدید محبت نے شاید انکے دلوں کو الہام کی صورت یہ وارننگ دے ڈالی تھی کہ یہ ابیہا کی ولید سے اور ولید کی ابیہا سے۔۔۔ آخری ملاقات تھی۔۔۔

پوسٹنگ کے دو ماہ بعد ایک روز سیاچن سے خبر آئی تھی کہ شدید ترین برف کے طوفان کے باعث گیارہ سیکٹر پر تعینات کچھ فوجی اہلکار لاپتہ ہو گئے تھے۔ اور ولید حسن ان میں سے ایک تھا۔ یہ خبر ولید کے گھر والوں پر کسی بم کی

طرح گری تھی۔ ایسا جو حمل کے آخری مراحل سے گزری رہی تھی۔ یہ خبر سن کر خود کو سنبھال نہ سکی تھی۔ اور بی پی شوٹ کر جانے کے باعث ہسپتال منتقل ہو گئی۔ شکلیہ بیگم بھی ڈھے سی گئی تھیں۔ جبکہ روحینہ جو کہ اپنے شوہر کے ساتھ عمرہ کرنے گئی ہوئی تھی اس تک ابھی یہ خبر نہ پہنچائی گئی تھی۔ کچھ روز لاپتہ فوجیوں کی تلاش جاری رہی مگر بے سود۔۔ دو سو کلو میٹر فی گھنٹہ کہ رفتار سے چلنے والے برفانی ہوا کے جھکڑ تو جانے کتنے اونچے پورے مردوں کو خشک پتوں کی طرح اڑا لے گئی تھی۔۔ یہ تین چار فوجیوں کی کیا بساط۔۔۔ چند روز کی سر توڑ تلاش کے بعد ولید سمیت ان چاروں جوانوں کو شہید ڈکلیئر کر دیا گیا تھا۔ وہ ایک سرد طوفانی رات تھی جب یہ خبر ولید حسن کے گھر تک پہنچی تھی۔ شکلیہ بیگم تو یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور غش کھا کر گر پڑیں جبکہ ایسا جو آج ہی طبیعت بہتر ہونے پر ہسپتال سے گھر آئی تھی۔۔ یہ خبر پاتے ہی ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔



دوسرا حصہ۔۔۔

سورج کی چمکیلی روشنی چہار سو بکھر چکی تھی۔ فضاء میں کئی پھولوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ سچیت گڑھ بارڈر لائن کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں صبح صادق کا آغاز ہمیشہ کی طرح مندروں کی گھنٹیوں کی ٹن ٹن اور بھجن کی آوازوں سے ہوا تھا۔ جموں کے علاقے کے اس گاؤں کی آبادی کا بیشتر حصہ

ہندو برادی پر مشتمل تھا۔ بارڈر کے قریب آباد اس گاؤں کی آبادی قلیل اور زندگی بہت سادہ تھی۔ یہاں کے باسی اکثر سچیت گڑھ لائن کا دورہ کرنے کے لیے آنے والے سیاحوں کو دیکھا کرتے تھے۔ کچھ ہوشیار نوجوان ان سیاحوں کو ان اطراف کے متعلق کچھ معلومات فراہم کر کے کچھ پیسے بھی بنا لیا کرتے تھے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ تھا جہاں کے محنت کش لوگ سارا دن محنت مزدوری کرتے اور روکھی سوکھی کھا کر بھگوان کا شکر ادا کر کے چین کی نیند سو جایا کرتے تھے۔ وہاں بسنے والے بہت سے خاندانوں میں ایک خاندان شکر داس کا بھی تھا۔ وہ گاؤں کے چھوٹے سے مندر کا پجاری تھا۔ اور سارا گاؤں اس کا احترام کرتا تھا۔ وہ منہ اندھیرے اٹھ کر مندر سدھار جاتا اور پاٹ کا انتظام کرتا۔ گھر کا نظام مندر میں آنے والوں کے دیئے گئے نذرانوں اور چڑھاؤں کے پیسوں سے چلتا تھا۔ شکر داس کے ایک ہی اولاد تھی۔ شردہا کماری۔ اسکی بیوی کی وفات شردہا کی پیدائش کے سلسلے میں ہو گئی تھی۔ شکر نے دوبارہ شادی نہ کی اور اپنی زندگی اکلوتی بیٹی کی پرورش کے نام وقف کردی۔ بچپن سے ہی ننھی شردہا باپ کے ہمراہ مندر جاتی اور اپنی تو تلی زبان میں بھجن گاتی۔ اسکی باریک سی آواز میں بہت لوچ تھی۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی شکر داس کو اسے تعلیم دلوانے کا شوق ستایا اور اسنے شردہا کو گاؤں کے پسماندہ سے سرکاری سکول میں داخل کر دیا۔ شردہا پڑھائی کی شوقین تھی۔ اسنے میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی اور گاؤں کی سب سے تعلیم یافتہ انسان بن گئی۔ اب گاؤں

میں جب بھی کسی کو کوئی خط لکھوانا یا پڑھوانا ہوتا وہ شکر داس کے گھر کی جانب بھاگتا۔ شکر داس کا گھر مندر سے ملحق تھا وہاں رات دن مندر میں بننے والی گھنٹیوں اور ناقوس کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔

شردھا بھگوان پہ دل سے یقین رکھتی تھی۔ اسے جب بھی کوئی حاجت ہوتی وہ منہ اندھیرے اٹھ کر گھر کے ہی ایک کمرے میں رکھی کالی ماتا کی مورتی کے سامنے پاٹ کرتی ماتھا ٹیکتی پورے دل اور مکمل یقین کیساتھ دعائیں کرتی اور اس کی دعائیں ہمیشہ قبول ہو جایا کرتیں۔۔۔ یہ چیز شردھا کے ایمان اور بھی مضبوط کر دیتیں۔ جب وہ سترہ برس کی ہوئی تو اسکے لیے گاؤں کے ایک اچھے کھاتے پیتے گھر سے رشتہ آیا۔ شردھا جیسی خوبصورت لڑکی کے لیے تو گاؤں کے سبھی لڑکوں کا دل دھڑکتا تھا وہ جب جب چشمے پر پانی بھرنے آتی تو سارے شیر جوان کسی نہ کسی بہانے سے آس پاس چکراتے رہتے۔ مگر وہ بھی بلا کی مغرور تھی۔ کبھی کسی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی۔ بہر حال شکر داس نے اس کا رشتہ پکا کر دیا۔ روکے کی رسم ادا کر دی گئی اور گاؤں کی سب سے سندر ناری رام ناتھ کے نام ہو گئی۔ سبھی جوان دل مسوس کر رہ گئے تھے رام ناتھ اونچا لمبا جوان تھا۔ جس پر کتنی ہی ناریاں دل و جان سے فدا تھیں۔ مگر اسکا دل شردھا کی گہری سبز آنکھوں کا اسیر تھا۔ وہ اور اسکا باپ بت تراشتے اور شہر جا کر فروخت کر آتے تھے۔ آمدن اچھی خاصی تھی۔ رام ناتھ اکثر چھپ کر شردھا کو تحفے بھیجا کرتا۔ کبھی کانچ کی سرخ چوڑیاں تو کبھی سنہری مالا۔۔۔ کبھی

اسکے چاندی جیسے پیروں کے لیے پازیں۔۔ تو کبھی چمکیلی بندید۔۔ شردہا تحفے پا کر ایک سنجیدہ سا شکریہ ادا کرتی اور تحفے اپنے کمرے میں پڑے بوسیدہ سے لوہے کے ٹرنک میں ڈال دیتی۔ اسکا دل جانے کیوں رام ناتھ کے لیے کبھی کسی انجانی لے پر نہ دھڑکا تھا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا صلح جو اور سب سے خوش اخلاقی سے پیش آنے والا۔ شردہا اسکی قدر کرتی تھی مگر محبت نامی جذبے سے وہ ہنوز نابلد تھی۔

ایک روز وہ صبح صبح کے قریب چشمے پہ پانی لینے گئی تو بے اختیار اسکے قدم جم سے گئے۔ چٹان کنارے کوئی اوندھا پڑا تھا۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ صبح صادق کا وقت تھا۔ ابھی مکمل طور پر روشنی نہ پھیلی تھی۔

شردہا کوئی ڈرپوک لڑکی نہ تھی مگر ایک اجنبی کو یوں پڑے دیکھ کر اسکے دل میں بہت سے شبہات نے سر اٹھایا۔ جانے وہ کون تھا۔ کہیں کوئی ڈاکو ہی نہ ہو۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر جی کڑا کر کے آگے بڑھی۔ گھڑا زمین پر رکھا اور جھجھکتے ہوئے اجنبی کے قریب اکڑوں بیٹھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اسکے سر کے بال بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور جسم پر جیل کے قیدیوں کا سا لباس تھا۔ اسکی بائیں ٹانگ خون سے سرخ تھی۔۔ وہ زخمی معلوم ہوتا تھا۔ شردہا نے ہمت کر کے اسے چھوا۔ اسمیں جنبش بھی نہ ہوئی۔ شردہا نے گہری سانس بھری اور اپنے نازک نازک ہاتھوں سے اس اونچے پورے مرد کو بمشکل سیدھا کیا۔ بادی النظر میں وہ مردہ معلوم ہوتا تھا۔ اسکے داڑھی کے بال بھی بے تحاشہ

بڑھے ہوئے تھے۔ چہرے پر نقاہت تھی۔ کچھ زخم بھی تھے۔ شردہا نے اسکی ناک کے قریب ہاتھ نہچایا۔ اسکی سانسیں بہت مدھم تھیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ کچھ دیر اور یہاں پڑا رہتا تو سردی سے ہی مر جاتا۔ شردہا شقی القلب ہرگز نہ تھی۔ وہ اٹھ کر بھاگتی ہوئی اپنے گھر پہنچی۔ باپو ابھی ابھی اشان کر کے نکلا تھا اور مندر جانے کی تیاری میں تھا۔ اسے بدحواسی میں آتے دیکھا تو ٹھٹھک گیا۔ کیا ہوا بٹیا؟ اسنے اپنے ملائم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

باپو! وہ چٹان پر کوئی پڑا ہوا ہے۔۔ اسنے پھولی سانسوں کے درمیان بتایا۔

ہے بھگوان۔۔ کون پڑا ہے؟

پتہ نہیں باپو۔۔ گھائل ہے بیچارہ۔ کہیں مر ہی نہ جائے۔

اری کہیں کوئی ڈاکو نہ ہو۔

اگر ڈاکو بھی ہے تو کیا ہوا باپو۔ ہے تو انسان ہی ناں۔ چلو چل کر اسے ادھر لے آئیں۔ شردہا کے دل میں انسانی ہمدردی کے جذبات مکمل طور پر جاگ چکے تھے۔

نہ نہ بٹیا میں تو نہ جاؤں۔ پاٹ کا سمے ہو گیا ہے۔

باپو! وہ بھی تو اسی بھگوان کا بنایا ہوا انسان ہے ناں جس کی پاٹ کرنے جارہے ہو۔ چلو چل کر اسکی جان بچا لیں۔ شردہا نے نرم لہجے میں باپ کو قائل کرنا

چاہا۔ شکر داس فطرتی طور پر انسان دوست آدمی تھا سو اسکا دل بھی بیٹی کا ہم خیال ہو ہی گیا اور وہ اس کے ہمراہ چشمے تک آیا۔ جہاں وہ اجنبی اب تک بے ہوش پڑا تھا۔ اب ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ مگر لوگوں کی آمد و رفت شروع نہ ہوئی تھی۔ وہ دونوں اسے اٹھا کر اپنے گھر لے کر آئے اور اندرونی کمرے میں لٹا دیا۔



باپو یہ تو گھائل ہے بیچارہ۔ میں ایک کام کرتی ہوں دوڑ کر سریش کاکا کو بلا لاتی ہوں وہ اسکی مرہم پٹی کر دیں گے۔ شردھا ترحم آمیز نظروں سے بے سدھ پڑے اجنبی کی طرف دیکھتے ہوئے باپ کو مخاطب کیا۔

ارے کچھ عقل کی بات کر۔ گاؤں میں کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہم نے کسی اجنبی کو چشمے کے کنارے سے اٹھایا ہے۔

وہ کیوں باپو؟

اری دیکھتی نہیں اس نے جیل کے قیدیوں جیسا لباس پہنا ہے۔ یہ ضرور جیل سے بھاگا ہے۔ شکر داس نے بہت مدھم آواز میں کہا مبادا کوئی سن نہ لے۔

تو کیا اسے یونہی کر جانے دیں۔ شردھا تنک کر بولی۔

نہیں نہیں تو ایسا کر مرہم لا میں اسکا گھاؤ دیکھتا ہوں۔ شکر داس اجنبی کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ شردھا بھاگ کر مرہم اور ہٹی لے آئی۔ شکر داس نے اچھی

طرح زخم کا معائنہ کیا۔ گولی کا زخم تھا مگر گولی شاید محض گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اسنے اچھی طرح زخم صاف کر کے پٹی کر دی۔ اور ہاتھ دھونے کے لیے چھوٹے سے کچے آنگن میں لگے ہینڈ پمپ کی جانب بڑھ گیا۔ شردہا کمرے میں چپ چاپ بستر کے سرہانے کھڑی تھی۔ اسکی نظریں اجنبی کے چہرے پر تھیں۔ جس پر بے ترتیب داڑھی کے جھاڑ جھنکار تھے۔ بے حد نقاہت تھی۔ مگر اسکے باوجود اسکے نقوش دلکش معلوم ہوتے تھے۔ اسے تکتے تکتے جانے کیوں شردہا کا دل چاہا کہ وہ اپنی آنکھیں کھول دے۔۔۔ کتنی لمبی لمبی پلکیں تھیں اسکی بالکل لڑکیوں جیسی۔۔۔

شردہا۔۔۔ باپو کی پکار پر وہ بے طرح چونکی پھر تیزی سے کمرے سے باہر آئی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
جی۔

اب تو پوجا کا سہ نکل گیا۔ تو ایسا کر کچھ کھانے کو لے آ۔ میں ذرا کالی ماما کے چرن چھولوں۔ شکر داس نے بیٹی کو ہدایت کر کے اس چھوٹے سے کمرے کی جانب قدم بڑھائے جہاں وہ پوجا کیا کرتے تھے۔ شردہا نے آنگن میں ہی ایک جانب بنے کچے سے کچن میں بیٹھ کر چولہے میں لکڑیاں جلائیں اور چائے کا پانی چڑھایا۔ باپو اب بلند آواز میں گیتا کے شلوک پڑھ رہا تھا۔ شردہا بھی جھومنے لگی۔ جتنے میں ناشتہ تیار ہوا تب تک باپو پاٹ کر کے آگیا تھا۔ میں ناشتہ کمرے میں لاتی ہوں باپو۔

نہیں میں یہیں کھاٹ پہ بیٹھوں گا۔ وہ بان کی کھر در ی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ شردہا نے اسے ناشتہ پیش کیا اور خود مؤدبانہ انداز میں کھڑی رہی۔ باپو نے ناشتہ کر لیا تو وہ برتن سمیٹے کچن میں آئی اور بیٹھ کر خود ناشتہ کیا۔

باپو نے آج مندر جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا سو ناشتے کے بعد وہیں چار پائی پہ نیم دراز ہو گیا۔ شردہا نے ناشتے کے بعد برتن دھوئے اور چھوٹے سے کچے گھر کی صفائی کرنے لگی۔ اسی اثناء میں مندر سے ایک پجاری شکرداس کا پوچھنے چلا آیا۔ شردہا نے شکرداس کی طبیعت خرابی کا بہانہ بنا دیا۔ باپو دن چڑھے تک وہیں چار پائی پر سوتا رہا۔ شردہا نے گھر کی صفائی کر کے سبزی چولہے پر چڑھا دی۔ ساتھ ساتھ وہ کمرے میں بھی جھانک لیتی۔ اجنبی اب تک بے ہوش تھا۔ شردہا کو اب تشویش ہونے لگی تھی۔ وہ اسکے پاس چلی آئی اور کچھ سوچ کر کٹورے میں پانی لے کر اسے چہرے پر پانی کی بوچھاڑ کی۔ اجنبی کے پوٹوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔ شردہا نے ہاتھ روک کر اسکا شانہ ہلایا۔ وہ کراہا تھا۔

پانی۔۔۔ اس کے ہونٹوں کی موہوم سی جنبش نے شردہا کو مدعا سمجھا دیا۔ اسنے جلدی سے پانی اسکے لبوں سے لگایا۔ وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگا پھر دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ شردہا اس پہ جھکی ہوئی تھی اسنے دیکھا اجنبی کی آنکھیں بہت سیاہ تھیں۔۔۔ کالی رات جیسی۔۔۔ گہری۔۔۔ ان آنکھوں میں اک عجیب سی چمک تھی۔۔۔ مقناطیسیت تھی۔۔۔ شردہا کو لگا وہ کسی سحر میں مقید

ہو گئی ہے۔

مم۔۔ میں کہاں ہوں۔۔ وہ کراہتے ہوئے بولا پھر اٹھ بیٹھا۔ شردہا ہڑبڑا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

چننا متی کرو تم سرکشت ہو۔ اس نے اجنبی کو تسلی دلانا چاہی۔ اجنبی نے گردن موڑ کر جیسے اب کی بار بغور اسکی طرف دیکھا تھا۔

آپ کون؟ اسکا لہجہ بہت شائستہ تھا۔

میرا نام شردہا ہے۔ میں نے تمہیں چشمے کے پاس دیکھا تھا تم گھائل تھے سو میں اور باپو تمہیں اپنے گھر لے آئے۔ اسنے اسے تفصیل بتائی۔

تمہارا شکریہ۔۔ مگر یہ علاقہ کون سا ہے؟

سچیت گڑھ۔ شردہا نے جواب دیا۔

سچیت گڑھ۔۔ اجنبی منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اور شردہا نے اسکی سیاہ گھور آنکھوں میں انوکھی سی چمک دیکھی۔

بارڈر پار سیالکوٹ ہے ناں؟ اسنے مدھم آواز میں پوچھا۔

ہاں۔ ادھر بارڈر پار مسلے رہتے ہیں۔ شردہا نے ناک چڑھا کر بتایا۔ اجنبی نے گہری سانس بھری اور مسکرا دیا۔

تمہارا یہ گھاؤ کیسے آیا؟

یہ۔۔۔ شاید گولی لگی تھی۔۔۔ اصل میں مجھے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں۔ اسنے اپنی زخمی ٹانگ پہ ہاتھ پھیرا۔

تمہیں درد نہیں ہو رہا۔ اتنے آرام سے بیٹھے ہو۔

یہ چھوٹے موٹے زخم میری خوشی کی راہ میں حائل نہیں ہوتے۔ وہ پھر مسکرایا تھا۔

تم جیل سے بھاگے ہوناں

ہاں۔۔

ڈاکو ہو؟ شردہا کی سبز آنکھوں میں حیرت شوق جانے کیا کیا تھا۔۔۔ اجنبی نے تابعداری سے سر اثبات میں ہلادیا۔

یے بھگوان۔۔! شردہا نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

ڈرو مت۔۔ نہتا ہوں اور اپنے محسنوں کو کوئی نقصان پہنچانے پر موت کو ترجیح دوں گا۔

مگر۔۔ شردہا ہکلائی۔

ارے بھئی دیکھو کتنا زخمی ہوں کیا تم کچھ دن میری سیوا نہیں کرو گی پیاری لڑکی۔ مجھے کوئی لباس دے دو اور ہاں غسل خانے کا رستہ بھی دکھا دو میں اپنا حلیہ درست کر لوں گا۔

باپو۔۔۔۔ شردہا وہیں سے پکارتی آنگن کی طرف بھاگی۔ باپو ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔
ہے بھگوان اری کیا ہو گیا دیوی

باپو وہ جاگ گیا۔ وہ ڈاکو۔۔

ڈاکو۔۔ تو کیا وہ سچ مچ ڈاکو ہے۔ شکر داس بھی چارپائی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
ہاں باپو اسنے خود بتایا مجھے۔ شردہا بھی سخت گھبرائی ہوئی تھی۔

ہے بھگوان۔۔ ہم پر اپنی کرپا کر۔ شکر داس کی جان نکلنے لگی۔ تبھی کمرے کے
دروازے پر اجنبی نمودار ہوا۔ وہ زخمی ٹانگ کے ساتھ بمشکل چل رہا تھا۔
دیکھیں ڈریں مت۔ میں بس چند دن ادھر پناہ چاہتا ہوں۔ جب میرا زخم بھر
جائے گا میں چلا جاؤں گا۔ مجھ پر بھروسہ کریں۔ وہ نرم لہجے میں بولتا ہوا
شکر داس کے قریب آیا اور اسکے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسکا لہجہ اتنا دوستانہ تھا
شکر داس کا گھبراہٹ کچھ کم ہوئی۔

کسی کو بتائیے گا مت کہ میں آپ کے گھر میں پناہ گزین ہوں۔ لوگ آپکا جینا
حرام کر دیں گے۔

مم۔۔ مگر۔۔

دیکھیئے۔ محض چند دن۔۔ میں چلنے پھرنے کے قابل ہوتے ہی ادھر سے چلا
جاؤں گا۔ اسنے شکر داس کی بات کاٹ دی۔ شردہا شکر داس کو ٹھوکے دے رہی

تھی۔

ٹھیک ہے مگر تم ہمارا ایمان نہیں کرو گے۔

ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ دونوں میرے محسن ہیں۔ اجنبی مسکرایا تھا۔ شکر داس فطرتاً ڈرپوک انسان تھا۔ وہ اجنبی کے ڈاکو ہونے کا سن کر ہی بہت مرعوب ہو چکا تھا سو اسکی کسی بات سے اختلاف کرنے کی تو اسمیں ہمت ہی نہ تھی۔ اجنبی نے شردہا سے لباس مانگا شردہا جھپٹ کر شکر داس کا ایک دھلا ہوا سفید لباس لے آئی۔ اجنبی غسل خانے میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ غسل خانے سے برآمد ہوا تو داڑھی محض ہلکی شیو کی صورت میں باقی رہ چکی تھی۔ اور بال بھی کٹ چکے تھے۔ شردہا آنگن میں ہی کھڑی تھی اسے دیکھ کر بے اختیار ٹھٹھک گئی۔ باپو کے سفید لباس جو کہ ہندوانہ شلوار قمیض پر مشتمل تھا میں وہ اجنبی اتنا پرکشش نظر آرہا تھا کہ وہ اس پر سے نظریں نہ ہٹا پائی۔ اسکے چہرے کے نقوش از حد دلآویز تھے۔ لمبا قد اور کسرتی جسم اسکو شاندار بناتا تھا۔ وہ تو جیسے اپالو کا مجسمہ تھا۔ شردہا اسے تکتے گئی۔

کچھ کھانے جو ملے گا؟ اجنبی نے اسے مخاطب کیا تو وہ اپنی محویت سے چونکی۔ ہاں۔۔ کیا کھاؤ گے اسنے جلدی سے پوچھا۔

جو بھی ہے دے دو بہت بھوک لگی ہے۔ وہ بے تکلفی سے کہتا چارپائی پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ شردہا کو اسکی بے تکلفی پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ باورچی خانے میں

بیٹھ کر لکڑیاں سلگانے لگی۔ گاہے بگاہے وہ اجنبی کی جانب بھی دیکھ لیتی جو سر اٹھائے برگد کے گنجان درخت کہ شاخوں میں جانے کیا کھوج رہا تھا۔ وہ اتنا پرکشش تھا کہ شردہا نے تو اپنی زندگی میں ایسا مرد نہ دیکھا تھا۔ اسکی نشست و برخاست میں ایک تمکنت تھی۔۔ جانے کیوں شردہا کو وہ ہندو دھرم کا ماننے والا نہ لگا تھا۔



اسکے چہرے پر اک عجیب سی چمک تھی جو شردہا کا دھیان بار بار بھٹکتی تھی۔ جتنی دیر وہ ناشتہ تیار کرتی رہی اس اجنبی نے آنگن میں موجود ہر چیز کو گھورا تھا سوائے شردہا کے۔ وہ ناشتہ تیار کر کے چارپائی کے قریب لائی اور کھنکار کر اسے متوجہ کیا۔

شکریہ۔ اسنے چونک کر کہا۔ شردہا نے ناشتہ اسکے سامنے رکھا۔ وہ سر جھکا کر لقمے توڑنے لگا۔ کھانا شروع کرنے سے قبل اس نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا تھا جو شردہا سن نہ سکی تھی۔ شردہا وہیں کھڑی رہی۔

کیا ہوا تم کیوں کھڑی ہو؟ اس نے پہلا لقمہ توڑتے ہوئے سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔

تم کھاؤ۔ میں تب تک یہیں کھڑی ہوں۔ شردہا نے جواب دیا۔
لیکن کیوں؟

جب مرد کھانا کھاتے ہیں تو عورت اسکے آرام کے کھیال سے اسکے پاس کھڑی رہتی ہے۔ تاکہ جب اسے کسی چیز کی جرورت پڑے۔۔

مگر مجھے کسی چیز کی بھی ضرورت پڑی تو میں خود لے لوں گا۔ تم بیٹھ جاؤ یا اپنا کوئی کام نمٹا لو۔ اسنے نرم لہجے میں کہا تھا۔

یہ تو گلط بات ہے۔ شردہا کو تامل تھا۔

یعنی جب تک میں کھاؤں گا تم میرے سر پر سوار رہو گی؟

سر پر کب سوار ہوں میں تو تمہارے آرام کا کھیال کر رہی ہوں۔

کیا یار۔۔ اجنبی نے لقمہ واپس رکھ دیا۔

بیٹھ جاؤ۔ ایسے کھڑی رہو گی تو مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا۔

نہیں میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔

یار پلیز جاؤ۔ اجنبی نے اکتا کر ہاتھ ہلایا۔ شردہا کچھ حیران سی ہوتی پلٹ کر

کمرے میں چلی گئی۔ باپو چپ چاپ بیٹھا تھا۔

باپو کھانا کھاؤ گے؟ اس نے پوچھا۔

بھی من نہیں بٹیا۔ تو بتا وہ اجنبی کدھر ہے؟

ناشتہ کر رہا ہے باپو۔ عجیب ہی سا ہے وہ کہتا ہے مجھے کسی چیز کی جرورت پڑی

تو کھود لے لوں گا۔ شردہا موڑھا گھیسٹ کر بیٹھ گئی۔

بھگوان جانے کون ہے۔ مجھے تو بہت چتنا ہو رہی ہے۔ اب جب تک یہ ادھر رہے گا میں مندر نہ جاؤں گا۔

کیوں باپو مندر کیوں نہ جاؤ گے بھلا؟

تو کیا تجھے تنہا چھوڑ جاؤں۔

میں تنہا کب ہوں باپو۔ اور میں ڈرتی رتی کسی سے بھی نہیں۔ تو میری چنتا مت کر۔ شردہا نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

اس اجنبی کے ہوتے میں تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ جانے اسکا چلتر کیسا ہے۔ اس پر وشواس نہیں کر سکتا میں۔ شکر داس کی بات میں وزن تھا شردہا

نے قائل ہو جانے والے انداز میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد وہ باپو کے لیے چپاتیاں بنانے کمرے سے باہر نکلی تو اجنبی کو چارپائی پر چت لیٹے پایا۔ وہ دونوں بازوؤں کا تکیہ بنائے سیدھا آسمان کی وسعتوں کو تک رہا تھا۔ شردہا اسے گھورتی ہوئی باورچی خانے میں چلی آئی۔ ناشتے کے برتن دھلے ہوئے تھے۔ شردہا نے ایکبار پھر گردن موڑ کر اجنبی کی جانب دیکھا جو گرد و پیش سے بالکل بے نیاز نظر آتا تھا۔ وہ بیٹھ کر لکڑیاں سلگانے لگی۔ چپاتیاں بنانے کے دوران بھی اسکا دھیان اسی کی طرف لگا رہا۔ مگر وہ ایکبار بھی اسکی جانب متوجہ نہ ہوا تھا۔ وہ کٹوری میں سالن نکال کر باپو کو کھانا دینے چلی گئی۔ باپو نے

کھانا کھالیا تو برتن لیے واپس پلٹ آئی۔ وہ اب تک اسی پوزیشن میں لیٹا ہوا تھا۔ شردہا نے باورچی خانے میں بیٹھ کر ہی کھانا کھایا۔ پھر برتن دھو کر رکھے اور باورچی خانے کی چیزیں سمیٹ کر ہینڈ پمپ کی طرف بڑھی۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ برگد کے درخت سے بندھے جھولے کی طرف بڑھی اور اس پر بیٹھ گئی۔

تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے چند لمحوں بعد اجنبی کو مخاطب کیا۔

ہاں۔۔ کچھ کہا تم نے؟ اس نے گردن گھما کر اسکی جانب دیکھا۔

تمہارا نام کیا ہے؟ شردہا نے اپنا سوال دہرایا۔

میرا نام۔۔۔ جو جی چاہے پکار لو۔۔ نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے مبہم سا جواب دیا۔

مگر کچھ نام تو رکھا ہوگا ناں تمہارے ماما پتا نے تمہارا۔

چھوڑو اس تذکرے کو۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارا باپ مجھ سے خوفزدہ کیوں ہے؟

تو کیا انکو تم پہ وشواس کر لینا چاہیئے آنکھیں بند کر کے۔ تم اجنبی ہو اور ڈاکو بھی ہو۔ شردہا چمک کر بولی۔ وہ بے اختیار مسکرایا۔ یوں جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی نا سمجھی پر مسکراتا ہے۔ شردہا دھیرے دھیرے جھولا جھول رہی تھی۔ کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ درخت کی شاخوں میں چھپے پرندوں کی چھبھاہٹ

بڑی بھلی لگتی تھی۔ یکایک لکڑی کے بوسیدہ کواڑ پر دستک ہونے لگی۔ وہ دونوں چونکے اور پھر شردہا اٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف گئی۔

کون ہے؟ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔ شکر داس بھی پاؤں گھسیٹتا ہوا آنگن میں نمودار ہو گیا۔

رام ناتھ۔ آنے والے نے بلند آواز میں کہا تھا۔ شردہا نے پلٹ کر باپ کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہروں پر گھبراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ انکے کچھ کہنے سے قبل ہی اجنبی چارپائی سے اٹھا اور اپنی زخمی ٹانگ پر بمشکل دباؤ دیتا ہوا اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ شکر داس اور شردہا نے سکھ کی سانس بھری۔ شردہا نے ساڑھی کا آنچل سر پر ڈالا اور دروازہ کھول دیا۔ رام ناتھ اندر داخل ہوا۔ وہ ایک مناسب قد و قامت اور اچھے تن و توش کا ایک بانکا سچلا جوان تھا۔ زیادہ تر سفید قمیض اور دھوتی میں ملبوس نظر آتا۔ بال تیل لگا کر پیچھے کی طرف جمائے رکھتا ماتھے پر تلک ہر وقت ثبت ہوتی۔

پرنام پنڈت جی! اسنے اندر داخل ہوتے ہی ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تھا۔ وہ شکر داس کو پنڈت جی ہی کہتا تھا۔

پرنام! شردہا بھی منمنائی۔ رام ناتھ نے آگے بڑھ کر شکر داس کے پاؤں چھوئے۔

کھوش رہو۔ شکر داس نے اسکے سر پہ ہاتھ رکھا۔

آئیے جمائی بابو بیراھیے۔ اسنے چارپائی کی جانب اشارہ کیا تھا۔ رام ناتھ براجمان ہو گیا۔ شکر داس بھی بیٹھ گیا۔ شردها وہیں کھڑی تھی۔ مجھے باپو نے بھیجا ہے پنڈت جی۔ چیچی کے سسرال والے شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔ شبھ مہورت نکالنے کے لیے آپکو آنا ہوگا۔ رام ناتھ نے مدعا بیان کیا۔

ہاں ہاں میں جرور آجاؤنگا۔ کب آنا ہے شیتل بٹیا کے سسرال والوں نے؟ جب آپ کہیں گے تب انکو پیغام بھیج دیں گے۔ وہ چلے آئیں گے۔ رام ناتھ ادب سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شردها باورچی خانے میں گئی اور سٹیل کے گلاس میں پانی لے آئی۔ رام ناتھ شربت یا چائے سے قبل سادہ پانی پینے کا عادی تھا۔ ٹھیک ہے۔ میں کل آجاؤنگا صبح کی پوجا کے بعد۔ شکر داس نے جواب دیا۔ شردها پانی لیے چلی آئی۔

جل لیجیے۔ اس نے گلاس رام ناتھ کی جانب بڑھایا۔ اسنے شکر پے کیساتھ گلاس تھام لیا۔

ٹھیک ہے میں باپو کو بتاؤنگا۔ اب اجازت دیجیے۔ وہ پانی پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ارے نہیں نہیں جمائی بابو! بیٹھیے چائے ناشتہ کر کے جائیے گا۔ شکر داس جلدی سے بولا۔

نہیں پنڈت جی۔ اب چلوں گا۔ رام ناتھ ہچکچایا۔

بیٹھ جائیے۔ شردہا جا چائے کا انتظام کر۔ شکر داس نے رام ناتھ کو بٹھا لیا تھا۔
شردہا باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ شکر داس اور رام ناتھ باتیں کرنے لگے۔



میں نے رام کو کہہ تو دیا ہے کہ کل صبح آجاؤنگا مگر اب سوچتا ہوں کہ کیسے جاسکتا ہوں تجھے اکیلا چھوڑ کر۔ رام ناتھ کے جانے کے بعد شکر داس کو نئی فکر نے آیا۔

آپ فکر مت کریں۔ میں آپکی بیٹی کی مکمل حفاظت کرونگا۔ وہ اچانک ہی آنگن میں نمودار ہوا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹی اسکی طرف متوجہ ہو گئے۔
میں ایک اجنبی پہ کیسے وشواس کر سکتا ہوں۔ شکر داس نے تنک کر کہا۔

اگر میں آپ کو نقصان پہنچانا چاہتا تو میرے لیے یہ کچھ مشکل نہیں۔ میرے بازوؤں میں ابھی اتنا دم ہے کہ آپ جیسے دس بارہ آدمیوں کو آرام سے پچھاڑ لوں۔ وہ مضبوط لہجے میں بول رہا تھا۔ شکر داس اور شردہا گم صم سے اسکو دیکھ رہے تھے۔ اسکی بات سچ تھی۔ شکر داس جیسا منحنی انسان تو واقعی اس اجنبی کے ایک گھونسے کی مار تھا۔

آپ مجھ پر یقین کریں۔ آپ لوگ میرے محسن ہیں آپ کی حفاظت مجھ پہ فرض ہے۔ اسنے رسان سے کہا تھا۔ وہ دونوں کسی سحر زدہ کی طرح اسے تک

رہے تھے۔ اسکی شخصیت بہت چھا جانے والی تھی۔

میری بیٹی کی سسرال کا معاملہ ہے میں منع بھی نہیں کر سکتا۔ شکر داس بڑبڑایا۔

آپ ضرور جانیئے۔ میرا وعدہ ہے کہ میں آپکی بیٹی اور آپ کے گھر کی مکمل حفاظت کرونگا۔ وہ شکر داس کے قریب آیا اور انکے شانے کے ہاتھ پر رکھا۔

تم جا کر آرام کرو۔ گھاؤ گہرا ہے تمہارا۔ شکر داس کچھ نرم پڑا اور اٹھ کر پوجا والے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اجنبی وہیں کھڑا تھا۔

اپنے باپ کو سمجھاؤ۔ میں برا آدمی نہیں ہوں۔ اسنے نرم لہجے میں شردہا کو مخاطب کیا۔

تم ڈاکو ہو۔ ڈاکو پر کوئی دشواری نہیں کر سکتا۔ شردہا اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں ڈاکو نہیں ہوں۔ لیکن میں کون ہوں یہ سن کر تم دونوں مجھ سے نفرت کرنے لگو گے۔ اسکا لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ شردہا نے اسکی طرف دیکھا۔ وہ اس سے قد میں کافی لمبا تھا۔

کیا مطلب کون ہو تم؟

چھوڑو۔ تم بس یہ سمجھ لو کہ میں ایک مسافر ہوں اور راستہ بھٹک گیا ہوں۔ مجھے منزل کا نشان چاہیے۔ جب مل گیا میں چلا جاؤنگا۔ وہ خلاء میں گھورتے ہوئے بولا۔ وہ شردہا کی جانب بہت کم دیکھتا تھا۔

تم عجیب باتیں کرتے ہو۔

لڑکی میں واقعی مسافر ہوں راستہ بھٹک گیا ہوں۔ یہ گھاؤ بھر جائے تو چلا جاؤنگا۔ اسنے سر جھٹک کر اسکی طرف دیکھا۔ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ اسکی سیاہ آنکھوں نے شردہا کی سبز آنکھوں میں جھانکا تھا۔ شردہا کو لگا جیسے اسکے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اجنبی نے نظروں کا رخ موڑ لیا تھا۔

تمہیں چائے بنانا آتی ہے؟ اجنبی نے پوچھا۔

ہاں۔۔ شردہا چونک کر بولی۔
ایک کپ بنا دو گی اگر تمہیں گراں نہ گزرے۔ وہ بہت شائستہ لب و لہجے میں بات کرتا تھا۔ شردہا نے اسکی طرف دیکھا۔ وہ حیرت انگیز تھا۔ کسی بھی کام کا حکم نہیں دیتا تھا ادب سے گزارش کرتا تھا۔

بنا دیتی ہوں۔ تم جا کر آرام کرو۔ وہ نرم لہجے کہتی باورچی خانے کی جانب چلی گئی۔ وہ لنگڑاتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ شردہا نے جتنے میں چائے تیار کی باپو پوجا کر کے واپس آگیا تھا۔

تو نے کب سے بے وقت چائے پینا شروع کر دی؟ باپو نے اس سے پوچھا۔

اس کے لیے بنا رہی ہوں۔ شردہا نے جواب دیا۔

یہ تو مفت میں ہمارے گلے پڑ گیا ہے۔ شکر داس نے برا سا منہ بنایا۔
گھائل ہے بیچارہ۔ اور مسافر بھی ہے۔ بتارہا تھا کہ راستہ بھٹک گیا ہے۔
ڈاکو ہے۔۔

نہیں باپو۔۔ ڈاکو نہیں ہے وہ۔ بتارہا تھا کہ مسافر ہے راہ بھٹک گیا ہے۔
جھوٹا ہے۔

میں جھوٹ نہیں کہتا تم مجھ پہ یقین نہیں کرتے تو میں چلا جاتا ہوں۔ وہ یکدم
ہی آگیا تھا۔ وہ دونوں اسکی طرف متوجہ ہو گئے۔

تم نے اپنے بارے میں ہمیں کچھ بھی سچ نہیں بتایا تو میں کاہے وشواس کر لوں
تم پہ۔ شکر داس نے تنک کر کہا۔

میں کون ہوں یہ میں تمہیں بتا دوں گا اگر تم مجھ پہ یقین کرو۔

انسان کی جبان کا کیا بھروسہ۔ شکر داس نے منہ بنایا۔ اسکی بات ابھی اسکی زبان
میں ہی تھی کہ اجنبی نے اسکی گردن دبوچ لی۔ شکر داس ہکا بکا رہ گیا تھا۔
شردہا نے چیخنے کے لیے منہ ہی کھولا تھا کہ اسنے دوسرے ہاتھ سے شردہا کا
منہ دبوچ لیا۔ اب حالت یہ تھی کہ اجنبی کے دائیں بازو کے چنگل میں
شکر داس اور بائیں بازو کے شکنجے میں شردہا تھی۔ اور وہ دونوں بالکل بے بس
تھے۔ اجنبی بلا کا طاقتور تھا۔

میں تم دونوں کو اسی طرح ختم کر سکتا ہوں۔ اسنے تیز قسم کی سرگوشی کی۔ ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ یکدم اجنبی نے ان دونوں کو چھوڑ دیا اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اب آپ فیصلہ کر لیں کہ کیا اب بھی میں ناقابل اعتبار ہوں۔ وہ کہہ کر رکا نہیں تھا بلکہ کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر تک گم صم کھڑے رہے تھے۔

وہ برا آدمی نہیں ہے باپو۔ شردہا نے سناٹا توڑا۔

ہممم۔۔ شکرداس نے ہنکارا بھرا۔ اسکے چہرے پر شرمندگی تھی۔

میں اسے چائے دے کر آتی ہوں۔ وہ کپ اٹھا کر کمرے میں چلی گئی۔ اندر وہ بستر کنارے بیٹھا ہوا تھا۔

چائے پی لو۔ اسنے کپ اسکی طرف بڑھایا۔ اجنبی نے سر اٹھایا۔

مجھ پر تب تک اس گھر کا پانی بھی حرام ہے جب تک تم اور تمہارا باپ مجھ پہ اعتبار نہ کرو گے۔ اسنے قطیعت سے کہا۔

ہمیں تم پر وشواس ہے۔ شکرداس کہتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اجنبی نے گہری سانس بھری۔

شکریہ۔ اس نے شردہا کے ہاتھ سے کپ تھام لیا۔ میں آپ کا بھروسہ کبھی

نہیں توڑونگا۔

میں مندر تک جا رہا ہوں شردہا کو اڑ بند کر لے۔ شکر داس نے سر ہلا کر شردہا سے کہا اور کر واپسی کے لیے پلٹا۔

اس سے مندر کیوں جا رہے ہو باپو؟ شردہا نے عقب سے پوچھا۔

کل دیوی کی پوجا کا انتظام دیکھنا ہے۔ اس نے جواب دیا اور دروازہ پار کر گیا۔ شردہا اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ کو اڑ بند کر کے وہ واپس پلٹی تو اجنبی کو آنگن میں آتے دیکھا۔ اب دن ڈھل رہا تھا۔ مغربی افق پر سرخی پھیلنے لگی تھی۔ اجنبی چارپائی پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ شردہا کچے آنگن کے ایک جانب بنی کچی سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور سیڑھیاں طے کر کے چھت پر آئی۔ اس نے مرچیں سکھانے کو رکھی تھیں انہیں سمیٹ کر ٹوکری میں ڈالا اور نیچے چلی آئی۔ ٹوکری باورچی خانے میں رکھ کر اس نے پانی کا گھڑا چیک کیا۔ اسمیں پانی کم تھا۔

میں جرا پانی بھر کر آتی ہوں تم گھر کا کھیاں رکھنا۔ اس نے اجنبی کو بتایا۔

لاؤ میں لا دوں۔

تم۔۔ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ گاؤں والوں نے دیکھ لیا ناں تو جینا حرام ہو جائے گا ہمارا۔ وہ تنک کر بولی۔

تو تم گھر اکیلا چھوڑ کر جاؤ گی تو گاؤں والے حیران نہ ہونگے؟
اکیلا کیوں تم ہوناں۔

لیکن گاؤں والوں کو تو نہیں پتہ کہ میں ہوں تمہارے گھر۔ اسنے دودو جواب
دیا۔ شردہا ایک لحظہ کو چپ کر گئی۔ وہ بلا کا ذہین تھا۔

کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ اسنے سر ہلایا۔ پھر گھڑے کو ڈھک کر پلٹ آئی۔

دوپہر میں جو آیا تھا وہ تمہارا کون ہے؟

میرا ہونے والا پتی ہے۔ شردہا نے جواب دیا۔

بہت ہیڈسم ہے۔ اسنے تعریفی انداز میں کہا۔ پھر جلدی سے بولا۔ میرا مطلب
ہے بہت سندر تھا۔

جانتی ہوں اتنی انگریجی آتی ہے مجھے۔ وہ سر ہلا کر بولی۔

اچھا۔۔ اجنبی نے حیرت کا اظہار کیا۔

ہاں۔ میٹرک کیا ہے میں نے۔

بہت اچھی بات ہے۔ آگے کیوں نہیں پڑھا؟

یہاں کالج نہیں ہے۔ شہر جانا پڑتا اور باپو مجھے اکیلے نہیں بھیج سکتا۔

ہم۔۔ اجنبی نے سر ہلایا۔ چائے بہت مزے کی ہے۔

میں کھانا بھی بہت اچھا بناتی ہوں۔ وہ خوش ہو کر بولی۔

لیکن تم نے آج مجھے تو کھانے کا پوچھا ہی نہیں۔

تم نے ناشتہ جو دن چڑھے کیا تھا۔

تو اب کھلا دو کچھ اب تو دن بھی ڈھل گیا۔

ابھی پکانے لگی ہوں۔ کچھ دیر انتظار کرو۔ وہ کہتی ہوں باورچی خانے کی طرف

بڑھی اور پیڑھی پر بیٹھ کر ہانڈی میں جھانکا۔ سالن کم تھا۔ اس نے چاول

پکانے کا ارادہ کیا اور چاول پر ات میں لے کر چننے لگی۔ اب اندھیرا پھیلنے لگا

تھا۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Articles | Poetry | Interviews

تمہارے گھر میں بجلی ہے؟ اجنبی نے پوچھا۔

ہاں ہے۔ شردہا نے پر ات وہیں رکھی اور اٹھ کر آنگن میں لگا زرد روشنی والا

بلب روشن کر دیا۔ اور پھر سے پیڑھی پر جا بیٹھی۔

تم اندر جا کر بیٹھو سردی سے گھاؤ میں درد ہوگا۔

اتنی سردی کب ہے۔

تمہیں سردی نہیں لگ رہی؟

نہیں۔

تم عجیب ہو۔ وہ سر ہلا کر بولی۔ اجنبی ہولے سے ہنسا۔

تمہارا منگیتر کافی شرمیلا سا ہے۔

تم نے کیسے دیکھ لیا اسکو۔

دروازے کی جھری سے۔ وہ صاف گوئی سے بولا۔ شردہا مسکرا پڑی۔ مسکراتے ہوئے اسکے دونوں گالوں میں بہت گہرے گڑھے پڑتے تھے۔

سنو۔۔۔ اجنبی نے چند لمحوں بعد اسے پکارا۔

کہو۔ وہ چاول چننے میں مگن تھی۔

ایک بار پھر مسکرانا۔۔۔ اسکی فرمائش بہت انوکھی تھی۔ شردہا نے سر اٹھا کر اسکی جانب دیکھا۔

کیوں؟

تمہاری مسکراہٹ مجھے کسی کی یاد دلاتی ہے۔ وہ کھو سا گیا تھا۔

کس کی؟ شردہا نے پوچھا۔

چھوڑو۔۔۔ تم بتاؤ کسی کام میں مدد کروں تمہاری؟ وہ سر جھٹک کر بولا

نہیں۔ بھلا رسوائی کے کام بھی کہیں مرد کرتے ہیں۔

کیوں مرد کی شان گھٹتی ہے کیا؟

عورت کے ہوتے مرد گھر کے کام کرے رام رام۔۔ یہ تو مہا پاپ ہے۔ شردہا نے اپنے کان چھوئے۔ اجنبی مسکرایا۔

مرد کی شان گھر کے کاموں سے گھٹی نہیں ہے۔ عورت اتنا کام کر کے تھک جاتی ہے تو کیا ہو گیا اگر مرد اسکا تھوڑا سا ہاتھ بٹا دے۔ وہ نرم لہجے میں بول رہا تھا۔ شردہا نے سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔ اسکی باتیں اسے حیرت میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اس نے ہمیشہ یہی سنا تھا کہ عورت مرد کی باندی ہے۔ عورت کو مرد سے کمتر درجہ ہی ملتے دیکھا تھا۔

تم ہندو ہو کر ایسا سوچتے ہو۔۔ وہ حیران ہوئی۔

تم کو کس نے کہا میں ہندو ہوں۔ وہ مسکرایا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

نہیں ہو کیا؟ شردہا نے پوری آنکھیں کھول کر اسکی طرف دیکھا۔ اجنبی نے دھیمسا سا تبسم ہونٹوں میں دبا کر نفی میں سر ہلایا۔

کر سٹن (کر سچن) ہو؟ وہ دیہاتی انداز میں کر سچن کو کر سٹن بولی تھی۔

نہیں۔ اجنبی نے نفی میں سر ہلایا۔

بدھا کو مانتے ہو؟

بالکل نہیں۔۔

سکھ ہو؟ وہ جیسے کسوٹی کھیل رہی تھی۔

نہیں۔

پھر۔۔

سوچ لو اگر کوئی مذہب رہ گیا ہو۔۔

اور کوئی دھرم۔۔۔ شردہا سوچ میں پڑ گئی۔ یکدم ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ایک مذہب واقعی رہ گیا تھا۔ رہ گیا تھا۔ شردہا نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ مذہب نہیں تھا۔ ایک خوف تھا۔ ایک بہت بڑا خطرہ تھا اسکے مذہب کے لوگوں کے لیے۔۔ بارڈر پار والوں کا مذہب۔۔ کشمیر کے ہزاروں لوگوں کا مذہب۔۔ وہ مذہب کہ جس کے ماننے والے ایک پروردگار کے نام پر صدیوں سے سر کٹا رہے تھے۔۔ وہ آسمانی مذہب کہ جن کے ماننے والوں کا واحد و یکتا رب ان دیکھا تھا۔ اور اسکے ماننے والے اس ان دیکھے رب پر اتنا یقین رکھتے تھے کہ اسکے نام پر کٹ مرتے تھے مگر سر نہیں جھکاتے تھے۔ وہ مذہب کہ جس کے ماننے والے ستر سالوں سے کشمیر میں بھارتی فوج کے مظالم برداشت کر رہے تھے مگر ان کے پایہء استقلال میں لغزش نہ آئی تھی۔۔ وہ مذہب۔۔ جو ساری دنیا کے مذاہب کے ماننے والوں کے لیے خطرے کی گھنٹی تھا۔ وہ دین کہ جس کے نام پر اس ہندوستان کا ایک حصہ پاکستان بن گیا تھا۔ وہ مذہب کہ جو اللہ تعالیٰ کا مذہب ہے۔۔ وہ جو محمد مصطفیٰؐ کا مذہب ہے۔۔ وہ مذہب جو اسلام ہے۔۔ وہ مذہب جس کے ماننے والے

مسلمان ہیں۔۔۔

شردہا نے تھوک نکل کر اجنبی کو گھورا۔

مسلمے ہو؟ اسکی آواز تیز سرگوشی جیسی تھی۔

الحمد للہ مسلمان ہوں۔ اجنبی نے سرشاری سے سر ہلایا۔ شردہا کے ہاتھ سے پرآت چھوٹ گئی۔ اسکے ارد گرد چاول بکھر گئے تھے۔

تم نے بتایا کیوں نہیں۔

تم نے پوچھا کب۔۔

تم مسلمے۔۔۔ وہ شاکڈ تھی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

الحمد للہ پیدائشی مسلمان ہوں۔۔ نام ہے ولید حسن۔ اس نے بلاآخر اپنا تعارف کروادیا تھا۔ شردہا دھک سے رہ گئی۔



ایدھی ہوم میں صبح صبح کے وقت سبھی عورتیں نماز کے بعد ناشتے کی تیاری میں مشغول تھیں۔ وہ سب آپس میں گپ شپ بھی کر رہی تھیں سوائے سلمیٰ کے جو ایک گوشے میں بالکل چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اسکی نظریں خلاء میں جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ وہ کب سے اسی ایک پوزیشن میں بیٹھی تھی کسی نے بھی اسکو مخاطب نہ کیا تھا۔ یہ سب عورتیں اب اسکی الگ تھلگ گم

صم رہنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ انہوں نے اسے اسکے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ چوکیدار بھاگتا ہوا اندر آیا۔ اس نے بازوؤں میں ایک ڈیڑھ سالہ بچہ اٹھا رکھا تھا جو مسلسل روئے چلا جا رہا تھا۔ وہ سبھی اسکی طرف متوجہ ہو گئے۔ میڈم قدسیہ بھی اپنے کمرے سے نکل آئیں۔

کیا ہوا چوکیدار؟ انہوں نے چوکیدار سے پوچھا۔

میڈم یہ بچہ کافی دیر سے ادھر ادھر گھوم رہا تھا اور روتا جا رہا تھا۔ مجھے لگتا ہے یہ اپنے گھر والوں سے بچھڑ گیا ہے۔ چوکیدار نے مدعا بیان کیا۔ بچہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا۔ سب عورتیں اپنے کام چھوڑ کر چوکیدار کے گرد جمع ہونے لگیں۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

آپ نے اچھا کیا جو اسکو ادھر لے آئے۔ اسے مجھے دیجیے۔ میں پولیس کو اطلاع کرتی ہوں۔ آپ بھی باہر جا کر ادھر گرد سے پوچھ گچھ کیجیے۔ میڈم قدسیہ نے بچہ ان سے لے لیا۔ وہ اب بھی مسلسل رو رہا تھا۔ چوکیدار مؤدبانہ انداز میں سر ہلا کر واپس چلا گیا۔ میڈم قدسیہ بچے کو چپ کروانے کی کوشش کرنے لگیں مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔ یکے بعد دیگرے مختلف عورتوں نے اسے چپ کروانے کی کوشش کی مگر ناکام رہیں۔

ادھر مجھے دیں۔ ایک نرم سی آواز پر وہ چونکیں۔ سلمیٰ نرم سے تاثرات لیے بچے کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ زاہدہ باجی نے کچھ ہچکچاتے ہوئے بچہ اسے

تھا دیا۔ سلمیٰ نے اسے ممتا بھرے انداز میں گود میں لیا تھا۔

جی کیا ہوا ہے بیٹی کو۔ کیوں رو رہے ہو؟ وہ اسے جھلاتے ہوئے بہلانے لگی۔
بچہ رونا چھوڑ کر اسے گھورنے لگا تھا۔

کیا ہوا۔ بیٹی کو کس نے مارا ہے۔ کس نے مارا میرے بیٹی کو؟ وہ اسے اٹھائے ہوئے ہوئے ہلے ہلے رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ اس سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ کمرے میں موجود سب حاضرین حیرت زدہ نظروں سے اسکی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ بے حد مگن نظر آرہی تھی۔ اور بچہ بھی بڑے غور سے اسکی باتیں سننے لگا تھا۔

گزشتہ چھ سالوں میں پہلی بار ان سب نے سلمیٰ کو نارمل لوگوں کی طرح ہی ہیو کرتے دیکھا تھا۔ وہ بچے کیساتھ کچھ یوں مگن ہوئی جیسے وہ اسکی اپنی ہی اولاد ہو۔ اور بچہ بھی جلد ہی اس کے ساتھ کافی مانوس ہو گیا تھا۔



شردہا نے بہت غور سے ولید کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ تھی۔

کیا ہوا بھئی کیا میرا مسلمان ہونا تمہارے لیے کسی صدمے کے برابر ہے؟ اسنے ہولے سے ہنس کر پوچھا۔

تم جانتے ہو کہ اگر یہ بات باپو کو پتہ چل گئی تو وہ تمہیں ایک منٹ یہاں

نہیں رہنے دے گا۔ شردہا نے اسے وارننگ دی۔
 جانتا ہوں۔ لیکن انہیں کیسے پتہ چلے گا۔ یہ بات تو میں نے صرف تمہیں بتائی
 ہے۔

تو تمہیں کیا لگتا ہے میں انکو کو نہ بتاؤنگی۔ شردہا نے تنک کر کہا۔
 تو کیا بتا دوگی؟

بتا بھی سکتی ہوں۔ مجھے ایک مسئلے سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ وہ بے مروتی
 سے بولی اور چاول زمین سے چن کر پرآت میں ڈالنے لگی۔ ساڑھی کا بالشت
 بھر بلاؤز اسکا گورا بدن ڈھانپنے سے قاصر تھا۔ ولید نے نگاہوں کا زاویہ بدل
 لیا۔
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ٹھیک ہے شوق سے بتا دینا۔ رحم کی بھیک تو کسی انسان سے میں کبھی مانگتا ہی
 نہیں کیونکہ رحمان تو بس رب کی ذات ہے۔ بندے کی کیا بساط۔ اسکا لہجہ
 بہت مضبوط تھا۔ شردہا نے سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔

گاؤں میں کسی کو پتہ چل گیا ناں تو تمہارے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دیں
 گے۔ اسنے اسے ڈرانا چاہا۔ وہ ہنوز گردن جھکائے اپنے پیروں کو گھورتا رہا۔
 چہرے پر از حد لاپرواہی تھی۔

جاؤ جاکر ساری بستی کو اکٹھا کرلو۔ میں تم جیسے ہزاروں کافروں کو جھکائی دیتا

اپنے دیس کا بارڈر پار کر جاؤں گا۔ میرا ایمان ہے کہ میرا واحد و یکتا رب تمہارے مندروں میں رکھی ہزاروں پتھر کی مورتیوں پر بھاری ہے۔ اسکے الفاظ تھے کہ بجلی کا زوردار جھٹکا۔ شردہا سر تا پا کانپ گئی۔

جاؤ ناں اب تک یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ اسنے پھر اسے للکارا۔ شردہا ٹس سے مس نہ ہو سکی۔ اسکے یقین نے شردہا کی زبان گنگ کر دی تھی۔

تم بارڈر پار کے ہو؟ کچھ دیر بعد اس نے بمشکل پوچھا۔

ہاں۔ بارڈر پار کا فوجی ہوں۔

ہمارے دیش میں جاسوسی کرنے آئے تھے؟

نہیں۔ میں خود سے یہاں نہیں آیا۔ ایک حادثہ لے آیا تھا۔

حادثہ۔۔ شردہا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

ہاں۔۔ ولید نے ایک گہری سانس بھری۔ شردہا نے پرات وہیں چھوڑی اور اٹھ

کر چارپائی کے دوسرے کنارے پر ٹک گئی۔ ولید سر جھکائے بیٹھا تھا۔

کیسا حادثہ؟ اسنے پوچھا۔ آواز سرگوشی جیسی تھی۔ ولید نے سر اٹھا کر آسمان کی

وسعتوں میں جانے کیا کھوجا تھا۔

میں سیاچن میں پوسٹڈ تھا۔ ایک روز برفانی ہواؤں کے جھکڑ چلے اور میں زد

میں آگیا۔ جب آنکھ کھلی تو خود کو جیل میں پایا۔

تو باپو کا کھیال ٹھیک تھا تم جیل سے بھاگے ہو۔ شردہا نے اسکی بات کاٹی۔

ہاں۔ جیل سے بھاگا ہوں۔ ولید نے سر ہلایا۔

میں کیسے وشواس کر لوں۔ شردہا کو اس پر یقین کر لینے میں تامل تھا۔ ولید نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔

مجھے میرے اللہ کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔

بہت بڑی قسم کھا رہے ہو۔ سوچ لو۔

سوچ سمجھ کر ہی قسم کھائی ہے۔

چلو۔ دیکھا جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ کب تک یہاں رہنے کا ارادہ ہے؟ وہ چارپائی سے اٹھ کر باورچی خانے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

بارڈر پار کرنے تک۔

بارڈر پار کرو گے؟ شردہا نے پلٹ کر حیرت سے اسکی طرف دیکھا۔

ہاں۔ ولید نے کہا۔

پاگل ہو کیا۔ بھون کر رکھ دیں گے تمہیں فوجی وہ جو بارڈر کی رکھوالی کر رہے ہوتے ہیں۔ شردہا نے اسے یوں بتایا جیسے وہ تو یہ سب جانتا ہی نہ ہو۔ مجھے انجام کی پرواہ نہیں۔ میں اپنے وطن واپس جانے کے لیے ہر حد سے گزر

جاؤنگا۔

ادھر ہی رہ لو۔ بھارت اور پاکستان ایک جیسے دلش ہی تو ہیں۔ ایک جیسی پریم
پرائیں ایک جیسے رواج ایک جیسا رہنا سہنا۔

کچھ بھی ایک جیسا نہیں ہے شردہا بی بی! نہ روایتیں نہ اقدار نہ رہن سہن۔ ہم
مسلمان ہیں۔ ہمارا دین ہمارے کلچر رہن سہن کھانے پینے سب کچھ کو دنیا کے
ہر کلچر سے الگ کر دیتا ہے۔ ہم مسلمان اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ اور یہ
بھی تو سوچو کہ اگر پورے ہندوستان میں ساری اقوام ایک جیسی ہی ہوتیں تو
پاکستان بنانے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔

وہ تو مسلوں کا جو تھا پتلا سوکھا سا کیا نام تھا اس کا مشکل سا۔۔ ہاں محمد علی
جناح۔ اس کو دونوں دھرم میں فساد ڈالنے کا شوق تھا۔ شردہا چاول پانی سے
کھنگال رہی تھی۔

قائد اعظم محمد علی جناح نے فساد ختم کروانے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا۔ ورنہ
صدیوں سے اس خطے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔

یہ تو سب مسلوں کی بنائی ہوئی جھوٹی باتیں ہیں۔ ہندو دھرم کے ماننے والے
سب سے محبت کرتے ہیں۔ ہمارا تو ماننا ہی یہی ہے کہ کسی بھی دھرم ذات
پات سے بڑھ کر ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے انسانیت۔ شردہا کی زبان پر وہی
گھسے پٹے الفاظ تھے جس کا پرچار ہندو ایک زمانے سے اپنے میڈیا کے ذریعے

کر رہے ہیں۔

انسانیت۔ یہ خوب کہی تم نے۔ ارے نادان لڑکی! محسن انسانیت کے پیروکار ہیں ہم۔۔ ہمارے پیارے نبی پاکی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی ہمدردی کی جو اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں انکی نظیر تو پوری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ہمارے دین کی تو بنیاد ہی پیار محبت امن و آشتی پر مبنی ہے۔ بھلا مسلمان سے بڑھ کر انسانیت کا خیر خواہ کون ہو سکتا ہے روئے زمین پر۔ ولید کے دلائل بھاری تھے۔ مگر سامنے بھی ایک بھارتی ہندو لڑکی تھی۔۔۔ مسلمان اور اسلام سے نفرت جس کی رگوں میں دوڑتی تھی۔

مسئلے ساری دنیا میں انسانوں کے کھون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔ سب سے بڑے آئٹک وادی مسئلے ہیں۔ اسنے پیاز براؤن کرتے ہوئے کہا۔

سنی سنائی مت بولو لڑکی۔ تم ہر بات محض صدیوں کی نفرت کی بنیاد پر کر رہی ہو۔ جبکہ میں خود ایک فوجی ہوں۔ میں نے دیکھا ہے مسلمانوں کو دہشتگردوں کے خلاف لڑتے ہوئے۔ میں نے خود حصہ لیا ہے دہشتگردی کے خلاف جنگ میں۔۔

بس۔۔ مجھے اتنا نہیں پتہ بس یہ جانتی ہوں کہ تمہارا دھرم کھون بہانا سکھاتا ہے۔ اور تم مسئلے اپنے علاوہ باقی سب کو برا سمجھتے ہو۔ شر دہانے ہاتھ اٹھا کر اسکی بات کاٹی۔

کیا عمر ہے تمہاری؟ ولید نے غیر متعلق سوال کیا۔

اٹھارہ سال۔۔۔ مگر تم نے کیوں پوچھا۔

اپنی اٹھارہ سالہ زندگی میں تم کتنے مسلمانوں سے ملی؟

کسی سے بھی نہیں۔ ادھر آتے جاتے رہتے ہیں ملے بارڈر کی سیر کرنے انکو بس دور دور سے ہی دیکھا۔ ایکبار جموں گئی تھی تو وہاں کچھ مسلے دیکھے تھے۔ شر دہا نے جواب دیا۔ وہ ساتھ ساتھ چاولوں کا بگھار لگانے میں نے مصروف تھی۔

یعنی بحیثیتِ مجموعی میں پہلا مسلمان ہوں جس سے تم نے باقاعدہ بات چیت کی ہے۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

ہاں۔

تو جس قوم سے تم کبھی ملی ہی نہیں جس دھرم کو تم جانتی ہی نہیں اسکے متعلق سنی سنائی پر یقین کر کے اٹل رائے قائم کر لینا۔ تمہیں نہیں لگتا یہ ایک باشعور انسان کی شان کے خلاف ہے۔ ولید کا لہجہ نرم تھا۔ شر دہا نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ وہ جیسے ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گئی تھی۔

کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ اسنے کچھ دیر بعد جواباً کہا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔

کیا بنایا ہے؟ اسنے نا سمجھی کے عالم میں پوچھا۔

آئی مین اللہ تعالیٰ نے انسان کو ساری مخلوقات جانور پودے جن بھوت وغیرہ
سب سے زیادہ بہترین بنا کر دنیا میں بھیجا ہے جانتی ہو کیوں بہتر ہے انسان
ان سب سے؟

کیوں۔۔

کیونکہ اللہ نے انسان کو ریزن کی پاور دی ہے۔ وہ سنی سنائی پر یقین نہیں کرتا
بلکہ سوچتا ہے فکر کرتا ہے اور پھر کوئی رائے قائم کرتا ہے۔ وہ رسان سے
سمجھا رہا تھا۔ اسکی بات شردہا کے دل کو لگی۔ اس اینگل پر تو اس نے کبھی
سوچا ہی نہیں تھا۔ تبھی کواڑ پر دستک ہونے لگی اور ساتھ ہی شنکر داس کی آواز
آئی شردہا اری او شردہا۔

شردہا پھرتی سے اٹھی۔ اور ولید کو چپ رہنے کا اشارہ کر کے دروازے کی
طرف بڑھی اور لوہے کی زنگ آلود کنڈی کھول دی۔

ہری اوم ہری اوم۔۔ شنکر داس کہتے ہوئے اندر داخل ہوا۔
نمستے باپو۔ شردہا بولی۔

نمستے بیٹا رانی۔۔ وہ کہتے ہوئے آنگن میں چلا آیا۔

پوجا کے سب انتظام ہو گئے باپو؟ شردہا نے پوچھا۔ شنکر داس ولید سے ذرا پرے

چارپائی پہ ہی ٹک گیا تھا۔

ہاں بال گوپال کی کرپا سے سب انتظام ہو گئے۔ بھگوان ہم سب کے پری واروں کی سرکشا کرے۔ شکر داس بڑا مسرور نظر آرہا تھا۔

ہری اوم ہری اوم۔ شردہا بھی جھومتی ہوئی باورچی خانے کی جانب بڑھ گئی۔ ولید بے تعلقانہ انداز میں بیٹھا تھا۔ شکر داس اسکی طرف متوجہ ہوا۔

شری وار کو ہم کل دیوی کی پوجا کریں گے۔ مندر میں ساری بستی کے لوگ اکٹھا ہو جائیں گے۔ پوجا کے بعد بھوجن بھی ساتھ ہی کریں گے۔ وہ اسے اطلاع دینے لگا۔ مجھے پتہ ہے تم بھی پوجا میں شامل ہونا چاہتے ہو پرانتو گاؤں والوں کو علم نہیں کہ ہم نے کسی کو پناہ دی ہے اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو ساری بھگوان جانے لوگ کیا کیا باتیں بنانے لگیں۔ تم یہیں پوجا کر لینا۔ میں تمہیں ساتھ مندر نہیں لے جا سکتا۔ شردہا تمہیں بھوجن پہنچا دے گی۔ شکر داس کا لہجہ اب ولید کیساتھ بھی نرم تھا۔ ولید کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اچانک اسکی نظر شردہا کی جانب اٹھی وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے چپ رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

کوئی بات نہیں پنڈت جی۔ میں آپکی مجبوری سمجھتا ہوں۔ اسنے نرم لہجے میں مسکرا کر کہا تھا۔ شردہا نے سکھ کی سانس خارج کی تھی۔

ارے شردہا بیٹا! کتنی دیر لگے گی اور۔

بس باپو تم ہاتھ منہ دھو کر آؤ جب تک چاول تیار ہو جائیں گے۔ اسنے جواب دیا تو

شکرت داس ہری اوم کہتا اٹھ کر ہینڈ پمپ کی جانب بڑھ گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ اندرونی کمرے میں چلا گیا۔

تم نے باپو کو اپنے متعلق کچھ بھی بتایا تو پھر مجھ پہ ذمے داری نہ ہوگی کسی بات کی۔ شردہا نے بہت مدھم آواز میں اسے مخاطب کیا۔

فکر مت کرو مجھے اپنی جان عزیز ہے۔ آخر کو زندہ سلامت اپنے گھر بھی تو جانا ہے۔ ویسے تمہارا شکریہ۔ وہ اٹھ کر لنگڑاتا ہوا باورچی خانے کی چھوٹی سی دیوار کے قریب آن رکا۔

جا کر بیٹھو۔ گھاؤ میں درد ہوگا تمہیں۔ اس نے چاول دم سے اتارے۔

بھوک لگی ہے جلدی سے کھانا دے دو پلیز۔ وہ مسکرا کر بولا۔

جا کر بیٹھو دیتی ہوں۔ شردہا نے ہاتھ ہلایا۔ وہ پلٹ کر چارپائی کی جانب بڑھ گیا۔



رات کا آخری پہر تھا جب شردہا بیدار ہو گئی۔ ہر سو مکمل سناٹا تھا۔ وہ کچھ دیر بے حس و حرکت پڑی رہی پھر اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی۔ باپو کو کچھ دیر تک جاگتا تھا سو اس کے جاگنے سے قبل وہ اس کے نہانے کے لیے پانی گرم کر کے رکھ دیتی تھی۔ اس نے ٹین کے ڈبے میں پانی بھرا اور لکڑیاں سلگا کر ڈبا آگ پہ رکھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے آٹا گوندھا اور ناشتے کے لیے آلو کی

بھجیا پکانے کی غرض سے آلو چھیلنے لگی۔ اسی اثناء میں باپو جاگ گیا۔ اسنے
اشنان کیا۔ تب تک شردہا نے ناشتہ تیاری کر لیا تھا۔ باپو نے پہلے خالی پیٹ کالی
ماتا کے چرن چھوئے پھر ناشتہ کر کے مندر روانہ ہو گیا۔ اسکے جانے کے بعد
شردہا نے ناشتہ کیا اور چولہے کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ سردی کچھ زیادہ تھی۔
وہ ہاتھ سینک رہی تھی جب کھٹکے کی آواز پر چونکی۔ ولید اپنے کمرے سے نکل
آیا تھا اور اسکا رخ ہینڈ پمپ کی جانب تھا۔ وہ ہینڈ پمپ چلاتے ہوئے وضو کر
رہا تھا۔ شردہا نہ جانتی تھی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ تو بس غائب دماغی کے عالم
میں اسے تک رہی تھی۔ وضو کر کے وہ واپس کمرے میں چلا گیا۔ جانے اس
نے شردہا کو دیکھا ہی نہ تھا یا پھر دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ شردہا کسی ٹرانس
کے عالم میں اٹھ کر اسکے پیچھے آئی اور پھر بے اختیار کمرے کے دروازے پر
ٹھٹھک کر رک گئی۔ چھوٹے سے کمرے میں وہ چارپائی کے قریب زمین پر
بستر کی سفید چادر بچھائے کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ شردہا جانتی تھی کہ مسلمان
اپنے اللہ کی عبادت کو نماز کہتے ہیں مگر وہ کسی کو نماز پڑھتے پہلی بار دیکھ رہی
تھی۔ ولید ناف پر ہاتھ باندھے نماز شروع کر چکا تھا۔ وہ دروازے کے قریب
ہی رکی رہی۔ وہ رکوع کے لیے جھکا۔ اسکی زخمی ٹانگ میں جانے درد تھا یا
نہیں۔۔ شردہا سمجھ نہ پائی۔ وہ اب سجدہ کر رہا تھا۔ شردہا کسی سحر زدہ کی طرح
اسکی ایک ایک موومنٹ کو نوٹ کر رہی تھی۔ اسنے دو بار سجدہ کیا اور پھر سے
اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک بار پھر وہی عمل دہرا رہا تھا مگر اب کی بار وہ دوسرا سجدہ

کر کے اٹھ کھڑا ہونے کی بجائے بیٹھ گیا تھا۔ اسنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر تھے۔ اسنے سلام پھیرا تو شردہا کو لگا وہ اب اسکی جانب متوجہ ہوگا مگر وہ پھر اسے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر سے نیت باندھ کر اس نے تکبیر کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ اسکی آواز قدرے بلند ہوئی تھی۔ شردہا کی سماعتوں نے اللہ اکبر کا ورد سنا مگر لفظوں سے ناآشنائی کے باعث سمجھ نہ پائی لیکن یہ سچ تھا کہ ان الفاظ نے اسکے پورے وجود میں اک سنسنی دوڑا دی تھی۔ ولید نے جب تک نماز ختم کی وہ وہیں جمی رہی یوں جیسے کسی جادوگر نے چھڑی گھما کر اسے ساکت کر دیا ہو۔ ولید نے سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔ وہ جیسے گرد و پیش سے بیگانہ تھا۔ شردہا یکدم چونکی پھر پلٹ کر واپس آنگن میں چلی آئی اور چولہے کے قریب آ بیٹھی۔ اسنے چولہے میں کچھ اور لکڑیاں ڈالیں اور چائے اس پہ رکھ دی تاکہ ولید کے آنے تک گرم ہو جائے۔ اسکا ذہن الجھا ہوا تھا۔ اس نے کبھی کسی کو اتنا ڈوب کر عبادت کرتے نہ دیکھا تھا۔ وہ ایک پنڈت کی بیٹی تھی۔ اسے باپو جب پاٹ کرتے تو گھنٹوں آنکھیں بند کیے وید کے شلوک پڑھے جاتے۔ مگر انکی گھنٹوں پر مشتمل پاٹ میں بھی وہ سپردگی نہ ہوتی تھی جو ولید حسن کی دس منٹ کی نماز میں شردہا نے محسوس کی تھی۔ وہ تو جیسے پورے کا پورے اپنے رب کا ہو چکا تھا۔ ٹانگ کا زخم بھی اسکے سجدوں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا تھا۔ وہ تو بس اک لہر میں بہہ رہا تھا۔ گرد و پیش سے بے نیاز بس مکمل طور پر اپنے ان دیکھے رب کا ہو کر۔ مورتیوں کے سامنے پوجا

کرنے والی شردہا کسی ان دیکھے رب کی اس قدر ڈوب کر عبادت کرنے والے پر حیران نہ ہوتی تو اور کیا کرتی۔ وہ ہونہی گم صم سی بیٹھی رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ کمرے سے باہر نکلا۔

کہاں گم ہو؟ ولید کی فریش سی آواز پر وہ بے طرح چونکی۔
کہیں نہیں۔ ناشتہ کرو گے۔

بالکل کرونگا۔ وہ کہتے ہوئے چارپائی بچھا کر اس پہ بیٹھ گیا۔
ٹھنڈ ہے اندر بیٹھ جاؤ میں ناشتہ وہیں دے جاؤنگی۔ شردہا نے پیڑہ بناتے ہوئے کہا۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews
میں یہاں ٹھیک ہوں۔
جیسی تمہاری مرضی۔

تمہارے والد اتنی جلدی مندر چلے جاتے ہیں۔
ہاں۔ صبح مندر کی گھنٹی سے ہی تو آس پاس کے لوگ بیدار ہوتے ہیں۔
اسنے جواب دیا۔

ہم تو اذان دے کر سب کو جگاتے ہیں۔ اللہ کے بابرکت نام سے۔ ولید کے لہجے میں فخر تھا۔

پتہ ہے مجھے۔ جموں میں سنی تھی اذان بھی ایکبار۔ اور وہاں فساد بھی ہوتے

ہیں اذان پر پابندی بھی لگ جاتی ہے کبھی کبھی۔ وہ اسے بتا رہی تھی۔

اذان پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ یہ آواز قیامت تک قائم و دائم رہے گی۔

ولید نے پر عزم لہجے میں کہا۔

تم بڑے پکے مسئلے لگتے ہو۔ کہیں وہ تو نہیں ہو جو مسجد میں ہوتے ہیں جن کے بڑی بڑی داڑھی ہوتی ہے۔ اسکا اشارہ مولویوں کی جانب تھا۔ ولید نے بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

الحمد للہ مولوی ہوں۔



لیکن تم نے تو کہا تھا تم فوجی ہو۔

تو کیا فوجی مولوی نہیں ہو سکتا۔

کیسے ہو سکتا ہے۔ دھرم کہ سیوا کرنے والے کوئی اور کام کیسے کر سکتے ہیں۔

کیوں نہیں کر سکتے۔ دین ہمیں دنیا کے کام کرنے سے روکتا تو نہیں ہے۔

تم عجیب باتیں کرتے ہو۔ شردھا الجھی۔

ارے بھئی سادہ سی بات ہے۔ ہمارا دین کہتا ہے کہ دین و دنیا دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلو۔ یعنی دین کی تعلیمات پر بھی عمل جاری رکھنا چاہیے اور دنیا کے کام کاج بھی ساتھ ساتھ کرتے رہنا چاہیے۔ مولوی کوئی چولہ تو نہیں جو اوڑھ کر پھرا جائے۔ ہر وہ انسان جو دین پہ عمل کرتا ہے نیکی کا درس دیتا

ہے۔ نماز پڑھوا سکتا ہے۔ قرآن کا علم رکھتا بھی ہے اور لوگوں کو سکھاتا بھی ہے وہ مولوی ہے۔ معلم ہے۔۔ پھر چاہے وہ پروفیشنل لحاظ سے فوجی ہو بزنس مین ہو نوکری پیشہ ہو یا کسی بھی اور شعبے سے منسلک ہو۔ اسنے بہت جامع انداز میں وضاحت کی تھی۔ شردہا کا ذہن کچھ اور الجھا۔ وہ کاجواب ہو گئی تھی۔ اسنے ناشتہ تیار کر لیا تھا سو ولید کے سامنے لا کر رکھا اور پلٹ کر گھڑے کی طرف بڑھی۔ اسمیں پانی قریب الختم تھا۔

میں پانی بھرنے جارہی ہوں۔ تم اندر والے کمرے میں جاؤ۔ میں باہر سے کنڈی ڈال کر جاؤنگی۔ اسنے گھڑا کمر پر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ولید تابعداری سے اٹھا اور ناشتہ سمیت کمرے میں چلا گیا۔ شردہا پانی بھرنے چشمے پر آئی۔ وہاں گاؤں کے منچلے جمع تھے۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح شردہا کو دیکھ کر سیٹیاں بجائیں اور آوازیں کسیں۔ شردہا نے شدید جھنجھلاہٹ کے عالم میں گھڑا بھرا اور واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ ان لوفروں کے قہقہے اسکا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ تیز تیز چلتی اپنے گھر تک آئی کنڈی کھول کر اندر داخل ہوئی۔ گھڑا رکھ کر چارپائی پر ہی بیٹھ گئی۔ اسکا چہرا سرخ ہو رہا تھا۔ تبھی ولید کمرے سے باہر نکلا۔ اسکے ہاتھ میں ناشتہ کے جوٹھے برتن تھے۔

کیا ہوا۔ وہ اسکے چہرے پر پھیلی درشتی کو بھانپ گیا تھا۔

سالے موالی سارے جمع ہو جاتے ہیں چشمے پر۔ دل تو کرتا ہے ایک ایک کو

پتھر ماروں۔ وہ غصے سے بولی۔

راہ کے کتوں کو پتھر مارنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بجائے اس کے کہ وہ اور بھونکتے ہیں۔ وہ برتن دھو کر رکھا رہا تھا۔

تو پھر کیا عورت چپ چاپ یہ انیائے برداشت کرتی رہے کہ جس راہ چلتے غنڈے موالی کا دل کرے اس پہ آواز کسے اسے تنگ کرے۔ وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ ولید باورچی خانے سے نکلتے ہوئے مسکرایا۔

جانتی ہو عورتیں راہ چلتے بدطینت مردوں کے ہاتھوں ستائی کیوں جاتی ہیں؟ اسنے پوچھا۔ شردہا نے نفی میں سر ہلایا۔

اسلیے کیونکہ وہ خود کو مکمل طور پر چھپا کر گھر سے نہیں نکلتیں۔ عورت چھپی ہوئی باپردہ ہی قابل عزت ہوتی ہے شردہا۔ کبھی آزما کر دیکھ لینا۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ شردہا کچھ دیر وہیں بیٹھی رہی پھر سردی زیادہ محسوس ہونے لگی تو اٹھ کر چھوٹے کمرے میں چلی آئی۔ یہ کمرہ اسکے اور باپو کے تصرف میں تھا آجکل۔ بستر پر باپو سو جاتا تھا اور زمین پر بستر بچھا کر وہ۔ جس کمرے میں ولید رکا تھا وہ کمرہ دراصل شردہا تھا۔

کمرے میں ایک جانب لوہے کی زنگ آلود الماری رکھی تھی۔ اور ایک پرانے زمانے کا دھندلا سا آئینہ۔ شردہا آئینے کے سامنے رک گئی۔ اسکی نظریں بے اختیار ہی اپنے سراپے سے الجھی تھیں۔ ساڑھی کا بلاؤز واقعاً اسکے وجود کو

چھپانے سے قاصر تھا۔ شردہا نے پلو کھول کر اچھی طرح پھیلا کر وجود کے گرد لپیٹا۔ پھر کچھ سوچ کر الماری میں سے گرم شال نکالی اور ساڑھی کا پلو سر پر رکھ کر شال کو اپنے وجود کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔ وہ حسین تو اب بھی نظر آرہی تھی مگر صرف حسین۔۔۔ پرکشش نہیں۔۔ اسنے گہری سانس بھری اور کمرے سے باہر نکل آئی۔



اگلے روز صبح صبح وہ اسی طرح شال اچھی طرح لپیٹے چشمے پر پانی بھرنے آئی تھی۔ اسنے دیکھا کہ وہاں پر پہلے سے جمع لو فر پارٹی کچھ ہی لمحوں بعد تتر بتر ہونے لگی۔ وہ اب دور دور جاکھڑے ہوئے تھے۔ شردہا نے آرام سے پانی بھرا اور پلٹ کر گھر کی جانب واپس چل دی۔ آج کسی نے اس پر آواز نہ کسی تھی۔۔ کسی نے اس کا پیچھا نہ کیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے شردہا کماری کا سارا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ اس روز گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ ولید کی سوچ کی قائل ہو گئی تھی۔



شیتل کے بیاہ کا شبہ مہورت نکال لیا گیا تھا۔ ٹھیک پندرہ دن بعد اسکی شادی تھی۔ اور رام ناتھ کے گھر میں ڈھولک رکھی جاچکی تھی۔ رام ناتھ کی والدہ سیتا از خود آکر شادی کا نیوتا دے کر گئی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ شردہا کو بالخصوص روز آنے کی تاکید کر کے گئی تھیں۔

اس روز شیتل کی ہلدی کا فنکشن تھا۔ باپو نے سرِ شام ہی شردہا کو تیار رہنے کی یاد دہانی کروادی تھی۔ برابر والی پوجا اور شردہا نے اکٹھے ہی شیتل کے گھر تک جانا تھا۔ شردہا نے پیلی ساڑھی پہنی جس پر سبز گوٹا لگا ہوا تھا۔ ساڑھی کے بلاؤز کا گلا پیچھے سے گہرا تھا جس میں سے اسکا گورا بدن جھلک رہا تھا۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے پہنے اور سبز آنکھوں میں کاجل لگا کر کانچ کی چوڑیاں کلائیوں میں ڈال لیں۔ پھر لمبے بال پشت پر بکھرا لیے اور پلو شانے پر سیٹ کر کے کمرے سے باہر نکلی۔ ولید چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جانے کس سوچ میں گم تھا۔ شردہا کی پازیبوں کی چھن چھن کی آواز ہر چونکا۔

جاری ہو۔

ہاں۔ باپو سو گیا ہے۔ میں باہر سے کنڈی لگا جاتی ہوں دیر ہو جائے گی۔ اسنے کہا۔

دیر تک رکنے کا ارادہ ہے کیا۔ ولید نے پوچھا۔

ہاں۔ دیر تو ہو جاتی ہے شادی بیاہ میں۔ اسنے جواب دیا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

پوجا آگئی۔ میں چلتی ہوں۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

اللہ حافظ۔ ولید نے عقب سے کہا تھا۔ شردہا ان سنی کرتی دروازہ پار کر گئی۔ ولید نے اٹھ کر کنڈی لگالی۔ اور پھر سے چارپائی پر جا بیٹھا۔



ہلدی کی رسم میں خوب ہلہ گلہ ہو رہا تھا۔ شردہا کے حسن کے جلوے تو آج ہر سو نمایاں تھے۔ ہر نظر اس پر تھی اور جب اس نے ڈانس کیا تو سب دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ وہ اس گھر کی ہونے والی بہو بھی تھی اسلیے سیتا نے ہر کام اسکے سپرد کر رکھا تھا۔ رسم ختم ہوتے ہوتے رات ہو گئی۔ پھر مہمانوں کو کھانا کھلانے کا وقت آیا۔ شردہا باقی لڑکیوں کے ساتھ مل کر مردوں کو کھانا سرو کر رہی تھی۔ بڑے کمرے کی فرشی دسترخوان لگا تھا جس پر مرد حضرات براجمان تھے۔ عورتوں کی باری اسکے بعد آنا تھی۔ مردوں کے کھانے کے بعد عورتوں کی باری آئی۔ شردہا ابھی بھی مسلسل کاموں میں ہی لگی تھی۔ ہر طرف سے اسی کے نام کی پکار پڑ رہی تھی۔

اری شردہا! پوریاں کم پڑ گئیں۔ سیتا موسیٰ کی پکار پر وہ سرپٹ باورچی خانے کی جانب بھاگی۔

شردہا دی دی آپکو شیتل دی دی اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔ وہ ابھی پوریاں گن رہی تھی کہ عقب سے برابر والوں کے ننھے روہن نے اسے اطلاع دی۔ اچھا۔ تو چل یہ پوریاں سیتا موسیٰ کو دے آ۔ اس نے پوریاں روہن کو تنہا کر دوڑایا اور خود بھی عجلت آمیز انداز میں چلتی گھر کے پچھلے حصے کی جانب بڑھی جہاں ایک کمرہ شیتل کے زیر تصرف تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اندر گہرا

اندھیرا تھا۔ یکدم عقب میں دروازہ بند ہو گیا۔ شردہا چونک کر پلٹی۔ اسکے ارد گرد خطرے کی گھنٹی بڑے زور سے بجی تھی۔

شیتل دی دی۔۔ اسنے شیتل کو آواز دی۔ تبھی کمرے میں ماچس جلنے کے آواز گونجی اور پھر ایک موم بتی روشن ہوتے ہیں رام ناتھ کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ وہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا تھا۔ شردہا دھک سے رہ گئی۔

رام۔۔ تم۔۔

ہاں میں۔۔ اسنے موم بتی طاق میں رکھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اسکی جانب بڑھا۔

یہ۔۔ یہ کیا ہے رام۔۔ مجھے یہاں کیوں بلایا ہے۔ اسنے خود کو بہادر پوز کرنا چاہا۔ رام ناتھ نے آگے بڑھ کر اسکی کلائی تھام لی۔ کانچ کی چوڑیاں کرچی کرچی ہو گئیں۔

آج تم بہت سندر لگ رہی ہو۔ وہ مخمور لہجے میں اسے قریب آکر بولا۔

پیچھے ہٹو۔ شردہا کسمائی۔

ارے کیا ہو گیا۔۔ ہمارا بیاہ ہونے والا ہے۔

بیاہ ہونے والا ہے مگر ہوا تو نہیں۔

اس سے کیا ہوتا ہے۔

یہ پاپ ہے رام۔ چھوڑو مجھے۔ اس نے درشتی سے کہا۔

ارے پاپ پُنے کچھ نہیں ہوتا۔ اور تم اس وقت یہ باتیں رہنے دو۔ چلو پریم کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے ٹھنڈے ہاتھ اسکی کمر پر رینگ رہے تھے۔ شردہا کے تن بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔

عورت چھپی ہوئی باپردہ ہی قابل عزت ہوتی ہے شردہا۔ اس کے ارد گرد ایک نرم ملائم سی آواز گونجی تھی۔

چھوڑو مجھے۔ اس نے اپنی پوری قوت سے رام ناتھ کو پرے دھکیلا۔ اور دروازے کی طرف بڑھی۔ رام ناتھ نے آگے بڑھ کر اسکی دوسری کلائی دبوچی۔ کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ کانچ اسکی کلائی کو زخمی کر گئے۔ مگر زخموں سے زیادہ تکلیف اسے اس سچویشن سے ہو رہی تھی۔

اتنا اکڑ کا ہے رہی ہے۔ مت بھول کہ تو میری پتی بننے والی ہے اگر میں نے تجھ سے بیاہ نہ کیا تو بستی میں کوئی اور تجھے منہ نہیں لگائے گا۔ وہ یکدم لہجہ بدل گیا تھا۔

تھوکتی ہوں میں تجھ جیسے پتی پر۔ جو ہونے والی پتی کی عزت نہ کرتا ہو وہ مرد ہی نہیں۔۔ اس نے ایک زوردار طمانچہ اس کے چہرے پر رسید کیا تھا۔ رام ناتھ پہلے تو لڑکھڑایا پھر غضبناک انداز میں اسکی جانب بڑھا۔ اس نے شردہا کو وحشیانہ گرفت میں دبوچ لیا تھا۔ وہ اس کے چنگل سے رہائی کے لیے اسے بری طرح نوچ

کھسوٹ رہی تھی۔ تبھی دروازے پر دستک ہونے لگی۔ رام ناتھ ہڑبڑا گیا۔
شیتل شیتل۔۔ یہ سیتا موسیٰ کی آواز تھی۔

ماتا جی میں ہوں کپڑے بدلی کر رہا ہوں آتا ہوں۔ رام ناتھ نے آواز لگائی۔
جلدی آ۔ تیرے باپو بلارہے ہیں۔

آتا ہوں۔ اسنے آواز لگائی پھر پھرتی سے اپنا حلیہ درست کیا بکھرے بال
سیدھے کیے۔ شردھا ایک جانب دہکی اپنا تنفس بحال کر رہی تھی۔
اگر تو نے کسی سے کچھ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ اسے دھمکی دے کر وہ
کمرے سے چلا گیا تھا۔ شردھا کچھ لمحے تو اندھیرے میں بیٹھی رہی پھر اٹھ کر
ساڑھی کا پلو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا اور قریب قریب بھاگتی ہوئی کمرے سے
نکلے۔ پھر وہ کسی سے بھی کچھ کہے بناء ہی گھر سے نکل آئی تھی۔ تمام رستہ وہ
بے آواز روتی رہی تھی۔ صبح ہونے کو تھی۔ مندر کی گھنٹیوں کی ٹن ٹن فضا
میں بکھر رہی تھی۔ وہ جب گھر پہنچی تو مندر سے شنکر داس کی آواز کو بلند
ہوتے سنا۔ وہ پاٹ کر رہا تھا۔ اسنے گھر کے دروازے کو بند پایا۔ اس نے دستک
دی۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھلا تھا۔ وہ اندھا دھند اندر داخل ہو گئی۔
دروازے کی اوٹ میں ولید کھڑا تھا۔ اسنے دروازہ بند کیا۔ شردھا یکدم ہی اسکے
سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی تھی۔

شردھا! کیا ہوا ہے تمہیں۔ تم ٹھیک تو ہوناں۔ وہ حیران رہ گیا تھا۔ شردھا کا پورا

وجود کانپ رہا تھا۔ ولید نے اسے خود سے دور کیا اور اسے شانوں سے تھام کر آنگن میں لاکے چارپائی پر بٹھا دیا۔ شردہا کی سسکیاں اب تک جاری تھیں۔ اسکی زخمی کلائیوں نے ولید کی تشویش میں اضافہ کر دیا تھا۔

تمہیں کسی نے مارا ہے شردہا اسنے نرم لہجے میں پوچھا۔ وہ کچھ نہ بولی بس پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ ولید نے پانی کا گلاس بھرا اور اسے تھمایا۔ شردہا نے کسی صدیوں کے پیاسے کی طرح سارا گلاس غٹا غٹا چڑھا لیا۔

اب بتاؤ کیا ہوا ہے اس نے کچھ لمحوں بعد نرم لہجے میں پوچھا۔ شردہا نے اٹک اٹک کر اسے سارا واقعہ سنا دیا۔

کتنا گھٹیا انسان ہے وہ۔ اسکی ہمت کیسے ہوئی تمہیں یوں زد و کوب کرنے کی۔ ولید کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

میرا جی چاہ رہا ہے میں آتما ہتیا کر لوں۔ وہ سسکتے ہوئے بولی۔

تم کیوں آتما ہتیا کرو گی۔ مر تو اس بے غیرت کو جانا چاہیے جو اپنا ہوس پرست ہے کہ ہونے والی بیوی کی عزت پر ہاتھ ڈال رہا ہے۔

یہاں سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔

کافر۔۔۔ ولید نے زیر لب دہرایا۔ شردہا سن نہ سکی تھی۔

تم نے ٹھیک کہا تھا کہ عورت کو خود ڈھک کر رکھنا چاہیے۔ مجھے لگا بس باہر

کے مردوں سے ہی چھپانا چاہیے اپنی سندر تا کو۔۔

عورت کو سب سے زیادہ خطرہ گھر کے نقب زنوں سے ہوتا ہے۔ اور جانتی ہو یہ نقب زن کون ہوتے ہیں۔ جھوٹے رشتے۔۔ منگیتر۔۔ ہونے والا شوہر۔۔ ہونہ۔ وہ تنفر سے بولا۔ شردہا سے دیکھ کر رہ گئی۔

ہونے والے پتی سے بھی۔۔

ہاں۔۔۔

تم سے بھی۔۔

ہاں مجھ سے بھی۔۔ اس نے بلا تامل جواب دیا۔ شردہا یکدم اٹھی اور اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ ولید وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ روشنی اب اچھی طرح چہار سو پھیل چکی تھی۔ دن نکل آیا تھا۔



شردہا نے باپو سے کچھ نہ کہا تھا مگر اسے شام ہوتے ہوتے تیز بخار نے آن لیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بے سدھ پڑی تھی۔ شکر داس نے برابر والے گھر سے اسکی سہیلی پوجا کو بلوا لیا ایسے میں ولید بس اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اسکے ارد گرد مکمل تنہائی کے ڈیرے تھے اور اس تنہائی میں بیتی زندگی کا ایک اک پل اسکے ذہن کی اسکرین پر کسی فلم کی طرح چلنے لگا تھا۔ وہ دن جب زندگی مسکراتی تھی۔۔ جب اسکی بیا اسکے ساتھ تھی۔۔ اور پھر وہ لمحے جب

اسے بیا سے بہت دور سیاچن کے گلشیر پر جانا پڑا تھا۔ وہ کیسا جاں گسل لمحہ تھا۔ وقتِ رخصت اسکی بیا اسکی بانہوں میں گھری اسکے سینے سے سرٹکائے چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی۔ ولید حسن کو ان نرم ہاتھوں کی لرزش اور آنسوؤں کی نمی آج بھی محسوس ہوتی تھی۔ یہ محبت کی انتہا تھی کہ سات سال بیت جانے کے بعد بھی ولید حسن کی سانسوں میں ایسا کاظم کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ اسکے ہاتھوں پر ان ہاتھوں کا لمس ابھی تازہ تھا۔ وہ اگر زندہ تھا تو بیا سے ملنے کی آس میں۔ ایکبار اسے دیکھنے محسوس کرنے کی امید نے اسے زندہ رکھا تھا۔ ولید حسن موت کے منہ سے کئی بار واپس لوٹا تھا کہ اسے اپنی بیا اور اپنے بچے سے ملنا تھا۔ یہی محبت کا تقاضا تھا۔



دروازے پر کھٹکا سا ہوا تو ولید اپنے خیالات سے چونکا اور الرٹ ہو بیٹھا۔ شکر داس کھنکھارتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اسکے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

شردہا کی طبیعت تو سنبھل ہی نہیں رہی کسی صورت۔ وہ اندر آتے ہی پریشانی کے عالم میں بولا۔

اوہ! تو آپ کسی ڈاکٹر کو بلائیے ناں۔ اس نے مشورہ دیا۔

ادھر گاؤں میں ایک ڈاکٹر ہے مگر وہ آج کسی کام سے رنبیر سنگھ پورہ گیا ہوا

ہے۔

اسپتال نہیں ہے کیا ادھر گاؤں میں؟ اسنے پوچھا۔ شکر داس نے نفی میں سر ہلایا۔ اسپتال کچھ دوری پر ہے۔ مجھے جاکر ڈاکٹر کو لانا پڑے گا۔ موسم کے تیور بھی بدل رہے ہیں۔ لگتا ہے بارش آنے کو ہے۔ شکر داس بہت متفکر نظر آ رہا تھا۔ میں چلا جاتا ہوں۔ ولید اٹھ کھڑا ہوا۔ حالانکہ اسکے اپنے زخم میں انتہا سے زیادہ درد ہو رہا تھا۔

تم۔۔۔ نہیں۔۔۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔ شکر داس ہچکچایا۔

دیکھیں اس وقت شردہا کی صحت سے زیادہ اہم اور کوئی چیز نہیں۔ آپ فکر مت کریں کوئی پوچھے تو کہہ دیجیئے گا میں آپکا دور پار کا رشتے دار ہوتا ہوں۔ اس نے فوراً حل پیش کر دیا تھا۔ شکر داس جو پہلے ہی بہت پریشان تھا ولید کی پیشکش ٹھکرا نہ سکا اور پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ دو منٹ بعد ہی اسکی واپسی ہوئی اسکے ہاتھ میں ایک خاکی رنگ کی برساتی تھی۔

یہ لو جاؤ کہیں راہ کیں بارش ہی نہ شروع ہو جائے۔ میں برابر والوں سے سائیکل لے آتا ہوں۔ وہ اسے برساتی پکڑا کر کمرے سے نکل گیا ولید نے برساتی شانے پر رکھی اور کمرے سے باہر نکلا۔ کچے آنگن میں آج گرد اڑ رہی تھی۔ ولید نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جس پر سرمئی بادلوں کے پرے کے پرے اڑ رہے تھے۔ تبھی شکر داس برابر والوں سے سائیکل لے آیا۔

اسنے گھنٹی بجائی۔ ولید باہر نکلا۔

یہ لو جلدی آنا۔ اس نے اسے ہدایت دی تھی۔ ولید نے برساتی شانے پر رکھے ہی رکھے سائیکل سنبھالی۔ اسکی ٹانگ میں درد اٹھا تھا مگر اسنے پیڈل پر پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ شکر داس گھر کے اندر واپس چلا گیا۔ ولید تیز رفتاری سے سائیکل چلا رہا تھا۔ تیز ہوا بہت سرد تھی۔ ولید کے زخم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر وہ ہمت ہارنے کی بجائے جلد از جلد ہسپتال تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ اسکے اسپتال پہنچتے پہنچتے ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔ اسپتال کیا تھا چھوٹی سی ڈسپنسری تھی۔ وہاں موجود واحد ڈاکٹر کافی نکچڑھا ثابت ہوا تھا۔ کافی دیر نخرے کرنے کے بعد وہ گھر تک جانے پہ رضامند ہوا تھا۔ ولید نے اسے سائیکل پہ اپنے پیچھے بٹھایا اور تیز رفتاری سے سائیکل آگے بڑھا دی۔ بارش کی رفتار کم تھی۔ مگر آدھا راستہ طے ہوتے ہی بارش تیز ہو گئی ولید نے برساتی ڈاکٹر کو تھمادی اس نے اسے سائبان کی طرح دونوں پر تان لیا مگر بارش کی پھواریں دونوں کو بھگوئے دے رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے وہ گھر تک پہنچے تو سر سے پاؤں تک بھیگ چکے تھے۔ شکر داس نے سائیکل کی گھنٹی کی آواز سن کر دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ دونوں اندر آئے۔ شکر داس ڈاکٹر کو فوراً کمرے میں لے گیا۔ ولید نے برساتی کو کمرے کے دروازے پر لٹکایا اور خود باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ اسکے زخم کی تکلیف ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اسنے چولہے کے پاس بیٹھ کر اسمیں لکڑیاں

ڈالیں اور آگ جلائی۔ اپنے تیخ ہاتھوں کو سینکنے لگا۔ جب رگوں میں ذرا سی گرمی دوڑی تو اٹھ کر کمرے میں گیا۔ شردہا نے اسے شکر داس کے دو جوڑے دے رکھے تھے جن میں سے ایک اس نے ابھی پہن رکھا تھا جبکہ دوسرا لوہے کے بوسیدہ ٹرنک پر تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔ اسنے سب سے پہلے تو بھینگے کپڑوں سے نجات حاصل کر کے دوسرا جوڑا پہنا پھر اپنی ٹانگ پر بندھی پٹی کھولنے لگا۔ زخم تک بھینگ چکا تھا۔ اور اسمیں سے پھر ہلکا ہلکا خون رسنے لگا تھا۔ درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ولید نے ایک طویل سانس بھری۔ زخم کی حالت بتا رہی تھی کہ اگر بروقت تدارک نہ کیا گیا تو زخم خراب بھی ہو سکتا تھا۔ اسی لمحے دروازے پر کھٹکا ہوا اور شکر داس اندر داخل ہوا۔

تمہارا بہت دھنہ واد۔ تم ڈاکٹر سے اپنے گھاؤ کی بھی مرہم پٹی کروالو۔ اسنے تشکر آمیز لہجے میں کہا اسکی نظریں ولید کے زخم پر تھی۔

جی مجھے واقعی اسکی ضرورت ہے زخم خراب ہو رہا ہے۔ اسنے جواباً کہا تھا۔

میں ڈاکٹر کو ادھر ہی لے آتا ہوں۔ شکر داس کہہ کر کمرے سے نکل گیا پھر اسکی واپسی ڈاکٹر سمیت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے ولید کا زخم صاف کر کے پٹی کی۔ تب تک بارش مزید تیز ہو چکی تھی۔ سیاہ گھٹاؤں کے سایے نے دن میں شام کا سماں بنا دیا تھا۔ ولید کو شدید تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ شکر داس نے چائے بنا کر اسے اور ڈاکٹر کو پہنچائی۔ اور خود بھی وہیں آ بیٹھا۔ کچھ دیر وہ لوگ

ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر آہستہ آہستہ ان سبھی پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ سردی کافی زیادہ تھی۔ وہ تینوں اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے بیٹھے ہی اونگھنے لگے۔ سب سے پہلے ولید کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اٹھ کر بناء کھٹکے کمرے سے باہر آیا۔ بارش ابھی تک اسی تیز رفتاری سے ہو رہی تھی۔ شام کے سایے ہر سو پھیل چکے تھے۔ وہ ابھی وہیں کھڑا موسم کے تیور دیکھ رہا تھا کہ برابر والے کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی اور شردها باہر نکلی۔ ولید نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ کمرے سے چھن کر آتی دھندلی سی روشنی میں شردها کا عکس کمزور اور مضحل سا تھا۔ اسنے سیاہ چادر اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔

باپو کدھر ہے۔ اسنے نقیبہ آواز میں پوچھا۔
 وہ سو رہے ہیں۔ میں جگا دیتا ہوں تم جا کر آرام کرو۔ وہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

سنو۔ شردها کی پکار پر اسکے قدم بے بے اختیار تھمے۔

ہاں۔

تمہارا دھننے داد۔

کیوں۔۔

تم نے میرا راز رکھا۔ اسلیے بھی اور تم میرے لیے اتنی دور سے اس گھاؤ کے

باوجود سائیکل چلا کر ڈاکٹر کو لائے۔

تم لوگ میرے محسن ہو۔ یہ سب میرا فرض تھا۔ وہ ہموار لہجے میں بولا۔
تم مہمان ہو۔

ایسا نہیں ہے۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔ یہاں بہت سردی ہے۔ جاؤ شاباش۔ اسنے
نرم لہجے میں کہا تو وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ولید نے ایک
طویل سانس لی۔۔ یادوں کا ایک در کھلا تھا۔

ولید! میں نے آپ پر شک کیا تھا پھر بھی آپ نے مجھے اتنی عزت دی۔
لاسٹ براؤن آنکھوں میں معصومیت کا اک سمندر تھا۔۔

شک تو کسی کے بھی دماغ میں آسکتا ہے۔ اچھی بات یہ ہوتی ہے کہ اس شک
کو اوور کم کیا جائے اسے خود پر حاوی کر کے رشتوں کو نہ بگاڑا جائے۔

آپ بہت بہت اچھے ہیں ولید۔ اس کے لہجے میں مرعوبیت تھی۔ ولید بے
اختیار ہنس دیا تھا۔

اور تم بہت بہت کیوٹ ہو۔۔ اسنے اسکا گال تھپتھپایا ایسا مسکرا اٹھی تھی۔۔

بادل زور سے گرجے تو وہ یادوں کے فسوں سے باہر نکلا۔ اسکے ارد گرد
اندھیرا تھا۔ برستے بادلوں کی متواتر ٹپ ٹپ تھی۔۔ قریبی مندر کے گھنٹوں
کی ٹن ٹن اور بھجن کی آوازیں تھیں۔۔ اسکا حال سر اٹھائے اس کے سامنے

کھڑا تھا۔ اور ماضی۔۔ وہ جانے کہاں تھا۔۔ وہ بہت دور نکل آیا تھا۔۔ ایسی جگہ جہاں ابہا کی یادوں کے سوا اسکے پاس کچھ بھی نہ تھا۔۔ ولید کے دل میں شدید اداسی نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔۔



اگلے روز منہ اندھیرے بارش تھمی تو شکر داس ڈاکٹر کو اسپتال چھوڑنے چلا گیا۔ اسکے جانے کے بعد ولید آکر اپنے بستر پر لیٹا تو اسکی آنکھ لگ گئی۔ فجر کا وقت ختم ہونے سے ذرا پہلے وہ ہڑبڑا کر جاگا تھا۔ اسنے جلدی جلدی اٹھ کر ہینڈ پمپ سے وضو کیا اور کمرے میں آکر نماز پڑھنے لگا۔ جب اسنے سلام پھیرا تو شردہا کو دروازے کے قریب کھڑے پایا۔ ولید نے اطمینان سے دعا مانگ کر چہرے پر ہاتھ پھیرے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ناشتہ کرو گے۔ شردہا نے اسے از خود مخاطب کیا تھا۔ ولید اسکی طرف پلٹا۔ اسنے ساڑھی پر سیادہ گرم چادر جسم کے گرد اوڑھ رکھی تھی۔ بال بکھرے بکھرے سے تھے۔ ماتھے پر لگی بندیا بھی دھندلا سی گئی تھی چہرے کی سرخ و سفید رنگت میں زردی گھل گئی تھی۔ سبز آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔ وہ کمزور نظر آرہی تھی۔

نہیں تم رہنے دو۔ میں بنانا ہوں ناشتہ۔

میں بنادیتی ہوں۔ تم کہاں رسوئی میں ہانڈی چولہا کرتے رہو گے۔

اسمیں کوئی حرج نہیں۔ تم بیمار ہو اور بیمار کی خدمت کرنے سے ثواب ملتا ہے۔ وہ ہولے سے مسکرایا اور کمرے سے باہر نکل کر باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ شردہا اسکے پیچھے تھی۔

ثواب کیا اسنے پوچھا۔

جسے تم لوگ پُنے کہتے ہو۔ ولید ہندی اچھی طرح سمجھتا تھا سو اطمینان سے بولا۔ شردہا نے سر ہلادیا۔ ولید چولہے میں آگ سلگا رہا تھا۔ وہ باورچی خانے کی چھوٹی سی دیوار کے پاس کھڑی ہو گئی۔

جب کبھی ممی یا روجی کی طبیعت خراب ہوتی تھی تو میں انکو اپنے ہاتھ کا بنا اسپیشل سا سوپ بنا کر دیتا تھا۔ وہ آگ سلگا کر اس پہ توا دھرتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔

روحی۔۔

میری بہن ہے روحینہ ہم اسے پیار سے روجی کہتے ہیں۔ وہ مسکرایا۔

کتنے بہن بھائی ہیں تمہارے۔ شردہا نے نرمی سے آگے جھک کر گوندھے آٹے میں سے مٹھی بھر آٹا ہاتھ میں لیا اور پیڑا بنانے لگی۔

تین۔ مجھ سے بڑے ایک بھائی پھر میں اور پھر ہماری بہن روجی۔

مجھے بڑا شوق تھا کہ میری کوئی بہن ہوتی۔ شردہا بہت مہارت سے روٹی تیار کر

رہی تھی۔

تمہاری سہیلیاں نہیں ہیں کیا۔

بہت کم۔۔ مجھ پر کم عمری سے ہی گھر کے کاموں کی ذمہ داری ہے سہ سے ہی نہیں ملا کبھی دوستیاں گانٹھنے کا۔ بس برابر والی پوجا سے ہی دوستی ہے تھوڑی بہت۔ اسنے آگے جھک روٹی توے پر ڈالے۔ اسکے لمبے بال آگے کی جانب جھک آئے تھے۔

پیچھے ہٹ جاؤ شردہا۔ بالوں کو آگ بہت جلدی پکڑ لیتی ہے۔ اسنے رسان سے اسے سمجھایا تھا۔ شردہا تیزی سے پیچھے ہٹی اور اپنے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں لپیٹ لیا۔ ولید کی توجہ توے پر پکتی روٹی کی جانب تھی۔ وہ شردہا کی جانب کم ہی کم دیکھتا تھا۔ اور شردہا کو ہمیشہ ہی اس پر حیرت ہوتی تھی۔۔ بھلا کوئی مرد حسین عورت سے بھی نگاہیں ہٹا سکتا ہے۔۔ یہ سوال اسکے دماغ چکراتا تھا۔

تمہارے دوست ہیں۔ اسنے کچھ دیر بعد سوال کیا۔

ہاں بہت دوست تھے۔ مگر میری سب سے اچھی دوست مئی تھیں۔ میں ان سے ہر بات سنیر کرتا تھا۔ وہ روٹی توے سے اتارتے ہوئے یادوں میں کھو رہا تھا۔ شردہا نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ وہ بے حد پرکشش انسان تھا۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ ماں کیا ہوتی ہے۔ شردہا کے لہجے میں حسرت تھی۔

ماں ایک احساس ہے۔۔۔ محبت اور مہربانی کا حسین امتزاج۔ اسنے پیڑہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ شردہا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اسکے چہرے کی طرح اسکی باتیں بھی سحر زدہ تھیں۔

تمہیں روٹی پکانا کیسے آتی ہے۔

ایہا نے سکھائی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

ایہا کون۔

میری بیوی۔۔

بیوی۔۔۔ شردہا ایک لمحے کو بالکل چپ رہ گئی تھی۔

ہاں۔ میری پیاری بیوی۔۔۔ میری شریک حیات۔ ایہا۔۔۔ بیا کہتا ہوں میں اسے

پیار سے۔ وہ بڑی پیاری سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اسے بتا رہا تھا۔

تمہارا ویواہ کب ہوا۔ چند لمحوں بعد شردہا نے پوچھا۔

آٹھ سال پہلے۔ ولید اب توے پر روٹی سینک رہا تھا۔

آٹھ سال پہلے۔۔۔ وہ حیرت سے بولی۔

ہاں۔۔۔ ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔

اچھا۔ بیٹا ہے۔

یہ مجھے نہیں پتہ۔

کیوں

اسکی پیدائش سے کچھ دن پہلے ہی میری سیاچن پوسٹنگ ہو گئی تھی۔ پھر میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا اور میں انڈیا پہنچ گیا۔ روٹی توے سے اتارتے ہوئے وہ یاس بھرے لہجے میں اسے بتا رہا تھا۔ اسکے چہرے پر درد کی داستان رقم تھی۔۔ شردہا کو اس پر ترس آیا۔

تم مجھ سے اپنا درد کہہ لو۔ میں سب سنوں گی۔ اسنے نرم لہجے میں کہا تھا۔ ولید نے سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔ پھر ہولے سے مسکرایا۔ مگر اس مسکراہٹ میں کتنا ہی درد تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

یہ سات سال پہلے کی بات ہے۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے اسے بتانے لگا۔



اسکی پوسٹنگ کی خبر سنتے ہی ابیہا کے چہرے پر اداسی کے رنگ پھیل گئے تھے۔ ولید کے ساتھ اسکی پیکنگ کرواتے ہوئے وہ مسلسل اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ولید نے بھی اسے مخاطب نہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسکے مخاطب کرنے کی دیر ہوگی کہ اسکی آنکھیں جھلک پڑیں گی۔ وقت رخصت آن پہنچا تو سارے گھر والوں سے ملنے کے بعد وہ ابیہا کی جانب آیا۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔۔ گم سم سی۔۔

ولید نے اسکے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیئے۔ رفاقت کا احساس اسکے ہاتھوں سے اسکے ہاتھوں تک پہنچنے لگا تھا۔ ابیہا نے جھکی نظریں اٹھائیں۔ اسکی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ ولید نے بے اختیار اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

انکے درمیان ایک مہیب خاموشی تھی۔ لب خاموش تھے۔۔ دھڑکنیں محو کلام تھیں۔۔ ولید کی دھڑکنوں میں بے قراری تھی۔۔ ابیہا کی دھڑکنیں خوفزدہ تھیں۔۔ وہ دونوں اک دو بے کی بھرپور رفاقت کو محسوس کر رہے تھے۔ یوں جیسے پھر کبھی ملن نہ ہو سکے گا۔ ہجر کی گھڑیوں کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو چکا تھا۔۔ محبت کا کڑا امتحان آن پہنچا تھا۔۔ محبت جو فنا و بقاء کا امتزاج ہے۔۔ جو اسکے امتحان و ثابت قدمی سے جھیل گیا وہ بقاء کو پا گیا اور جو لڑکھڑا گیا وہ غرق ہو گیا۔۔ بے نام و نشان رہ گیا۔۔

ولید حسن اور ابیہا کاظم اس دنیا میں بسنے والے دو عام ترین انسان تھے۔ انکے دلوں میں سانس لیتی اک دو بے کی محبت نے انکو خاص الخاص بنا ڈالا تھا کہ محبت کا اسم تو کونکے کو بھی ہیرا بنا دے۔۔

اسنے اپنی شریک حیات کی پیشانی پر مہر محبت ثبت کی اور اسکی پلکوں پر ٹھہرے شبنمی آنسوؤں کے قطرات کو اپنی پوروں پر سمیٹ کر جانے کے لیے پلٹ گیا۔ اس نے جاتے سے ایکبار بھی مڑ کر نہ دیکھا تھا کہ کہیں اپنے محبوب کی

آنکھوں کی نمی فرض کی راہ کی رکاوٹ نہ بن جائے۔

پھر وہ چلا آیا تھا۔ بیس ہزار فٹ کی بلندی سے شروع ہونے والے دنیا کے دوسرے بلند ترین گلشیر سیاچن پر۔ یہ ایک منجمد دریا ہے جو بلتستان کے ضلع گانچے میں سالتورو نامی گاؤں سے جانے والے راستے سے شمال مغرب کی جانب سے بل کھاتا ہوا جنوب مغرب کی طرف سانپ کی مانند نیچے آتے ہوئے انڈیا کے زیر انتظام وادی نبرا میں ختم ہوتا ہے۔ یہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک متنازع ترین سرحد ہے۔

بنیادی طور پر یہ گلشیر پاکستان کا حصہ ہے اور دنیا کے بہت سے نقشوں میں اسکو پاکستان کا حصہ ہی دکھایا جاتا ہے لیکن 1984 میں بھارت نے اس پر قبضہ کر لیا جس کا مقصد محض پاکستان اور چین کے آپس کے رابطے میں رکاوٹ ڈالنا تھا۔ اور اب سالتورو رنج کے علاوہ بقیہ تمام گلشیر بھارت کے قبضے میں ہے۔ اس علاقے میں گلابی رنگ کے جنگلی پھولوں کی بہتات ہے جن کو بلیتی زبان میں سیاچن کہا جاتا ہے اور اسی کی مناسبت سے اس علاقے کو سیاچن کا نام دیا گیا ہے۔

اس متنازع گلشیر پر بھارتی غاصبانہ قبضے کو لے کر بھارت اور پاکستان کے درمیان کئی مذاکرات اور جھڑپیں ہو چکی ہیں لیکن اب تک یہ مسئلہ جوں کا توں ہے۔ 1999 میں پاکستان اور بھارت کے درمیان اس تنازعے کو لے کر دنیا کا

بلند ترین میدان جنگ کارگل کے مقام پر جما تھا۔ جس میں پاکستان کے بہادر فوجیوں نے کئی جانوں کے نذرانے پیش کیے مگر بد قسمتی سے یہ تنازع پھر بھی حل نہ ہو سکا۔

اس سرد ترین مقام پر موسم گرما میں درجہ حرارت منفی دس جبکہ سردیوں میں منفی ساٹھ تک جا پہنچتا ہے۔ موسم کی شدت اور بلندی کے باعث یہاں تعینات فوجیوں کو سانس لینا تک محال ہوتا ہے۔ سارا سال بر فباری کی وجہ سے اکثر یہاں کھانے پینے کی بنیادی کمک پہنچانا بھی ممکن نہیں رہتا جس کی وجہ سے فوجیوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسکے علاوہ شدید سردی کے باعث یہاں تعینات فوجیوں کے جسمانی اعضاء ناکارہ ہو جانے کے بھی کافی واقعات ہوتے ہیں۔ اس سرد ترین مقام پر پاک آرمی کا ہیڈ کوارٹر گیلاری سیکٹر ولید حسن کا منتظر تھا۔ ستمبر کے ماہ میں بھی یہاں سردی عروج پر تھی۔ ولید کے پہنچنے کے اگلے ہی دن شدت کی بر فباری ہوئی تھی۔ پہلے پہل تو ولید کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ کئی ماہ سے لاہور میں تعینات تھا جس کے باعث وہ اتنی شدید سردی کا عادی نہ رہا تھا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ بے سروسامانی کی اس زندگی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ چوکی پر پہرہ دینے کے ساتھ ساتھ وہ سب ساتھ مل کر خوب باتیں کرتے برف پر ہی باجماعت نمازیں ادا کرتے۔ کسی دن موسم تھوڑا بہتر ہوتا تو رات کے وقت ریڈیو کی سوئی گھماتے اور ریڈیو پاکستان پر جاگتا پاکستان پروگرام سنتے پرانے پاکستانی گانے

سنتے اور اپنے اپنے خاندان کی باتیں کر کے دل بہلاتے۔۔ جس دن نیچے سے کمک آتی اس روز اچھا سا کھانا بنا کر کھایا جاتا۔ ان سب میں ایک سپاہی جو کہ سندھ سے تعلق رکھتا تھا بہت ہی اچھا کھانا بناتا تھا وہ انکو مزے مزے کے کھانے بنا کر کھلاتا وہ الگ بات ہے کہ شدید ٹھنڈ کے باعث مزے دار بریانی بھی ٹھنڈی بد ذائقہ ہی ہو جاتی تھی پر یہ اس زندگی کا اک حسن ہی تھا کہ وہ ٹھنڈی تیخ بوٹیاں اسٹوو پر گرم کی ہوئی پیپسی کے ساتھ کھاتے ہوئے اتنا لطف محسوس کرتے جتنا کسی بہترین دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے سے بھی نہ آسکتا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے دو ماہ ہونے کو تھے۔ ولید اکثر بیٹھ کر حساب لگایا کرتا تھا اور اسکے حساب سے مزید ایک ہفتے تک وہ والد کے عہدے پر فائز ہونے والا تھا۔ دسمبر شروع ہو چکا تھا اور منفی ساٹھ ڈگری درجہ حرارت اور برفانی جھکڑوں سے لڑتے ہوئے وہ سب اپنے اگلوں میں بیٹھے ٹھٹھرتے رہتے۔ انکے کچھ ساتھیوں کو سانس کی شدید تکلیف ہو گئی تھی مگر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ نہ ہونے کے باعث انکو میڈیکل ایڈ دینا بھی ممکن نہ تھا۔ وہ سب مل کر مقدور بھر اپنے ساتھیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ متواتر دو دن سے برف باری ہوئے چلی جا رہی تھی۔ وہ آپس میں باتیں کرتے کرتے بھی بور ہو چکے تھے۔ کھانے پینے کا سامان قریب الختم تھا۔

دو روز بعد برف باری کچھ دیر لے لیے تھمی اور سورج نے اس منجمد رنج پر اپنی حرارت کی بوچھاڑ کی تھی۔ وہ سب اپنے اگلوں سے باہر نکلے۔ انکے ساتھیوں

تھا۔ وہ جیسے فارم میں واپس آگئے تھے۔ انہوں نے وہیں برف پر باجماعت نماز ادا کی۔ ولید اوپر چوکی کی جانب چلا آیا۔ یہاں پر موجود جوان بھی سردی سے تنگ تھے۔ اسنے انکو پیچھے بھیج کر دوسرے جوانوں کو بلوا لیا اور خود دور بین لیکر باہر آ نکلا۔ اسکا رخ بھارت کی جانب تھا اور آنکھوں پر دور بین تھی۔ فوکس بھارتی چوکی تھی جہاں پر اس سے بالکل سکون تھا۔ سردی کی شدت نے سب کو ہی بے حال کر رکھا تھا۔ ہر بار بھارتی چوکی کو تکتے ہوئے ولید کے دل میں شدت سے یہ امنگ جاگتی تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اس چوکی پر سبز ہلالی پرچم لہرائے۔ وہ انہی سوچوں میں گم بھارتی چوکی کو تکتے جا رہا تھا جب بادل پھر سے گھر گھر کر آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے سفید بادلوں نے سارے آسمان کو ڈھک لیا۔ ولید تب چونکا جب برف کے گالے سک سک کرتے آسمان سے گرنے لگے۔ وہ چوکی کی جانب چل دیا۔ اب واپس نیچے جانا تو ممکن نہ رہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ کر جوانوں سے گپ شپ کرنے لگا۔ آج ہیڈ کوارٹر سے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی آیا تھا اسلیے کئی روز بعد ان کو چائے نصیب ہوئی تھی۔ باہر برفباری تیزی سے جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد شام ہونے لگی۔ انہوں نے نماز ادا کی اور پھر رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگے۔ کھانے کے بعد عشاء کی نماز ادا کی اور ولید نے باہر نکل کر موسم کا جائزہ لیا۔ برفباری بہت تیز تھی۔ تاحد نگاہ سفید چادر تنی ہوئی تھی۔ وہ واپس پلٹ آیا۔ آدھی رات کا وقت تھا جب طوفانی جھکڑ چلنے لگے۔ سردی تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ ایک

سپاہی جاوید کو تیز بخار نے آن گھیرا تھا۔ ولید جلد از جلد اسے لے کر نیچے اپنے اگلو تک جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں پر میڈیکل کی کچھ بنیادی سہولیات بہر حال میسر تھیں مگر باہر دو سو کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والے اس برفانی طوفان میں یہ ممکن نہ تھا۔ جاوید کی حالت بگڑ رہی تھی اسکے لیے سانس لینا بھی محال تھا۔ ولید کا اضطراب بڑھنے لگا۔ وہ ایک انیس بیس سالہ جوان تھا جو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ ولید نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور سورہ رحمان کی تلاوت کرنے لگا۔ جاوید سلیپنگ بیگ میں بھی مسلسل سکیپا رہا تھا۔ ولید کی آواز میں اس سے بڑا سوز تھا۔ وہاں موجود باقی سپاہی رونے لگے تھے۔ اور آنسو تو ولید کی آنکھوں سے بھی جاری تھے۔ جاوید کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور وہ سب بے بس تھے۔ یہ قدرت کی عجب ستم ظریفی تھی کہ چوکی پر آسکیجن ماسک بھی ختم ہو چکے تھے۔

سر۔۔ جاوید کی لڑکھڑاتی آواز ولید کی سماعتوں تک پہنچی تو ولید نے تلاوت روک کر اپنا کان اسکے چہرے کے قریب کر دیا۔

بولو جوان۔

سر! میں دشمن سے لڑتے ہوئے مرنا چاہتا ہوں سر۔۔ ایسے نہیں۔۔

تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے جوان یوں ہمت نہ ہارو۔ میں ابھی تمہیں لے کر جاؤں گا نیچے پھر تمہیں طبی امداد ملے گی اور تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے۔ اسنے

نرم لہجے میں جواب دیا تھا۔

سر! مجھے ایسے نہیں مرنا۔ مجھے شہید ہونا ہے۔ وہ مسلسل یہی دہرا رہا تھا۔
اس کی آنکھیں نیم وا تھیں چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ ولید پھر سے سورہ
رحمان کی تلاوت کرنے لگا۔ سب سپاہی بھی شدید مضطرب نظر آرہے تھے۔
باہر برفانی جھکڑ کا زور کم ہونے لگا تھا۔ ولید نے تلاوت مکمل کر کے جاوید کو
ہلایا۔ وہ نیم غنودہ تھا۔

اٹھو جوان سونا نہیں ہے۔۔ اٹھو۔۔ اسنے اسے پکارا۔

پانی۔۔ وہ کراہا۔ ایک سپاہی نے فوراً سے گرما گرم پانی اسکے لبوں سے لگا دیا۔
اسکو سنبھالو میں موسم کے حالات چیک کر کے آتا ہوں۔ وہ کہہ کر اٹھا اور باہر
نکلا۔ جھکڑ اب ختم ہو چکا تھا۔ مگر برف کے ذرات ابھی ابھی فضاء میں اڑ رہے
تھے۔ وہ واپس اندر آیا۔

میں اسے لے کر نیچے جا رہا ہوں۔ اسنے جلدی جلدی تیار ہوتے ہوئے انہیں
بتایا۔

سر موسم ایک بولا۔

موسم ٹھیک ہے۔ اسکو طبی امداد ملنا ناگزیر ہے۔ اس وقت برفباری بھی نہ
ہونے کے برابر ہے اور ہوا بھی ساکت ہے مجھے جانا ہوگا۔ اسنے جاوید کو

سلیپنگ بیگ سمیت ہی اپنی پشت پر لا د لیا۔ دو سپاہیوں نے اسے اسکی پشت پر کس دیا۔ جاوید ایک منحنی سا لڑکا تھا مگر کپڑوں کا بوجھ اور اس بوجھ کے ساتھ برف پر چل کر چار پانچ میٹر نیچے کی جانب سفر کرنا کچھ آسان نہ تھا مگر ولید کے دماغ میں بس ایک ہی خیال تھا کہ اس نے اس لڑکے کو یوں ایڑیاں رگڑ کر مرنے نہیں دینا۔ سو وہ چل پڑا تھا۔ رات ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ برف سے ڈھکے پہاڑ اس سے بہت پر اسرار لگ رہے تھے۔ ولید ایک ہاتھ میں اسٹک تھامے قدم جما جما کر راستے کا تعین کر رہا تھا۔ سمت کا تعین کر رہا تھا۔ اندھیرا بہت گہرا تھا آسمان پر سفید بادلوں کا راج تھا۔ برفباری بند تھی ہوا بھی ساکت تھی۔ اور سردی جیسے بدن کو چیر رہی تھی۔ ولید اندھیرے میں برف کے اس سمندر میں ادھر سے ادھر سر مارتا پھر رہا تھا۔ اسکی پشت پر لدا جاوید بے سدھ ہو رہا تھا۔ ولید جانتا تھا کہ اگر وہ سو گیا تو پھر کبھی نہ اٹھے گا اسلیے گاہے بگاہے اسے آوازیں بھی دیتا رہتا۔ جاوید کراہ رہا تھا۔ دو گھنٹوں کی محنت کے بعد وہ اسے لے کر اپنے اگلو تک پہنچ گیا تھا۔ جاوید تب تک قریب المرگ ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے اسے آکسیجن ماسک لگایا گیا اور طبی امداد دی جانے لگی۔ صبح ہوتے ہوتے جاوید کی حالت کچھ سنبھل گئی تھی۔ ولید سمیت ان سب نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ برفباری بہت تیزی سے جاری تھی۔ شام ہوتے ہوتے وائر لیس پر اشارہ موصول ہوا۔ چوکی سے خبر ملی کہ بھارتی چوکی کی جانب سے وقفے وقفے سے فائرنگ کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ اور چوکی پر

کارتوسوں کی کمی ہو گئی ہے۔ ولید نے دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور وہ لوگ اسلحہ جات کے علاوہ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی اپنی اپنی پشت پر لاد کر چل پڑے۔ تب برفباری کم ہو چکی تھی۔ وہ تیزی سے اوپر کی طرف جارہے تھے۔ ابھی آدھا راستہ بھی طے نہ کر پائے تھے کہ برفباری پھر سے شروع ہو گئی اور تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ اندھیرا بھی دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد انکے لیے چلنا محال ہو گیا۔ ہوا کچھ ایسی رفتار سے چل رہی تھی کہ یوں لگتا وہ زیادہ دیر قدم جما کر کھڑے نہ رہ پائیں گے۔ انکو اپنے لیے کسی ٹھکانے کا انتظام کرنا جہاں وہ آرام سے بیٹھ کر طوفان تھمنے کا انتظار کر سکیں۔ انہوں نے اپنے خیمے گاڑنے چاہے مگر ہواؤں کی پورش انہیں اڑا لے گئی۔ برف کا طوفان آچکا تھا۔ ہر سو سفید ذرات اڑ رہے تھے۔ ان تینوں نے اک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دے لیے تاکہ ساتھ ساتھ رہیں مگر وہ کوئی عام سا طوفان نہ تھا۔ وہ سیاچن کا طوفان تھا۔ دنیا کے دوسرے بلند ترین گلیشیر پر آنے والا برف کا طوفان۔ دو سو کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ہوا تو مضبوط گھروں کو بھی اڑا لے جائے ایک معمولی سے انسان کی کیا بساط۔ انکے قدم جلد ہی اکھڑ گئے تھے۔ ولید کے ہاتھ میں دبا اپنے ساتھی کا ہاتھ چھوٹا اور وہ کسی گیند کی مانند نشیب میں لڑکھنے لگا برف اسکے پورے وجود کو سن کر رہی تھی وہ بے بسی کی آخری حدوں پر تھا۔ اسکا ذہن بھی سن ہونے لگا تھا۔ اسنے دل ہی دل میں کلمہ پڑھ لیا زبان تو جیسے منجمد ہو چکی تھی۔ آخری احساس جو اسے

ہوا تھا وہ موت کی سی ٹھنڈک کا تھا۔ ولید حسن کے ذہن کے پردے پر
آخری چہرہ ابہا کا ابھرا تھا اور پھر تاریکی۔۔ گہری تاریکی۔۔



زندگی اک ناقابل فہم سفر ہے۔۔

اس سفر میں انسان کے ساتھ بعض اوقات ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ اسے
خود اپنے وجود پر ہی یقین نہیں آتا۔

ولید کو بھی اپنے زندہ ہونے پر یقین نہ آیا تھا۔ وہ تو اپنے تئیں اپنی زندگی کے
آخری لمحات گزار چکا تھا مگر دوبارہ آنکھ کھلنے پر خود کو اپنے جیسے گوشت پوست
کے انسانوں میں ہی پا کر اسے از حد تعجب ہوا تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ چندھائی
آنکھوں اور سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ اپنے ارد گرد گھومتے پھرتے

انسانی ہجوم کو تکتا رہا تھا۔ پھر جب دھیرے دھیرے شعور جاگا تو سب سے
پہلا احساس پورے بدن میں اٹھتی درد کی شدید ٹیسوں کا ہوا تھا۔ یوں محسوس
ہوتا جیسے سارے جسم میں سوئیاں چبھوئی جارہی تھیں۔ ذہن تھوڑا اور صاف
ہوا تو ارد گرد اٹھی دیواروں اور سفید اوور آل میں مستعدی سے ادھر سے ادھر
پھرتے ڈاکٹرز دکھائی دیئے اور اسے یہ سمجھ لینے میں لمحہ ہی لگا تھا کہ وہ کسی
ہسپتال کے نرم و گرم بستر پر پڑا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اس نئی زندگی
پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ تبھی ڈاکٹرز کی ایک ٹیم اسکی جانب متوجہ ہو گئی۔ ولید کی

آنکھوں نے ان کے چہروں کے نقوش میں مانوسیت کے باوجود کچھ غیر مانوسیت پائی مگر پہلے پہل وہ نظر انداز کر گیا۔

ہوش آگیا ہے۔ ایک نرس بولی۔

ہاں۔ بھگوان جانے اب اسکی یادداشت ٹھیک ہے یا نہیں۔ دوسری نرس کی بات پر وہ بے طرح چونکا۔ بھگوان جانے۔۔۔ بھگوان جانے۔۔۔ اسکا ذہن تیزی سے گردان کرنے لگا۔ تو کیا۔۔۔ اسکے دماغ میں ایک زوردار جھماکا ہوا۔ تو کیا وہ بھارت میں۔۔۔ اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکا تھا کیونکہ ڈاکٹر نے اسے مخاطب کیا تھا۔ ولید نے نا سمجھی کے عالم میں اسکی طرف دیکھا۔ وہ اسے بولنے پر اکسا رہا تھا مگر وہ کچھ نہ بولا بس اسکے الفاظ و لہجے پر غور کرتا رہا۔ ساتھ ہی اسکا ذہن یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ ان سب کے چہروں کے نقوش مانوس ہونے کے باوجود کچھ الگ کیوں لگے تھے اسے۔ ان سب کے چہروں پر چھائی عجیب سی مردنی انہیں پاکستانیوں سے الگ کرتی تھی۔ اور بھارتیوں کے چہرے تو دور سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ کفر و شرک کے باعث مرجھائے ہوئے بے کش چہرے۔ ولید کو قسمت کی ستم ظریفی پر رونا آیا تھا۔ وہ دیو سے بچ کر سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ اور ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

پھر اگلے کچھ دنوں میں اس پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ اسکے دونوں پاؤں

برف میں دبے رہنے کی وجہ سے کافی ڈیہج ہوئے ہیں مگر یہ قدرت کا احسان ہی تھا کہ اسکے پورے جسم پر کوئی بھی میجر فریکچر نہیں آیا تھا۔ اسے مناسب طبی امداد دی جا رہی تھی۔ اور دن بہ دن وہ روبہ صحت ہو رہا تھا۔ مگر ولید نے اب تک اپنی زبان نہ کھولی تھی۔ وہ یہی پوز کر رہا تھا کہ اس حادثے نے اسکے ذہن کو متاثر کیا ہے اور وہ اب تک شک کے زیر اثر ہے۔ اسکا دماغ سارا سارا دن اس ہسپتال سے بھاگ نکلنے کی تدابیر سوچا کرتا مگر زخمی وجود کیساتھ جا بھی کہاں سکتا تھا۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔ ویسے یہ اس کا ذاتی اندازہ تھا کہ وہ وادی نبرا میں ہے۔

باقی واللہ العلم۔

اسے مکمل صحتیاب ہونے میں تین ماہ لگے تھے اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ جس دن ڈاکٹر نے اسکی اوکے کی رپورٹ فائل کی اسی روز شام کے وقت بھارتی ملٹری کے آفیسر آہنچے تھے۔ انکے چہروں پر کرختگی تھی۔

کیپٹن ولید حسن! ان میں سے ایک آفیسر جس کے شانوں پر کرنل کی نشانیاں تھیں نے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ وہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ بری طرح چونکا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔

تمہیں تعجب ہو رہا ہوگا ناں کہ ہم تمہارا نام کیسے جانتے ہیں۔ وہ شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

یہ تمہارا شناخت نامہ تمہارے کپڑوں سے برآمد ہوا ہے۔ تم نے اچھا طریقہ نکالا ہمارے دیش میں آکر جاسوسی کرنے کا مگر تم چوک گئے۔ بھلا جاسوسی کے لیے آتے ہوئے اپنا شناخت نامہ کون ساتھ لاتا ہے۔ وہ کسی خزانٹ پولیس آفیسر کی طرح بول رہا تھا۔ ولید اب بھی کچھ نہ بولا۔

تم کچھ نہیں بولو گے۔۔ مگر ہمیں زبان کھلوانی آتی ہے۔ ابھی تم کچھ دن اور عیش کرلو۔ پھر تو تمہیں جیل میں چکی ہی پیسنی ہے۔ پاکستانی مسلے تمہیں بھارت ماتا میں جاسوسی کرنے کا صلہ ضرور ملے گا۔ چلو آفیسرز اسکے منہ پر کپڑا ڈالو۔ اس نے اپنے ساتھی آفیسرز کو ہدایت جاری کی۔ اور وہ ولید کی طرف بڑھے۔ یہ ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع نہیں تھا۔ اس لیے اس نے چپ چاپ ہاتھ پیر بندھوا لیے۔ انہوں نے اسکے چہرے کو سیاہ غلاف سے ڈھانک دیا اور اسے بازو سے تھام کر ساتھ لیے چلتے گئے۔ ولید اندھوں کی طرح تن بہ تقدیر ہوا چل رہا تھا۔ اسے کسی گاڑی میں بٹھایا گیا تھا ایک طویل سفر کے بعد اسکی آنکھوں سے پٹی کھولی گئی۔ ولید نے خود کو ایک چھوٹے سے کمرے میں پایا جس میں صرف ایک زرد بلب روشن تھا اور ایک کرسی رکھی تھی۔ ولید کو اس کرسی پر رسیوں سے جکڑ دیا گیا۔ اس کے عین سر پر جھولتے زرد رنگ کے بلب کی روشنی اسکے اعصاب پر گراں گزر رہی تھی۔ ولید نے آنکھیں بند کر لیں۔

کیپٹن ولید حسن! ایک کرخت آواز کمرے کی محدود فضا میں گونجی۔ ولید نے

دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ وہی آفیسر اسکے عین سامنے کھڑا تھا۔ کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے۔

آپ اپنے یہاں آنے کے مقصد پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے۔

میں اپنی مرضی سے نہیں آیا۔ ولید نے بے خوفی سے جواب دیا۔ آفیسر نے ایک طویل قہقہہ لگایا یوں جیسے ولید نے اسے لطیفہ سنایا ہو۔

انٹر سٹنگ۔ پھر کس کی مرضی سے آئے ہو ہمارے دیش میں۔

اللہ کی مرضی اپنے پیروں پر چل کر تو نہیں آیا۔ برفانی جھکڑ ادھر لے آیا تو میں کیا کروں۔ اسنے لاپرواہی سے جواب دیا۔

ہوں۔ آفیسر نے ہنکارا بھرا اور پلٹ کر ایک چکر لگایا پھر واپس پلٹا اور لب بھیج کر ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا۔ ولید کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہتک اور غصے سے۔

تمہیں کیا لگتا ہے تم یہ جھوٹی کہانی سناؤ گے اور میں وشواس کر لوں گا۔ ادھر دیکھو میری طرف پاکستانی کتے میں کرنل ماتھر چوہدری ہوں بھارت ماتا کا بہادر سپوت دیش سیوک۔ میں نے تم جیسے کتوں سے اپنی دھرتی پاک کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اسنے ٹھوڑی سے اسکا چہرہ پکڑ کر سخت لہجے میں کہا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے ایک حادثہ اس طرف لایا ہے میرے ارادے کو

اسمیں دخل نہیں تمہیں یقین کرنا ہے تو کرو نہیں کرنا تو تمہاری مرضی۔ اسنے بیزاری سے جواب دیا۔ جواباً کرنل ماتھر نے پے در پے اسکے منہ پر تھپڑوں کی برسات کردی۔ جب تھک گیا تو اسکے منہ پر تھوک کر کمرے سے چلا گیا۔ ولید بے بسی کی انتہا پر تھا۔ اپنے چہرے پر ٹھہرے اس بھارتی کے تھوک کے قطرے صاف کرنے سے بھی قاصر۔ وہ دل ہی دل میں اللہ سے دعائیں مانگنے لگا تھا۔ اسے ملک کے لیے اس سے بھی زیادہ برداشت کرنا تھا۔



سچ سچ بتادو تمہیں یہاں کس مشن پر بھیجا گیا ہے۔ آج ایک نیا چہرہ اسکے سامنے تھا۔ ولید نے اسکے سینے پر لگا بیج دیکھا۔ میجر موہن سنگھ میں بتا چکا ہوں۔ اسنے جواب دیا۔

دیکھو جو کہانی تم نے سنائی ہے وہ بہت ہی پٹی پٹائی کہانی ہے اس پر کوئی بھی وشواس نہیں کر سکتا۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں تم مجھے سچ بتادو گے تو میں تمہاری رہائی کے متعلق غور کرونگا۔ وہ نرم لہجے میں کہہ رہا تھا اور ولید جانتا تھا کہ یہ نرم لہجہ بھی ایک چال ہے۔

میرے پاس دوسرا کوئی بیان نہیں۔ اسنے خشک لہجے میں جواب دیا۔ موہن سنگھ کے چہرے پر ناقابل فہم سے تاثرات ابھرے۔

دیکھو میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ مجھے سچ بتادو۔ اس نے پھر اسے قائل کرنا چاہا۔

شکریہ مگر مجھے تمہاری ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاؤ جو کرنا ہے کرلو پاکستانی کسی سے ڈرتے نہیں۔ ولید کا لہجہ اسے تپانے کو کافی تھا اسنے بلند آواز میں سپاہیوں کو اندر بلایا اور ولید کی اچھی طرح دھلائی کرنے کا حکم دے ڈالا۔ اسکے بعد یہ سلسلہ چل نکلا تھا۔ وہ ولید سے یہ اعتراف کروانا چاہتے تھے کہ وہ پاکستانی جاسوس ہے مگر وہ یہ اعتراف کیسے کر لیتا جب اسمیں کوئی سچائی ہی نہیں تھی۔ ٹارچر کی انتہا کے باوجود بھی جب ولید سے کوئی اور بیان سننے کو نہ ملا تو اسکا کیس کورٹ کو ریفر کر دیا گیا۔ چھ ماہ کیس چلا اور پھر اچانک سماعتوں میں طویل وقفہ آنے لگا اور ہوتے ہوتے یہ سلسلہ بالکل ہی موقوف ہو گیا۔ ولید کو جیل کی سلاخوں میں بند کر دیا گیا۔ اس دوران اسے مختلف جگہوں پر شفٹ بھی کیا گیا مگر ہر بار اسے جیل خانے سے ہی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا جاتا اور آنکھوں سے پٹی اترنے پر وہ خود کو جیل میں ہی پاتا تھا۔ وہ جیلیں بھی عجیب تھیں۔ ان میں رہنے والے قیدیوں کو کبھی آسمان دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا۔ بڑے بڑے سیاہ پتھروں سے بنے چھوٹے چھوٹے کمرے۔ ہر ایک کمرے میں بس ایک ہی قیدی ہوتا تھا۔ وہاں سورج کی رسائی نہ تھی۔ دن میں دو وقت کھانا اندر کھسکا دیا جاتا۔ کھانا بھی کیا ہوتا۔ بدبودار پتلی دال اور سوکھی روٹی۔۔ ولید اس دال کو تو کبھی حلق سے اتار نہ پاتا تھا بس پانی میں روٹی ڈبو ڈبو کر کھا لیتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا۔ وہ وقت کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ بس ایک اندازے کے مطابق اسے جیل میں بند ہوئے چار سال ہو چکے تھے۔ اب

اس پر تشدد بھی کم ہو چکا تھا اور کیس کی سماعتیں تو کب کی قصہء پارینہ ہو چکی تھیں۔ اس محدود سی اندھیر نگری میں ولید کے شب و روز بے مقصد گزر رہے تھے۔ اسے واپسی کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ اس اندھیر نگر میں اکثر تب روشنی پھیل جاتی جب وہ آنکھیں بند کر کے ماضی کی یادوں میں کھو جاتا۔ وہ چمکیلے دن جب زندگی مسکراتی تھی۔ وہ ممی کی محبت۔۔۔ روحی کی شرارتیں۔۔۔ سکندر بھیا کی پیار بھری ڈانٹ۔۔۔ دوست احباب۔۔۔ اور ایہا کی قلیل مگر چاہتوں سے پر رفاقت۔ ولید جب جب ان سب کو سوچتا تو اسکے دل میں اک امید تر و تازہ ہونے لگتی۔۔۔ اپنے پیاروں کو پھر سے ملنے کی خواہش اسکے رگ و جاں میں زندگی دوڑا دیتی اور وہ پھر سے تازہ دم ہو جاتا۔ وہ اکثر جیل کی دیوار سے جھڑنے والی چھوٹے چھوٹے پتھروں سے وہیں دیواروں پر لکیریں لگا کر دنوں کا حساب لگاتا۔۔۔ اپنے بچے کی عمر کا حساب لگاتا۔۔۔ وہ اکثر سوچتا کہ جانے وہ بیٹی کا باپ بنا ہے یا بیٹے کا۔۔۔ وہ اسکو

imagine

کرنے کی کوشش کرتا۔۔۔ ننھا سا گلابی وجود تھوڑا اس جیسا تھوڑا ایہا جیسا۔۔۔ اسکا پہلا قدم پہلا لفظ پہلا جملہ۔۔۔ وہ کھو جاتا۔۔۔ ان تاریک دنوں میں اس نے اپنے لیے ایک خیالی دنیا بسالی تھی جس میں وہ ایہا اور اسکا بچہ اور سب گھروالے بالکل خوش باش زندگی گزارتے تھے جہاں غم کا سایہ بھی نہ تھا جدائی کا کوئی گھاؤ نہ تھا۔۔۔ اسے ہر گھڑی ایہا کی یاد ستاتی۔۔۔ وہ اسکے بغیر کتنی

اداس کتنی بے چین رہتی ہوگی۔۔ روحینہ نے بھی تو امریکہ چلے جانا تھا اسکے جانے کے بعد ابیہا کس سے اپنے دل کی باتیں کہتی ہوگی۔۔ اور اپنے بچے کی زندگی کے ایک ایک خاص لمحے میں اس نے ولید کی کمی کتنی محسوس کی ہوگی۔ وہ سوچتا اور ملول ہو جاتا۔ اسکی اپنے اللہ سے دن رات بس ایک ہی دعا تھی کہ جلد یا بدیر وہ اپنی پاک دھرتی پر دوبارہ قدم ضرور رکھے وہ بھارت میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی آخری سانس اپنے وطن کی سرزمین پر لینا چاہتا تھا



بادل زور سے گرجے تو وہ دونوں چونکے۔ آسمان پھر سے سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا تھا اور بارش کی موٹی موٹی بوندیں کچے آنگن کو گیلانے لگی تھیں۔ شردہا نے اپنے ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے گلاس کی طرف دیکھا جس میں پڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اور ٹھنڈی تو ولید کی چائے بھی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں اب تک کچن کی چھوٹی سے دیوار پر ہی بیٹھے تھے۔

پھر تم وہاں سے نکلے کیسے؟ شردہا نے چند لمحوں بعد سکوت توڑا۔ ولید نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔

قسمت کے پھیر بڑے عجیب ہوتے ہیں شردہا۔ جب اس جیل سے رہائی کی خواہش عروج پر تھی تب مجھے موقع نہ ملا اور جب میں بقول شاعر صیاد سے

مانوس ہو گیا تو ایک روز مجھے بھاگ نکلنے کا چانس مل گیا۔ وہ زخمی سی مسکراہٹ کیساتھ بولا۔

مگر کیسے؟

شروع شروع میں مجھے بار بار ایک سے دوسری جیل میں منتقل کیا جاتا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم گیا۔ چار سالوں سے میں ایک ہی جیل میں تھا۔ جب ایک دن اچانک مجھے جیل سے نکالا گیا میری آنکھوں پر پٹی نہ تھی۔ اور تم یقین کر سکو گی کہ میں نے قریب سات سالوں بعد آسمان دیکھا تھا۔ سات سالوں بعد شردہا۔ وہ رک گیا۔ شردہا نے ایک جھرجھری سی لی۔ اسے اپنی زندگی بھگوان کی نعمت لگی تھی۔

مجھے ایک پولیس وین میں بٹھایا گیا اور دو اہلکار میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ وین چل پڑی۔ میرا دل مسرتوں سے جھوم رہا تھا۔ امید لوٹ آئی تھی۔ گوکہ مجھے علم نہ تھا کہ میں کس علاقے میں ہوں مگر میرا دماغ بار بار کہہ رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ نکلے تو اپنے وطن پہنچنے کا راستہ بھی نکل ہی آئے گا۔ قسمت یاور تھی کہ شام کے قریب اچانک وین کا انجن آواز دینے لگا اور بالآخر وین رک گئی۔ اور جھٹکے لے لے کر رکی تھی جس کا مطلب تھا کہ پٹرول بھی ختم تھا۔ میرے ارد گرد بیٹھے اہلکاروں نے پہلے کھڑکی سے منہ باہر نکال کر وجہ پوچھی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ انجن بہت گرم ہو گیا ہے اور پٹرول بھی ختم ہے۔

مگر اس نے بتایا کہ پٹرول کے گیلن تو اسکے پاس موجود ہیں پانی کے لیے اسے قریبی نالے تک جانا پڑے گا۔ میرے ساتھ بیٹھے اہلکار وین سے اتر گئے۔ وہ دروازہ لاک کرنا بھول گئے تھے۔ میں نے باہر جھانکا۔ گاڑی ایک سنسان کچی سڑک پر کھڑی تھی اونچے اونچے پہاڑ دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سڑک کے دائیں جانب ایک پل تھا اور پانی بہنے کی مترنم آواز مسلسل آرہی تھی۔ ڈرائیور پانی لینے نشیب میں اتر گیا تھا۔ اور بقیہ دونوں اہلکار لاپرواہی سے ذرا فاصلے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ جانے کیوں وہ میری طرف سے لاپرواہ ہو گئے تھے۔ میں بناء کھٹکے وین سے اتر اور جلدی سے زمین پر بیٹھ کر وین کی اوٹ میں ہو گیا۔ میرے سامنے دو راستے تھے یا تو میں اٹھ کر سرپٹ بھاگنے لگوں یا پھر پل سے نیچے چھلانگ لگا کر تیرتے ہوئے کہیں پہنچنے کی کوشش کروں۔ دونوں ہی صورتوں میں موت کا احتمال تھا مگر مجھے رسک تو لینا ہی تھا سو میں لیٹے ہی لیٹے پل کی جانب کھسکنے لگا۔

ارے وہ کہاں گیا۔ ایک اہلکار کی تیز چیخ جیسی آواز سن کر میں جلدی سے کنارے کنارے اگی جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا۔

بھاگ گیا۔ اوئے بھاگ گیا وہ۔ وہ اب شور مچا رہے تھے۔

ابے تو جاکر ڈھونڈو ناں زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔

میرے لیے کڑے امتحان کا لمحہ تھا۔ میں اوٹ سے انکو دیکھ رہا تھا جو ادھر سے

ادھر بھاگتے ہوئے مجھے تلاش کر رہے تھے جانے کیوں کسی کا دھیان پل کی جانب نہ گیا تھا۔ میں دم سادھے بیٹھا تھا۔

ابے اگر وہ نہ ملا تو ہماری گردنیں کاٹ دی جائیں گی۔ پاکستانی جاسوس ہے وہ۔ وہ بہت پریشان ہو رہے تھے۔ اسی اثناء میں انکا ڈرائیور بھی واپس آگیا۔

ارے اس طرف دیکھیں ناں۔ وہ بولا اور پھر میں نے اسکو پل کی جانب آتے دیکھا۔ مجھے تلاش کر لینا اب مشکل نہ تھا اسکی نظر مجھ پر پڑ ہی گئی تھی۔

اوائے یہ ہے وہ۔ وہ چلایا۔ وہ دونوں بھی بھاگتے ہوئے ادھر ہی چلے آئے مجھے پتہ تھا کہ اب موت بالکل سامنے ہے سو میں جھاڑیوں میں سے اچھل کر بھاگا اور نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ پل سے نیچے چھلانگ لگادی۔ میں بہت تیزی بہاؤ والے نالے میں گرا تھا۔ اوپر سے گولیاں چلائی گئیں ایک تو پانی کا بہاؤ اوپر سے

گولیوں کا وار مجھے اپنے پیر میں آگ کا گولا گھستا محسوس ہوا اور پھر میرے اوسان خطا ہوتے گئے۔ جب آنکھ کھلی تو خود کو ادھر پایا تمہارے گھر۔ ولید کی کتھا ختم ہو چکی تھی۔ کچھ دیر ان دونوں کے درمیان گہری چپ حائل رہی۔ تیز بارش کی ٹپ ٹپ اور بادلوں کی گھن گرج کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی۔

مجھے بار بار زندگی دی گئی یہ اللہ کا احسان ہے اور مجھے یقین کامل ہو چلا ہے کہ میں اپنے ملک واپس ضرور جاؤنگا۔

ہاں تم جاؤ گے۔ شردہا نے اسکی تائید کی۔

تم لوگ بہت اچھے ہو میں تم دونوں کا احسان مند ہوں۔ میں پاکستان جا کر بھی
تم دونوں کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

ایہا کو بھی بتانا ہمارا۔ شردہا مدھم سا مسکرائی۔

ہاں ضرور بتاؤنگا۔ اور وہ بہت خوش ہوگی تم لوگوں کے متعلق جان کر۔ اسکا
دل بہت پیارا ہے محبتوں سے بھرا۔ وہ بڑی پیاری سی مسکراہٹ ہونٹوں پر
سجائے کہہ رہا تھا۔ شردہا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ولید حسن کے چہرے پر ایہا کا
نام کیسی چمک لے آتا تھا۔ اسے ایہا کی قسمت پر رشک آیا۔

تم جا کر آرام کرو اب۔ ولید نے چند لمحوں بعد کہا۔
ٹھیک ہے۔ آج شیتل دی دی کی مہندی ہے تو کھانا وہاں سے آجائے گا۔ تم
بھی آرام کرو۔ وہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ولید کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا
مگر جب سردی بڑھنے لگی تو اپنے کمرے میں جا کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔



چاند کو دیکھ کر تمہارے من میں کیا خیال آتا ہے شردہا اس سے مخاطب تھی۔
میرے ذہن میں ایہا کا خیال آتا ہے چاند کو دیکھ کر۔ اسنے جواب دیا۔
وہ بہت سندر ہے کیا؟ شردہا کی آنکھوں میں تجسس تھا۔
مجھے تو لگتی ہے۔

مجھ سے بھی زیادہ سندر ہے۔

تم سے زیادہ۔۔ حقیقت پسندی سے کہوں تو نہیں۔۔ وہ تم جتنی حسین نہیں ہے۔ ولید نے صاف گوئی سے کہا تبھی دروازے پر آہٹ ہوئی اور شکر داس کھنکھارتا ہوا اندر آیا۔ وہ دونوں اس وقت کچے صحن میں بیٹھے تھے۔

شردہا تو تیار نہیں ہوئی ابھی تک۔ شیتل کے بیاہ میں جانا ہے۔ اس نے آتے ہی شردہا کو مخاطب کیا۔

میں نے نہیں جانا باپو۔ میرا جی اچھا نہیں۔ اسنے بہانہ گھڑا۔
 بیٹا تیرے سسرال کا معاملہ ہے چل شاباش تیار ہو جا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آ جانا۔
 Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews
 باپو مجھے نہیں جانا بس۔

سب باتیں بنائیں گے شردہا۔ چل اٹھ جا۔

بناتے رہیں باتیں مجھے نہیں پرواہ۔ میں نہیں جاؤنگی تو چلا جا۔ وہ قطیعت سے کہتی کمرے میں چلی گئی۔ شکر داس اسکے پیچھے پیچھے آیا۔

بیکار میں ضد مت کر چل تیار ہو جا۔

باپو مجھے نہیں جانا بس۔

بکواس مت کر۔ اٹھ تیار ہو میں مندر سے آتا ہوں تب تک تو مجھے تیار ملے

کوئی بہانہ نہیں سننا میں نے بے کار میں میرا تماشہ مت بنا۔ شکر داس نے سخت لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ شردہا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ پلٹ کر زنگ آلود ٹرنک سے کپڑے نکالنے لگی۔ سفید رنگ کی ساڑھی پہن کر اس نے بالوں کو سلجھا کر جوڑے میں لپیٹا اور زیور پہننے لگی اسکی آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔ اپنی بے بسی پر رونا آرہا تھا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی وہ چونکی۔

آجاؤ۔ اسنے اجازت دی ولید اندر داخل ہوا۔

تم جارہی ہو شیتل کی شادی میں۔ اس نے پوچھا۔

ہاں۔ اس نے روئے روئے لہجے میں جواب دیا۔

نہیں جانا چاہتی تو بول دو ناں اپنے باپ کو۔

جیسے میں نے تو کہا ہی نہیں۔

اسکو سچ بتا دونوں۔

زندہ جلا دے گا مجھے۔

باپ ہے وہ شردہا۔

بیٹی کا باپ ہے۔۔ اور بیٹی تو ہوتی ہی اسلیے ہے کہ اسے جلا دیا جائے یا زمین میں گاڑ دیا جائے۔ وہ ماتھا پیٹی سجاتے ہوئے جواب دے رہی تھی سبز آنکھوں

سے بہتے آنسو انکے حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔

ایسا نہیں ہے شردہا۔ بیٹی تو رحمت ہوتی ہے۔

تمہارے یہاں ہوتی ہوگی ہمارے یہاں تو بوجھ ہوتی ہے۔

اچھا تم روؤ مت۔

رونے پر ہی تو اختیار ہے میرا۔

شردہا خود کو مضبوط بناؤ۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے گا انشاء اللہ۔ اسنے نرم لہجے میں کہا تو شردہا اسکی جانب پلٹی۔

مگر میں تو اسکو مانتی ہی نہیں پھر وہ میری رکھشا کیوں کرے گا۔

وہ سب کی حفاظت کرتا ہے چاہے کوئی اسے مانے چاہے نہ مانے۔

لیکن کیوں؟

کیونکہ وہ اپنے ہر بندے سے ستر ماؤں جیسا پیار کرتا ہے۔

سب سے۔۔

ہاں سب سے۔

مگر وہ تو مسلوں کا اللہ ہے ہندو جاتی کا تو نہیں۔

وہ رب العالمین ہے جانتی ہو رب العالمین کا مطلب کیا ہے۔
نہیں۔

رب العالمین کا مطلب ہے تمام جہانوں کا رب صرف اس دنیا کا نہیں بلکہ
پوری کائنات کا زمین آسمان چرند پرند ہر مخلوق کا رب۔

تو پھر مسئلے اسکو صرف اپنا کیوں کہتے ہیں؟

مسلمان اسکو واحد و یکتا مانتے ہیں اسکے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اسلیے
اس کو اپنا کہتے ہیں تم بھی اسکو واحد و یکتا مان لو تو تم بھی اسکو صرف اپنا کہنے
لگو گی۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afegan | Articles | Books | Poetry | Interviews

مجھے تو اسکا پتہ ہی نہیں۔ وہ معصومیت سے بولی۔
تعجب ہے تم اسکو نہیں جانتی جو تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ وہ سر
ہلا کر بولا اور کمرے سے نکل گیا۔ شردہا اسکے الفاظ کے فسوں میں گھری کھڑی
رہ گئی تھی۔



اما۔۔۔ اما

جی بیٹا ادھر ہوں۔۔

ارے اما آپ کیا کارنر میں چھپی بیٹھی ہوتی ہوں۔ سارے گھر میں ڈھونڈنا پڑتا

ہے آپکو۔

آپکو تو پتہ ہے بیٹا مجھے ادھر سکون ملتا ہے۔

اما ادھر دیکھیں میری طرف۔۔

جی میری جان۔

آپ رو رہی تھیں؟

نہیں۔۔ نہیں تو میں کیوں روؤں گی۔

جھوٹ مت بولیں۔ آپ رو رہی تھیں آئی نو۔ اور یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔۔۔ اوہ بابا کی پکچر۔ اما آپ اس تصویر کو دیکھ کر روتی کیوں ہیں؟

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

یونہی آنکھیں بھر آتی ہیں بیٹا۔

اما آپ بابا کو بہت مس کرتی ہیں ناں؟

ہاں بیٹا بہت زیادہ۔

آپ تو کہتی ہیں میں بابا جیسا ہوں تو پھر آپ مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوتیں کیا؟

تمہی تو میرے جینے کا سہارا ہو میری جان اگر تم نہ ہوتے تو میں سات سال پہلے ہی مر گئی ہوتی۔

ماما آپ مرنے کی باتیں نہ کیا کریں۔ اور میں آپکو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤنگا
میں فوجی نہیں بنوں گا۔

نہیں بیٹا تم نے فوجی ہی بننا ہے اپنے بابا کی طرح اپنے وطن کی حفاظت کرنی
ہے۔

مگر ماما میں آپکو اکیلے چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں۔

میں اکیلی رہ لوں گی بیٹا بس میرے لیے یہ بہت فخر کی بات ہوگی کہ میرا بیٹا
ایک بہادر فوجی ہے۔

چلیں ماما جیسی آپکی مرضی۔

شاباش۔ چلو اب منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا لگواتی ہوں۔

اوکے ماما اور پلیز اب رونا نہیں آپ نے۔

اب نہیں روؤں گی تم جاؤ فریش ہو کر آجاؤ۔

اوکے ماما۔



تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلو ادھر اکیلے کیا کرو گے۔ شکر داس نے جاتے سمے
اسے بھی آفر کردی تھی۔ شردہا سفید رنگ کی ساڑھی میں زیورات سے سچی
تھی مگر اسکا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اسنے نظریں اٹھا کر ولید کی طرف دیکھا اسکی

آنکھیں جیسے بھیک مانگ رہی تھیں۔

میں۔۔۔ مگر میں جا کر کیا کرونگا اور مجھے وہاں کوئی جانتا بھی تو نہیں۔

ارے میں سب کو کہہ دوں گا کہ تم میری دور پار کی بہن کے بیٹے ہوتے ہو اور تمہارا نام۔

ادھارک۔۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی شردہا بول پڑی۔ ولید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

واہ بہت ہی سندر نام ہے تمہارا۔ شکر داس معترف ہوا۔ ولید کے فرشتوں کو بھی اس نام کا مطلب معلوم نہ تھا مگر وہ چپ چاپ سر ہلا گیا۔

بس تو ادھارک تم میرے بھتیجے بن کر چلے چلو۔ اتنے دنوں سے گھر میں بند ہو تمہارا سہ بھی اچھا گزر جائے گا۔ شکر داس اس سے بہت خوش تھا۔ ولید نے شردہا کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ وہ اس التجا کو ٹھکرا نہ سکا تھا اور جانے کو تیار ہو گیا۔ رام ناتھ کا گھر کچھ ہی دوری پر واقع تھا۔ وہاں پہنچ کر ولید کو اندازہ ہوا کہ رام ناتھ کا گھر انہ سارے گاؤں میں سب سے زیادہ مالدار تھا۔ گھر کی سجاوٹ اور شادی کے سب انتظامات اس چھوٹے سے پسماندہ گاؤں کے حساب سے شاندار تھے۔ یہ ایک مخلوط تقریب تھی۔ شادی کا منڈپ گھر کے باہر ٹینٹ لگا کر سجایا گیا تھا۔ مہمانوں کی کافی بڑی تعداد موجود تھی۔ ابھی بارات نہ آئی تھی۔ شکر داس نے وہاں پہنچ کر رام ناتھ کے ماں

باپ سے ولید کا تعارف کروایا پھر وہ تو منڈپ کے انتظامات دیکھنے لگا جبکہ شردہا اسے لیے ایک جانب چلی آئی۔ وہ جانے کیوں اسکے ساتھ ساتھ ہی تھی۔ تبھی رام ناتھ انکی طرف چلا آیا۔

نمستے جی سنا ہے آپ شردہا کے دور پار کے رشتے دار ہوتے ہیں۔ اسنے ولید کے سامنے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔ نیلی شیروانی پر گلابی پگڑی باندھے ماتھے پر بڑا سا تلک لگائے اس سے وہ ولید کو بہت برا لگا تھا۔

جی! آپ رام ناتھ ہیں۔

جی۔ شردہا کا ہونے والا پتی۔ اسکی نظریں ایک لمحے کو شردہا پر رکی تھیں شردہا اپنی برہنہ بازو کو پلو سے ڈھکنے لگی۔
 آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔

مجھے بھی۔ آئیے آپ کو انتظامات دکھاتا ہوں۔

نہیں یہ زیادہ چل پھر نہیں سکتے انکے پیر پر گھاؤ ہے۔ شردہا جلدی سے بولی۔
 ارے کیا ہوا آپکو۔

بس گر گیا تھا پاؤں پر کافی چوٹ لگ گئی۔

اچھا تو پھر آپ کھڑے کیوں ہیں میں کرسی لگواتا ہوں آپ کے لیے۔

نہیں نہیں آپ بالکل تکلف نہ کریں میں بالکل آرام سے ہوں آپ اپنے کام

دیکھیے۔ ولید نے سہولت سے منع کیا۔

اچھا چلیں ٹھیک ہے۔ شردہا چلو شیتل تمہیں یاد کر رہی تھی۔

میں ان سے مل لوں گی تم جاؤ۔ شردہا نے صاف انکار کیا۔ رام ناتھ نے ایک خاموش نظر ولید پر ڈالی پھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔

یہ کتنا بے شرم ہے۔ اسکے جاتے ہی شردہا بولی۔

اگنور کرو۔

کب تک۔۔ وہ میرا ہونے والا پتی ہے زبردستی ہاتھ پکڑ کر بھی لیجا سکتا ہے۔

ایسے کیسے۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

تم نہیں جانتے بس۔

اچھا ریلیکس۔ میں جب تک ادھر ہوں تم انشاء اللہ محفوظ رہو گی۔

اور جب تم چلے جاؤ گے پھر۔

میری موجودگی یا میری غیر موجودگی دونوں صورتوں میں حفاظت تو اللہ نے ہی کرنی ہے سو فکر مند مت ہو۔

میں بتوں کی پراٹھنا کرتی ہوں وہ بھلا میری حفاظت کیوں کرے گا۔

تو کیا اب تک وہ بت تمہاری حفاظت کرتے آئے ہیں تمہیں زندگی کی باقی

سہولیات فراہم کرتے رہے ہیں۔ کیا وہ پتھر کے بت کچھ کر سکنے پر قادر ہیں۔
 بچی یہ سب تو رب کے کام ہیں، قادر مطلق تو وہی ہے۔ چاہے تم اسے مانو
 چاہے نہ مانو مگر تمہاری ایک ایک سانس پر وہی قادر ہے۔
 تمہاری باتیں مجھے پاگل کر دینگے اُدھارک۔ وہ الجھ کر بولی۔

پاگل ہوئے بغیر ہوش مندی کا سفر ممکن ہی نہیں۔ وہ مسکرایا تھا آنکھوں کے
 گرد ہلکی ہلکی ہلکی پڑیں۔ تبھی بارات آنے کا شور اٹھا۔ اسکے بعد شادی کی
 سبھی رسومات ہوتی گئی۔ رات گئے جاکر شیتل رخصت ہوئی اور اسکے جانے کے
 بعد شردہا نے جانے کی جلدی مچادی۔ وہ بار بار طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر رہی
 تھی ولید جانتا تھا کہ یہ محض بہانہ ہی ہے درحقیقت وہ اس گھر میں مزید رکنا
 نہیں چاہتی تھی۔ بہر حال شکر داس ان دونوں کو ساتھ لیے گھر واپس آ گیا تھا۔
 ولید تو اپنے کمرے میں چلا آیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ شکر داس سو گیا ہے تو
 وہ چپکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ ہینڈ پمپ کی طرف جاتے ہوئے وہ
 چونکا۔ شردہا نے چھوٹی سی بالٹی میں نیم گرم پانی رکھ چھوڑا تھا۔ اسنے اللہ کا
 شکر ادا کیا اور وضو کر کے اپنے کمرے میں آکر کنڈی لگائی اور شردہا کی فراہم
 کردہ صاف چادر کو زمین پر بچھا کر عشاء کی نماز پڑھنے لگا۔ اس روز اسنے دل
 سے شردہا کی ہدایت کی دعا مانگی تھی۔ اور وہ جانتا نہ تھا کہ شردہا کماری کی
 ہدایت کا فیصلہ تو کہیں دور آسمانوں میں جانے کب کا ہو چکا تھا۔



وہ بچہ سلمیٰ کیساتھ جلد ہی مانوس ہو گیا تھا۔ سلمیٰ بھی اسیں مگن تھی۔ اسی دوران اس بچے کے ورثاء کی تلاش بھی جاری رہی۔ محض دو دن بعد اس بچے کی نانی کا پتہ مل گیا۔ وہ خود بھی اپنے نواسے کے لیے شدید فکر مند تھیں۔ جب انکو خبر ملی کہ وہ ایدھی ہوم میں ہے تو وہ فوراً ہی ہانپتی کانپتی چلی آئی تھیں۔ مسز اسلم ایک بیوروکریٹ کی بیوہ تھیں انکے ایک ہی اولاد تھی پچھلے دنوں ایک ایکسیڈنٹ میں انکی بیٹی اور اسکا شوہر دونوں ہی چل بسے اور یہ بچہ (زین) انکی زندگی کا واحد سہارا انکے پاس رہ گیا۔ وہ اسلام آباد میں رہتی تھیں آجکل کسی رشتہ دار کے گھر کراچی آئی ہوئی تھیں۔ دو دن قبل وہ اپنی گاڑی میں ادھر ہی قریب کسی کام سے آئی ہوئی تھیں دومنٹ ہی انکا دھیان ادھر ادھر ہوا اور بچہ گم ہو گیا۔ وہ بہت پریشان تھیں، اور اب زین کے ملنے پر انکی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ ان سب کی بے حد شکر گزار تھیں انہوں نے سلمیٰ کو کافی سارے پیسے دیئے تھے اور ان سب کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئیں جاتے سے زین سلمیٰ سے لپٹ لپٹ کر اپنی توتلی زبان میں کچھ کہتا رہا تھا۔ اسکے جانے کے بعد سلمیٰ بہت اداس ہو گئی۔ اگلے ہی روز مسز اسلم زین سمیت پھر چلی آئیں انکا کہنا تھا کہ زین نے رات بھر سلمیٰ سے ملنے کی رٹ لگائے رکھی۔ سلمیٰ کو بلوایا گیا تو زین بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ سلمیٰ بھی جیسے کھل اٹھی تھی۔ مسز اسلم کچھ دیر بیٹھی پھر زین کو لیکر چلی گئیں۔ وہ جتنے دن کراچی رہی برابر ایدھی ہوم آتی رہیں۔ جانے سے قبل

انہوں نے سلمیٰ کو بہت سے تحائف دیئے تھے۔ اور پھر وہ اسلام آباد واپس چلی گئیں۔ سلمیٰ کو پھر سے چپ لگ گئی تھی۔



تم کیا پڑھتے ہو؟

اب پڑھنے والی عمر نہیں میری۔

میرا مطلب ہے نماز میں۔

نماز میں قرآن پاک کی سورتوں کی تلاوت کرتے ہیں اور کچھ مخصوص اذکار ہیں وہ پڑھتے ہیں۔ ولید نے اسے بتایا۔ صبح کا وقت تھا۔ ناشتے کے بعد شردہا چھوٹے سے صحن کی صفائی کر رہی تھی۔ شکر داس حسب معمول مندر میں تھا۔

تم نے وہ سب یاد کیا ہوا ہے؟

ہاں۔ بہت آسان ہوتی ہیں قرآنی آیات۔

اچھا۔

ہاں۔

ادھارک تم نے آگے کا کیا سوچا ہے۔ اپنے دیش کیسے واپس جاؤ گے؟

یہی تو سوچتا رہتا ہوں۔ یہ اچھا ہے کہ گاؤں والوں کو علم ہو گیا کہ میں تمہارا

کزن ہوں اب میں آزادی کیساتھ باہر گھوم پھر سکوں گا اور گھومتے پھرتے ہی کسی روز بارڈر بھی دیکھ آؤنگا۔

ہاں بارڈر تو بہت قریب ہے۔ اور بہت لوگ آتے ہیں سیر کو۔ شردها نے دیوار پر رکھی مٹی کی کٹوری میں چڑیوں کے لیے دانے ڈالتے ہوئے بتایا۔

کل جاؤنگا۔

ابھی چلتے ہیں ناں۔ میں نے لکڑیاں بھی اکٹھی کرنی ہیں۔ اسی بہانے بارڈر تک ہو آئیگی۔ شردها نے تجویز دی۔

گڈ آئیڈیا۔ چلو چلتے ہیں۔

چلو میں ذرا چادر لے کر آتی ہوں۔ وہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی پھر ساڑھی پر ہی سیاہ شال اوڑھ کر باہر آئی۔ وہ سر نہیں ڈھانپتی تھی مگر جسم کو ڈھانپنے لگی تھی۔ ولید کو اس چھوٹی سی لڑکی کی یہ تبدیلی اچھی لگی تھی۔ اس نے ایکبار پھر دل سے اس کے لیے ہدایت کی دعا کی۔ وہ دونوں گھر کو باہر سے کنڈی لگا کر دائیں جانب چل پڑے۔ گلیوں سے باہر نکل کر شردها کا رخ کھیتوں کی جانب ہو گیا۔ ولید اس کے پیچھے تھا۔

کس طرف جانا ہے لڑکی؟

بس تھوڑا سا دور۔ اسنے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ کھیتوں میں کسان اپنے کاموں

میں مصروف تھے۔ بکریاں گھوم پھر رہی تھیں۔ وہ اور شردہا مناسب رفتار سے چلتے جارہے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا جسم کو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

تمہاری پتی کی آنکھوں کا رنگ کیا ہے اُدھارک؟ وہ دونوں رہٹ کے قریب رکے تھے جب شردہا نے اس سے پوچھا۔

ہلکا سا براؤن۔ ولید نے جواب دیا۔

بہت سندر ہو گئی ناں۔

اچھی ہے۔۔ عام سی۔

عام سی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ہاں۔

پھر بھی تمہیں وہ اتنی اچھی لگتی ہے۔

محبت کا چہرے سے کیا تعلق ہے شردہا۔ یہ تو روحوں کا ملن ہے۔

محبت تو شریر سے ہوتی ہے۔

نہیں۔ محبت اتنا عامیانہ جذبہ نہیں کہ جسم تک محدود رہے۔ یہ روح سے روح کا تعلق ہے۔

مجھے تو نہیں معلوم تھی یہ بات۔

ابھی تمہیں معلوم ہی کیا ہے چھوٹی لڑکی۔ وہ ہولے سے مسکرایا۔ پانی پی کر وہ پھر چل پڑے۔ تھوڑا سا ہی مزید چلنے کے بعد بارڈر کا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ سچیت گڑھ بارڈر لائن پر تعمیر بڑا سا گیٹ جس کے ایک طرف پاکستان جبکہ دوسری طرف بھارت کا جھنڈا پینٹ ہوا تھا۔ یہ گیٹ کھلا ہی رہتا ہے اور سیاحوں کی بڑی تعداد قریب روز ہی اس کی سیر کرنی آتی ہے۔ ولید کے قدم رک گئے وہ اور آگے نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں فوجی موجود تھے اور وہ ایک پاکستانی فوجی۔ جو بھارتی فوج کی قید سے بھاگا تھا۔ گوکہ اس نے داڑھی کافی بڑھا رکھی تھی بالوں کا انداز بھی بدل لیا تھا مگر چہرے کے نقوش تو وہی تھے اور ویسے بھی اب منزل کے اتنے قریب پہنچ کر وہ ہر ممکن احتیاط برتنا چاہتا تھا تاکہ خیر خیریت سے پاکستان پہنچ جائے۔ اسکی نظروں کے عین سامنے سچیت گڑھ باندڑی لائن کا گیٹ تھا۔ جس کے اس پار اسکا پیارا پاکستان تھا۔ ولید کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ شردہا قریب ہی لکڑیاں چن رہی تھی اور وہ ساکت و صامت کھڑا تھا، بناء پلکیں جھپکائے وہ گیٹ کے اس پار سے نظر آتی اپنی وطن کی مٹی کو تک رہا تھا۔ اسکی آنکھیں کتنی پیاسی تھیں۔۔ اسکا دل کتنا فگار تھا۔ جدائی کا گہرا گھاؤ پھر سے تازہ ہونے لگا۔ وہ اپنی منزل سے بس چند قدم کے فاصلے پر تھا مگر یہ کیسی بے بسی تھی کہ اسے بے نیم و مرام لوٹنا تھا۔ اپنے وطن کی مٹی چومنے کو بے تاب اسکا دل مچل رہا تھا مگر اسے خود کو مضبوط بنانا تھا۔ شردہا نے لکڑیاں چن لیں تو اسے پکارا۔ وہ چونک کر واپسی کے

لیے پلٹا۔

پاکستان زندہ باد۔ اسے اپنی پاسنگ آؤٹ پریڈ کے مناظر یاد آرہے تھے۔ اسکے قدم رکنے لگے۔ اسنے گردن موڑ کر دیکھا۔ پاکستان کا سبز پرچم اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ امید بھری مسکراہٹ۔۔ ولید نے ہاتھ پیشانی تک لیجا کر اس پرچم کو سلام پیش کیا اور بو جھل دل کیساتھ واپسی کے لیے پلٹ آیا۔ واپسی کے سفر میں وہ ایک لفظ نہ بولا تھا۔ اسکے دل پر بڑا بھاری بوجھ آن پڑا تھا۔



کدھر گئی تھی بیٹیا؟ وہ دونوں جیسے ہی گھر پہنچے شکر داس نے سوال کیا۔ وہ گھر آچکا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

باپو لکڑیاں چننے جارہی تھی تو ادھارک بھی ساتھ ہولیا۔ گھر میں پڑے پڑے تھک گیا ہے بیچارہ۔ اسکے بولنے سے قبل ہی شردہا بول پڑی۔

ہاں کبھی کبھی باہر چلے جایا کرو ادھارک۔ شکر داس نے سر ہلا کر کہا۔ ولید جواباً سر کو خفیف سی جنبش دے کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا اسکے دل پر بہت بوجھ تھا اور یہ گھر، اس ملک کی فضا میں اسے کسی قید کی مانند لگ رہی تھیں۔ وہ کمرے میں آکر چپ چاپ آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ باہر آنگن میں شردہا چھوٹے سے سٹور میں لکڑیاں رکھ رہی تھی۔

اری شردہا! یہ ادھارک عام لوگوں سے کتنا مختلف ہے ناں۔ شکر داس نے اسے

مخاطب کیا۔

ہاں باپو مختلف تو ہے مگر اچھا انسان ہے۔ وہ لکڑیاں رکھ کر واپس پلٹی۔

سو تو ہے۔ شکر داس نے سر ہلایا۔

آج کیا پکاؤں باپو؟ کچھ ٹانے بعد شردہا نے پوچھا۔

جو تیرا من کرے پکا لے بیٹا۔ میں تو سب کچھ کھا لوں ہوں۔ وہ کمر سیدھی کرنے کو چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔ شردہا باورچی خانے میں آئی اور نعمت خانے میں جھانکا۔ سبزیاں ختم ہو چکی تھیں اور اسے دھیان ہی نہ رہا تھا۔

باپو! سبزی ختم ہے۔ اسنے وہیں سے آواز دی۔

اری بتایا کیوں نہیں۔

دھیان نہیں رہا باپو۔ تو جا جا کر لے آ۔ تب تک میں چاول پکا لیتی ہوں۔

نہیں چاولوں کا من نہیں آج، تو رک میں سبزی لاتا ہوں پالک پنیر کھانے کا من ہے آج تو۔ وہ اٹھتا ہوا بولا تو شردہا مسکرائی۔

باپو ابھی تو تو کہہ رہا تھا جو میرا من کرے پکالوں۔

ہے بھگوان اب بیٹا رانی بڑھے باپ کی باتیں پکڑ لے گی۔ شکر داس نے محبت پاش نظروں سے بیٹی کو گھورا۔

خود ہی تو بولا تم نے۔ وہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولی۔ جواباً شکر داس نے اسکے پاس آکر اسکے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی۔

میں جاتا ہوں تو کواڑ اچھی طرح بند کر لیو۔ وہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا شردہا اسکے پیچھے تھی۔

رام رام۔ شکر داس کہہ کر دروازہ پار کر گیا۔ شردہا نے دروازہ بند کیا اور جھولے پر آ بیٹھی۔ کچے آنگن میں مرغیاں ادھر سے ادھر گھوم رہی تھیں۔ شردہا انہیں تنکے لگی۔ چھوٹے چھوٹے چھ چوزے مرغی کے پیچھے پیچھے تھے وہ بھی گاہے گاہے مڑ کر انکو اپنی زبان میں کچھ کہتی اور پھر بڑی شان سے کسی دانے پر منہ مارنے لگی بچے اسکی تقلید کرتے۔

شردہا اری او شردہا۔ پوجا کی پکار پر وہ چونکی۔ وہ اپنے اور انکے گھر کی درمیانی دیوار پر لٹکی ہوئی تھی۔

کیا ہے۔

پکوڑے بنائے ہیں میں نے یہ لے۔ اسنے پلیٹ وہیں سے آگے بڑھائی۔ شردہا جھولے سے اتر کر دیوار کی طرف آئی اور ہاتھ اونچے کر کے پوجا سے پلیٹ تھام لی۔

یہ چٹنی بھی ہے۔ بڑے ہی سوادش ہے۔ میری بوا جی نے بھجوائی ہے۔ اسنے ایک چھوٹی سی کٹوری بھی اسے تھمائی۔

دھننے داد۔ بڑا من کر رہا تھا پکوڑے کھانے کا۔

بس دیکھ لے تیرا من کیا اور میں نے بنا کر بھیج دیے۔ یہی ہوتی ہے پکی دوستی۔ پوجا تیز تیز بولتی تھی۔ شردہا مسکرانے لگی ساتھ ہی ساتھ اسنے وہیں کھڑے کھڑے ایک پکوڑا چٹنی میں بھگو کر منہ میں رکھا۔

واہ۔۔۔ بہت ہی سوادش ہیں۔ وہ جھوم اٹھی۔

میرے ہاتھ کا ذائقہ تو پھر ہے ہی کمال کا۔ اچھا یہ بتا تیرا وہ رشتے دار چلا گیا کیا؟ وہ یکدم ہلکی آواز میں رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

نہیں ابھی ادھر ہی ہے۔

اچھا۔ وہ تیرا لگتا کیا ہے؟

باپو کی کسی دور پار کی چچا زاد بہن کا لڑکا ہوتا ہے۔

یعنی تیری بوا کا لڑکا ہے۔

ہاں۔

ویسے شردہا بہت ہی سندر ہے وہ۔ نام کیا ہے اسکا؟

ادھارک۔

ہائے نام بھی کتنا اچھا ہے۔ سچی شردہا وہ تو یہاں کا لگتا ہی نہیں ایسے لگتا ہے

جیسے کوئی شہزادہ ہے۔ پوجا آنکھیں بند کر کے جھومنے لگی۔
آہستہ بول۔

تو چھت پہ آکچھ دیر باتیں کرتے ہیں۔ پوجا نے ہدایت جھاڑی اور یہ جا وہ
جا۔ شردہا نے پلیٹ ڈھک کر باورچی خانے میں رکھی اور چھت پر چلی آئی
جہاں پوجا پہلے سے ہی موجود تھی۔ وہ درمیانی چھوٹی سی دیوار پھلانگ کر آئی
تھی وہ دونوں چھوٹے سے بنیرے پر بیٹھ گئیں۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تیرا وہ رشتہ دار بہت ہی پیارا ہے۔ پوجا نے
سلسلہء کلام وہیں سے جوڑا۔

سو تو ہے۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

کشمیری تو نہیں لگتا وہ۔

کشمیری ہی ہے۔

لگتا نہیں ہے۔ وہ تو بارڈر پار والوں جیسا لگتا ہے۔ پوجا یکدم آواز بہت مدھم
کر کے بولی مبادا کوئی سن نہ لے۔ شردہا نے اسکی طرف دیکھا وہ جانتی تھی پوجا
نے کافی عرصہ سری نگر شہر میں اپنی خالہ کے پاس گزارا ہے اور وہ وہاں ٹی
وی پر پاکستانی ڈرامے اور کرکٹ میچ وغیرہ دیکھتی تھی۔ انڈیا پاکستان کا کرکٹ
میچ تو ادھر بھی دیکھا جاتا تھا گاؤں کے واحد ٹی وی جو کہ رام ناتھ کے گھر پر

تھا وہاں۔ سارا گاؤں ادھر جمع ہو جاتا تھا۔ پچھلے دنوں ہی پاکستان نے بھارت کو چیمپئنز ٹرافی میں عبرتناک شکست دی تھی تب شردہا نے قسم کھائی تھی کہ آئندہ کبھی کرکٹ نہ دیکھے گی۔

کیوں بارڈر پار والوں کی کیا شکلوں پر لکھا ہوتا ہے اور ویسے بھی سندرتا جتنی کشمیر میں اور کہیں ہو نہیں سکتی۔ وہ جلدی سے تنگ کر بولی۔

اری سندرتا کی بات نہیں ہے۔ بارڈر پار والوں کی شکلوں پر عجیب سی چمک ہوتی ہے۔ تو نے کبھی دیکھا نہیں ناں انہیں اسلیے تجھے پتہ نہیں۔ میں جب موسیٰ کے پاس رہتی تھی تو وہاں ہمارے برابر میں ایک مسلا پری وار رہتا تھا انکی لڑکی سے میری دوستی تھی وہ مجھے انٹرنیٹ پر پاکستانی ڈرامے دکھاتی تھی کیا بتاؤں شردہا انکے ہیرو کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ وہ ایکسائیٹڈ ہو گئی تھی۔

دیکھے ہیں میں نے پاکستانی۔ کرکٹ کھیلنے والے تو بس ٹھیک ہی ہوتے ہیں۔ وہ منہ بنا کر بولی۔ وہ کافی محب وطن قسم کی لڑکی تھی۔

اری آفریدی کو بھول گئی کیا۔ وہ کتنا پیارا ہے۔ پوجا آفریدی کی دیوانی تھی۔ اور صرف پوجا پر ہی کیا موقوف مقبوضہ کشمیر میں آفریدی کی مقبولیت کافی زیادہ تھی۔

ہاں وہ اچھا ہے۔ شردہا جھٹلا نہ سکی۔ ایشیاء کپ میں آفریدی کے ہاتھوں بھارت کی درگت اسے اچھی طرح یاد تھی اور سارا گاؤں ہی بہت غمگین ہوا تھا

تب مگر اسکے باوجود وہ اسکی پرسنالٹی سے متاثر تھی۔

کھالی اچھا نہیں بہت بہت اچھا۔ ہائے جب چھکے مارتا ہے تو کیسا شیر جیسا لگتا ہے۔ یہ چوڑا سینہ واہ۔ پوجا اب شروع ہو چکی تھی اور اس موضوع پر وہ گھنٹوں بلا تکان بول سکتی تھی۔

بس کر دے۔ ہمارا ویراٹ بھی بہت پیارا ہے۔ وہ جلدی سے بولی۔

وہ بھی ٹھیک ہے پر آفریدی کا کوئی جوڑ نہیں یہ بات تو تو مان لے۔ اور شردہا تیرا یہ رشتہ دار آفریدی جیسا ہی تو لگتا ہے۔ پوجا پہ اچانک انکشاف ہوا تھا۔ پگلا گئی ہے تو۔ آفریدی کی آنکھیں اتنی چھوٹی چھوٹی ہیں اور ادھارک کی آنکھیں دیکھ اتنی بڑی بڑی۔

آنکھوں کو چھوڑ کر ملتا ہے آفریدی سے وہ۔

بالکل بھی نہیں ملتا تو اندھی ہے۔ وہ جھنجھلا گئی۔

ہونہہ وہ بالکل اسکے جیسا ہے ویسا ہی چوڑا سینہ جب چلتا ہے تو لگتا ہے شیر شکار کرنے جا رہا ہے۔

چپ کر جا اب۔ اشوک دا پر گور کیا کر۔ اسنے اسے گھورا۔ اشوک پوجا کا منگیتر تھا۔

وہ تو ہے ہی اچھا مگر آفریدی سے تھوڑا کم وہ بائیں آنکھ دبا کر بولی تو شردہا

نے اپنا سر پیٹ لیا۔



ہاہاہاہا تمہاری سہیلی نے مجھ پر اتنا غور کب کیا ولید اسکی باتیں سن کر بہت
مخطوط ہوا تھا۔ شام کا وقت تھا اور وہ دونوں مل کر مرغیوں اور انکے چوزوں
کو پکڑ کر ڈربے میں بند کر رہے تھے۔ شکر داس اگلی گلی میں ایک شادی
کروانے گیا ہوا تھا۔

بھگوان جانے۔ اسکو بس ہر مرد آفریدی جیسا دکھتا ہے پگی۔

آفریدی تو پھر آفریدی ہے ناں۔ ولید مسکرایا۔

تمہیں بھی پسند ہے کیا؟
NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interview

بہت زیادہ پسند ہے۔ ہمارے ملک کا تو ہیرو ہے وہ۔ ان فیکٹ میں تو ملا بھی تھا
ان سے ایکبار۔ بہت اچھے انسان ہیں وہ۔ اور ہینڈ سم بھی۔

افف یہ بات پوجا کو پتہ چل جائے ناں تو دل پکڑ کر بیٹھ جائے۔ اسے شاہ
رخ خان سے زیادہ آفریدی پسند ہے۔ وہ ڈربے کا دروازہ بند کرتے ہوئے
بولی۔

دیکھ لو پھر پاکستانیوں کی مقبولیت۔ ولید نے سر ہلایا۔

کھیر ایسی بھی بات نہیں ہمارا شاہ رخ بھی بہت مشہور ہے ساری دنیا مرتی ہے

اس پر۔

اسمیں کوئی شک نہیں۔ شاہ رخ ایک لیجنڈ ہے۔ مگر آفریدی تو پھر آفریدی ہے ناں۔ وہ مسکرا کر بولا تو شردہا سر ہلانے لگی یوں جیسے آفریدی کے مداحوں کو سمجھانے سے قاصر ہو۔

پوچھا کہہ رہی تھی کہ بارڈر پار والوں کے چہروں پر عجیب سی چمک ہوتی ہے۔

اس سے کہنا تھا کہ ایمان کی چمک ہے جو دنیا کے ہر مسلمان کے چہرے پر ملے گی چاہے وہ سیاہ فام افریقی ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر چولہے میں لکڑیاں ڈالتی شردہا کے ہاتھ رکے۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ایمان کیا ہوتا ہے ادھارک؟ اسے سوال کیا۔

کسی پر ایمان لانے سے مراد اس کی تصدیق کرنا اور اس پر یقین رکھنا ہے۔ یہ امن سے نکلا ہے اور امن تم سمجھتی ہو کہ امان سے رہنے کو کہا جاتا ہے لہذا لفظ ایمان اپنے اصل معنی اور مفہوم کے اعتبار سے امن، امانت اور بھروسے پر دلالت کرتا ہے۔ اگر شرعی معنوں میں دیکھا جائے تو دل سے یقین، زبان سے اظہار اور جسمانی طور پر عمل کا نام ایمان ہے۔ اس نے مدلل طور پر وضاحت دی تھی۔

ایمان کم یا زیادہ بھی ہوتا ہے کیا ادھارک؟

ایمان اطاعت سے بڑھتا ہے اور نافرمانی سے کم ہوتا ہے۔

اطاعت کیا مطلب؟

اطاعت کا مطلب ہے فرمانبرداری کسی کی ہر بات پر سر جھکا دینا من و عن تسلیم کر لینا بغیر حیل و حجت کے۔

اچھا۔ تو تمہارا ایمان پکا ہے کیا؟

الحمد للہ۔ میں اللہ کے ہر حکم پر سر جھکاتا ہوں اسکی ہر بات پر میرا ایمان ہے۔

مگر تم نے تو اسے کبھی دیکھا ہی نہیں تمہیں کیا پتہ وہ ہے بھی یا نہیں۔
تمہارے پاس اسکا کیا ثبوت ہے کہ جس کی تم پوجا کرتے ہو وہ اللہ واقعی موجود ہے۔ کیا پتہ آسمانوں میں کوئی بھی نہ ہو۔ کوئی ان دیکھا خدا نہ ہو۔ بس تمہاری سمجھ کا قصور ہو۔ وہ تیز تیز بولنے لگی۔ اپنے تئیں اس نے ولید کو لاجواب کر دیا تھا۔ وہ بھلا نادیدہ رب پر کیا دلیل دے پائے گا۔

عقل والوں کے لیے تو اس کائنات کی ایک ایک بات میں نشانی ہے شردھا اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو اسے ایک اک ذرے میں رب دکھے گا۔ بس ایک دل آگاہ چاہیے۔ وہ طمانیت بھرے لہجے میں بولا۔

چلو مان لیا۔ مگر تم کہتے ہو بھگوان ایک ہے مگر ہمارا ماننا ہے کہ بھگوان بہت

سارے ہیں۔ تم ثابت کرو کہ بھگوان ایک ہی ہے۔

کبھی سنا ہے کہ کسی ملک کے دو حکمران ہوں۔ جمہوریت کی مثال دوگی تم تو اسمیں بھی کیا صدر کو کوئی اختیارات حاصل ہیں نہیں ناں اصل حکمران تو وزیراعظم ہی ہے ناں۔

ہاں۔

اگر دونوں حکمرانوں کے پاس ایک جیسے اختیارات ہوں تو کیا ہو۔

دونوں میں جھگڑا ہوتا رہے کیونکہ سب کی سوچ ایک دوسرے سے نہیں ملتی۔ اور ملک کا نظام تباہ ہو جائے۔

یعنی ایک چھوٹے سے ملک پر بھی دو بندے مل کر حکومت نہیں کر سکتے۔ تو

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی بڑی کائنات کو چلانے والے ایک سے زیادہ ہوں۔ سورج کے آنے جانے کا وقت مقرر ہے چاند کے گٹھنے بڑھنے کا ایک وقت مقرر ہے موسموں کے آنے جانے ہر چند کہ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے تو یہ سب انتظامات ایک ہی مالک ٹھیک رکھ سکتا ہے اگر ایک سے زائد کے پاس ایک جیسے اختیارات ہونگے تو نظام درہم برہم ہو جائے۔ خاندانی نظام پر نظر ڈالو۔ سربراہ ایک ہی ہوتا ہے۔ ساری دنیا کے ہر شعبے پر نظر ڈالو حکمران ہر جگہ بس ایک ہی ہوتا ہے اور یہی دلیل ہے رب کی واحدانیت کی کیونکہ اللہ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے اور کیونکہ وہ رب تنہا مالک

ہے اسی لیے انسان بھی اسی کو فالو کرتا ہے یہ اسکی فطرت ہے۔ اس نے بہت عام فہم انداز میں اسے سمجھانا چاہا تھا۔

اور یہ جو مورتیں ہیں۔

یہ تو دل کو بہلانے کا سامان ہیں ورنہ سچ تو یہ ہے شردہا کہ اندر کہیں دماغ سب کا جانتا ہے کہ اللہ کا ان پتھر کی مورتوں سے کوئی لنک نہیں۔ اللہ ایک ہے یہ بات تم سمیت دنیا کا ہر مشرک جانتا تو ہے بس مانتا نہیں کیونکہ صدیوں سے جہالت میں پڑے دل کو حق کی طرف مائل کرنا بڑی ہی بہادری کا کام ہے اور ہر کوئی بہادر نہیں ہوتا۔ اس نے تو جیسے بات ہی ختم کردی تھی۔ اور بات ختم کر کے وہ اٹھا ہینڈ پمپ سے وضو کر کے کمرے میں چلا گیا۔ شردہا کی نظریں بے اختیار ہی سامنے کو اٹھیں جہاں آنگن کے اس کونے میں بنے پوجا والے کمرے کے کھلے دروازے سے کالی ماتا کی مورتی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ پتھر کی بے جان گہری سیاہ رنگ کی مورتی جس کی سرخ سرخ زبان منہ سے باہر تھی اور وہ مجموعی طور پر ایک ڈراؤنی مورتی تھی۔ شردہا نے سر جھٹکا۔ اس نے آج پہلی بار اس مورتی کی بد صورتی کو نوٹ کیا تھا اور وہ الجھ گئی تھی۔ کیا رب اتنا خوفناک ہو سکتا ہے۔ اسکے دل نے سوال کیا تھا۔ وہ رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ پندرہ منٹ بعد ولید نماز پڑھ کر کمرے سے برآمد ہوا تو شردہا نے اسکی طرف دیکھا۔ اسنے سر پر رومال باندھ رکھا تھا اور اس سے اسکے چہرے پر نور برس رہا تھا۔

ادھارک تمہارا اللہ دیکھنے میں کیسا ہوگا؟

بہت حسین۔۔

تمہیں کیسے پتہ؟

میں جانتا ہوں کیونکہ میری روح اسکا حصہ ہے۔۔ اسکا نور ہے۔

نور۔۔۔

ہاں نور۔۔ اللہ نور ہی تو ہے۔۔ وہ مسکرایا تھا پھر چھت کو جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ شردہا جانتی تھی وہ چھت پر سکھانے کے لیے رکھی مرچیں سمیٹ کر لائے گا۔

وہ چپ بیٹھی رہ گئی۔

اللہ نور ہے۔

اسکے ارد گرد اسکی آواز گونج رہی تھی۔

بارڈر پار والوں کے چہروں پر عجیب سی چمک ہوتی ہے۔

یہ چمک ایمان کی ہے۔

اللہ نور ہے۔۔۔

شردہا نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ تبھی دروازہ بجا تو وہ چونکی اور اٹھ کر

دروازہ کھولا۔

ہری اوم ہری اوم۔ شکر داس اندر داخل ہوا۔ وہ صحن میں بچھے چارپائی پر جا بیٹھا۔ شردہا چلتی ہوئی کچن کی دیوار کے پاس جارہی اور مڑ کر باپ کی طرف دیکھا۔ نارنجی رنگ کے پنڈتوں والے لباس میں گلے میں مالائیں ڈالے الجھے ہوئے شانوں تک آتے گندے سندے بالوں کو بکھرائے ماتھے پر بڑا سا تنک لگائے شکر داس ابھی ابھی پوجا کر کے لوٹا تھا۔ مگر اسکے چہرے پر وہ نور نہ تھا جو کچھ دیر قبل اسنے ولید کے چہرے پر دیکھا تھا۔

کیا ہوا بٹیا؟

کچھ نہیں باپو۔ یونہی تم کو دیکھ رہی تھی۔ وہ نارمل سے لہجے میں کہہ کر باورچی خانے میں چولہے کے سامنے جا بیٹھی۔

میں ذرا ماتا رانی کے چرن چھولوں تو تب تک کھانا پکا لے۔ وہ کہتا ہوا پوجا والے کمرے کی طرف چلا گیا۔ شردہا نے گردن گھما کر اس سمت میں دیکھا۔ کالی ماتا کا گھناؤنا چہرہ اسے کسی بھوت کی مانند لگا تھا اسنے گردن موڑ لی۔ باپو اب بلند آواز میں پاٹھ کر رہا تھا۔ مگر اسکی سماعتوں میں بس ایک ہی پکار تھی۔

اللہ نور ہے۔۔۔



دھان کے سنہرے کھیت حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ دور کہیں سے پن چکی

کی آواز رہٹ کی مسلسل شراب شراب اور بیلوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سے مدغم ہو کر اک نیا ساز پیدا کر رہی تھی۔ بھری دوپہر کا وقت تھا۔ کسان اپنے کام کاج چھوڑ کر درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھے گرما گرم روٹی کھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ اپنی بیویوں سے غپ بھی لڑا رہے تھے۔ ساری فضاء میں تازہ پکتی روٹیوں کی باس بکھری پڑی تھی۔ شردہا پگڈنڈی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اسکی گود میں بکری کا ننھا سا سفید بچہ تھا جس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ لمبی چوٹی پشت پر لہرا رہی تھی۔ اور آج اس نے ساڑھی کی بجائے نارنجی رنگ کی گھیردار شلوار کیساتھ گہری سبز گھٹنوں سے اوپر قمیض پہن رکھی تھی۔ دوپٹہ دائیں شانے پر پڑا تھا۔ وہ قدرت کے اس حسین منظر کا اک حسین ترین حصہ نظر آرہی تھی۔ ولید گھر سے نکل کر کھیتوں کی جانب ہولیا وہ دراصل شردہا کو تلاش کرنے نکلا تھا صبح کی جو نکلی تھی تو اب تک اسکی واپسی نہ ہوئی تھی۔ اس نے دور سے اسے پگڈنڈی پر بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا اسکے پاس چلا آیا۔

اے لڑکی کدھر گم ہو؟ اسکے قریب پہنچ کر اسنے بلند آواز میں اسے پکارا تو وہ ڈر کر چونکی اور بکری کا بچہ اسکی گرفت سے نکل کر دور کھیتوں میں بھاگ گیا۔

کیا ہوا؟

گھر کیوں نہیں آئی اتنی دیر سے؟ ولید نے پوچھا۔
 یونہی من نہیں کر رہا تھا۔
 من کو کیا ہو گیا بیٹھے بٹھائے۔
 پتہ نہیں۔ کبھی کبھی گھر میں گھبراہٹ ہوتی ہے تو گھنٹوں یہاں بیٹھی رہتی
 ہوں۔

آہا یعنی یہ دورہ اکثر پڑا کرتا ہے۔ وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔
 تم کیوں چلے آئے؟
 یونہی گھر میں بور ہو رہا تھا۔ یاد اپنے والد محترم سے کہہ کر ایک ٹی وی ہی
 منگوا لو۔ جب میں بھی چلا جاؤنگا پھر تو تم اکیلے گھر میں بوریت سے مر جاؤ گی۔
 بیس سالوں سے نہیں مری ٹی وی کے بگیر (بغیر) تو اب بھی نہیں مرو گی۔
 بیس سال۔۔ یعنی تم بیس سال کی ہو۔
 ہاں۔

جب میری اور ابیہا کی شادی ہوئی تھی تب وہ بھی بیس سال کی تھی۔ وہ
 مسکرایا۔ اس چمکیلے دن کی یاد نے اس کے چہرے کو دمکا دیا تھا۔ شردہا سر اٹھا کر
 اس کے طرف دیکھنے لگی۔

تمہارا ویواہ بہت دھوم دھام سے ہوا تھا کیا؟

ہاں بہت دھوم دھام سے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ شادی کے دنوں میں میں اور ابیہا ایک دوسرے سے ناراض تھے۔

ناراج کیوں تھے۔ اور تم دونوں ایک دوسرے کو ویواہ سے پہلے جانتے تھے؟

ہاں بھی کیوں نہیں جانتے تھے۔ تقریباً چھ ماہ ہمارا نکاح رہا تھا۔ ویسے ابیہا میری بہن کی دوست تھی میں نے اسے جب دیکھا تو وہ مجھے اچھی لگی پھر اسے جانا تو محبت ہو گئی یوں سمجھ لو جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ شردہا کو اسکے چہرے پر پھیلی مسرت دیکھ کر ابیہا کی قسمت پر رشک ہوا تھا۔

تمہیں اسمیں کیا بات اچھی لگی تھی ادھارک؟

اسکی شرم و حیا۔ ولید نے بلا تامل جواب دیا تھا۔ شردہا ایک لمحے کو چپ رہ گئی۔

وہ بھی تم سے پریم کرتی تھی؟

ہاں۔ مگر شرماتی ہی رہتی تھی کبھی کھل کر اظہار نہیں کیا تھا اسنے۔ وہ ہولے سے ہنسا اسکی چمکیلی آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔

تمہیں بہت اچھی لگتی ہے وہ۔۔

بہت زیادہ۔۔

اتنے سالوں بعد بھی۔

صدیوں بعد بھی ایسا کے لیے میری محبت میں کمی نہیں آسکتی۔

تم نے اسے دیکھا نہیں سات سالوں سے۔۔۔

اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو میری روح میں بستی ہے میں نے گزشتہ سات

سالوں میں ہر ہر پل اسے اپنے قریب محسوس کیا ہے۔۔

مرد تو بیویں کو بھول جاتے ہیں۔

وہ بیوی سے عشق نہیں کرتے میں اپنی بیوی سے عشق کرتا ہوں۔

تمہاری پتی بہت بھاگی شالی ہے۔ وہ خود کو کہنے سے روک نہ پائی تھی۔

میرے خیال میں میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسا جیسی بیوی ملی۔ نیک

پارسا اور فرمانبردار۔

اُدھارک! اپنے اللہ سے پراٹھنا کرو کہ مجھے بھی تم جیسا اچھا پتی ملے۔ شردہا

کے لہجے میں حسرت تھی۔ ولید نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں

نے شردہا کے گہری سبز آنکھوں کا تعاقب کیا تھا اور اسے اپنی جانب دیکھتے پا کر

وہ نظروں کا زاویہ بدل گیا تھا۔ اس سمے ان دنوں سبز آنکھوں میں ان کہی

داستانیں تھیں۔۔ وہ داستانیں جو ولید حسن کے دل میں تشویش کا الارم بجائی

تھیں۔

اللہ سب اچھا کرے گا۔ چلو گھر چلیں۔ وہ یکدم بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ بات مکمل کر کے وہ واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ مڑ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ آرہی تھی یا نہیں۔ شردہا نے گہری سانس بھری اور اٹھ کر سست قدموں سے اسکے پیچھے ہوئی۔



!ولید

ہوں۔۔

آپ نے کیا مانگا

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

بس مانگا ہے کچھ۔

بتائیں ناں۔

اوں ہوں۔۔ تم نے کیا مانگا۔

میں نے تو بیٹا مانگا۔

بس۔۔

جی۔

میری محبت نہیں مانگی۔

جو چیز ہے ہی میری اسے کیا مانگنا۔

یہ بات بھی درست ہے۔ ویسے تم میرے ساتھ رہ رہ کر کافی سمجھدار ہوتی جا رہی ہو۔

آپ جتنی سمجھدار تو میں کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔ مجھ سے تو غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔

ارے تو اسمیں اداس ہونے والی کیا بات ہے اچھی بیا۔ میں ہوں ناں تمہاری سب غلطیوں کو اپنے سر لے لوں گا۔

آپ بہت بہت اچھے ہیں ولید۔

اور آئی لو یو۔ بھی تو بولو ناں۔

گھر چلیں دیر ہو رہی ہے۔

کتنی بری ہو تم۔

جی میں بہت بری ہوں چلیں اب۔

کھٹکا سا ہوا تو وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ ہوا کے تیز جھونکے سے کمرے کا دروازہ بند اور کھل رہا تھا۔ اسنے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ یہاں بیٹھے بیٹھے ساتھ سال قبل کے ان چمکیلے دنوں کی یاد میں کھو گیا تھا۔ وہ دن جب وہ اور ایہا داتا دربار پر حاضری دینے گئے تھے اور ایہا بہت دیر تک دعا مانگتی رہی

تھی۔ وہ دن ولید کبھی نہ بھول سکتا تھا۔ اس روز سیاہ لباس میں ایہا بہت پیاری لگ رہی تھی۔ وہ جب تک دعا مانگتی رہی تھی وہ گردن موڑے اسے تکتا رہا تھا۔ اس کے پاکیزہ چہرے پر کیسی معصومیت تھی۔ ولید کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ وقت کبھی نہ گزرے اور وہ اسے یونہی تکتا رہے اس روز گھر پہنچ کر اس نے ایہا کو اپنے سے قریب کر کے ایک پیار بھری سوگوشی کی تھی بیا تم بہت بہت پیاری لگ رہی ہو اور اسمیں اس شاندار ڈریس کا کوئی کمال نہیں سارا کمال تمہاری معصومیت اور سادگی کا ہے۔ اور ایہا بے طرح شرما کر اس کے گرفت سے نکل کر کمرے میں بھاگ گئی تھی۔ وہ لمحے کیسے حسین تھے۔ سرشاریت سے بھرپور۔۔ ولید کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ نجانے کب اس کا انتظار ختم ہونا تھا۔ کب اسے دربارہ اپنی بیا کا چہرہ دیکھنے کا موقع ملنا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر کمرے سے باہر نکلا۔ آسمان مٹیالے رنگ کے بادلوں سے ڈھک گیا تھا تیز ہوانے آندھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس وقت وہ گھر میں اکیلا تھا م شکر داس برابر والے گاؤں کسی کی کنڈلی نکالنے گیا ہوا تھا اور اسکی واپسی رات سے پہلے متوقع نہ تھی جبکہ شردہا برابر والی پوجا کے گھر گئی ہوئی تھی۔ گرد کا اک طوفان سا آرہا تھا۔ وہ کمرے میں واپس آگیا اور بستر کنارے ٹک کر آنکھیں موند لیں۔ اس کا دل جانے کیوں بہت گداز ہو رہا تھا۔ عجب سے خالی پن کا احساس ہو رہا تھا۔ اور اس خالی پن کے احساس کو دور کرنے کے لیے اسکی زبان پر آقائے دو جہان کی مداح سرائی کا ورد

جاری ہو گیا تھا۔

میرے ڈوبنے میں باقی نہ کوئی کسر رہی تھی۔۔۔

اسکی آواز مدھم مگر پرسوز تھی۔

میرے ڈوبنے میں باقی نہ کوئی کسر رہی تھی۔۔۔

اس نے مصرعے کی تکرار کی۔ اسی لمحے شردہا دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہوئی۔ آندھی بہت تیز ہو چکی تھی۔ آنگن میں گرد اڑ رہی تھی۔ وہ ولید کو تلاش کرتی اسکے کمرے تک گئی پھر دروازے پر ہی رک گئی۔ وک بستر کی پشت سے ٹکا آنکھیں موندے کچھ گنگنا رہا تھا۔ شردہا غور سے سننے لگی۔

میرے ڈوبنے میں باقی نہ کوئی کسر رہی تھی۔۔۔

کہا المدد محمد۔۔۔

اسکی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ شردہا نے دیکھا اسکی بند آنکھوں کے کناروں سے آنسوؤں کی ایک لکیر بہتی ہوئی اسکے بالوں میں گم ہو گئی تھی۔

کہا المدد محمد۔۔۔ کہا المدد محمد۔۔۔ تو ابھر گیا سفینہ۔۔۔

اسنے سسکی لی تھی۔ وہ کسی سحر زدہ کی طرح کھڑی رہی۔

میری آرزو محمد۔۔۔ میری جستجو مدینہ۔۔۔

نہ کلیم کا تصور نہ خیالِ طورِ سینا۔۔

وہ ایک لمحے کو چپ ہوا۔ آندھی کا شور تیز ہو گیا تھا۔ شردہا دروازے پر ہاتھ جمائے جیسے جامد ہو چکی تھی۔ اسکی آنکھوں کی پتلیاں بھی ساکت تھیں۔

سوا اسکے میرے دل میں کوئی آرزو نہیں ہے۔۔

مجھے موت بھی جو آئے۔۔ آئے۔۔

مجھے موت بھی جو آئے۔۔۔

مجھے موت بھی جو آئے۔۔۔

تو ہو سامنے مدینہ۔۔۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
مجھے موت بھی جو آئے تو ہو سامنے مدینہ۔۔۔

میری آرزو محمد میری جستجو مدینہ۔۔

وہ اب سسکیوں سے رو رہا تھا۔ اسکی بند آنکھوں سے آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے۔ اور رو تو وہ بھی رہی تھی مگر اسے احساس نہ تھا۔

کبھی اے شکیل دل سے نہ مٹے خیالِ احمد

اسی آرزو میں مرنا۔۔

مرنا۔۔

اسی آرزو میں مرنا۔۔۔

اسی آرزو میں جینا۔۔۔

اسی آرزو میں مرنا اسی آرزو میں جینا۔۔۔

نہ کلیم کا تصور نہ خیالِ طورِ سینا

میری آرزو محمد میری جستجو مدینہ۔۔۔

اسکی آواز رک گئی تھی۔ شردہا کو لگا جیسے دنیا میں گہرا سکوت طاری ہو گیا ہو۔
ولید نے آنکھیں کھولیں اور پھر شردہا کو کسی سنگی بت کی طرح کمرے کے
دروازے پر ایستادہ دیکھ کر وہ بے طرح چونکا۔ اسکا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر
تھا۔ ولید کے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ پلٹی اور چھت پر جاتی کچی سیڑھیوں پر
آبیٹھی۔ تیز آندھی اسکے دوپٹے کو اڑا رہی تھی۔ اسنے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔
اسکے دل کا عجب حال تھا۔ وہ بارہا بتوں کے آگے پراتھنا کرتے ہوئے رو پڑتی
تھی مگر ایسی بے خودی تو عبادت کرتے ہوئے اس پر کبھی طاری نہ ہوئی جیسی
ولید کو نماز پڑھتے دیکھ کر اور آج نعت پڑھتے دیکھ کر ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ
جانتی بھی نہ تھی کہ ولید کیا پڑھ رہا ہے مگر وہ جو بھی پڑھ رہا تھا اسمیں لفظ
محمد کی تکرار اسکے دل کو نرم کر رہی تھی۔۔۔ بے قرار کر رہی تھی۔ اسکا جی
چاہا وہ بھی یہ نام پکارے۔ بار بار پکارے۔ محمد۔۔۔ کیسا پیارا نام تھا۔ اس سے
پیارا نام تو ساری کائنات میں کسی کا نہیں۔ شردہا کا دل کیسے نہ پگھلتا۔۔۔

محمد۔۔

اسکے لب ہلے اور ہلکی سی آواز نکلی۔ اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلہ بہہ نکلا
تھا۔ محمد۔۔۔

اسنے پھر سرکار دو عالم کو پکارا۔ آسمانوں نے اسکی پکار کا ساتھ دیا اور زوردار
گھن گرج کیساتھ ہی موٹی موٹی بوندیں ایک تواتر سے گرنے لگیں۔

اللہ۔۔۔ محمد۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیئے گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ اور بارش
تڑا تڑا اسکے سر پر برس رہی تھی۔۔ وہ بھگیٹی جا رہی تھی اسکی آنکھیں تیزی
سے برس رہی تھی اور ان آنسوؤں میں اسکے دل پہ نقش کفر و الحاد کی کالک
دھلتی جا رہی تھی۔ اسنے رحمت دو عالم کو پکارا تھا وہ نامراد کیسے رہ سکتی تھی۔۔
اسکے گمراہ دل کو راہ دکھا دی گئی تھی۔۔



کیا ہوا نثر دہا اتنی چپ کیوں ہو

یونہی۔

میری کوئی بات بری لگی ہے۔

نہیں۔

پھر۔

کچھ بھی نہیں۔

سچ بولو۔

سچ ہی بول رہی ہوں ادھارک۔

تمہاری آنکھیں تمہاری زبان کا ساتھ نہیں دے رہی۔ ولید نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ شردہا نے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ وہ اپنے دل کی حالت کسی پر عیاں نہ کرنا چاہتی تھی۔

میں پانی بھر کر لاتی ہوں۔ تم گھر کا کھیال رکھنا۔ وہ گھڑا اٹھا کر گھر سے باہر نکل آئی۔ مناسب رفتار سے چلتے ہوئے وہ چشمے پر آئی اور اسکے کنارے بیٹھ گئی۔ چشمہ ایک رفتار سے بہہ رہا تھا۔ اسنے جھک کر ہاتھوں کے کٹورے میں پانی بھرا اور گھاس پر اچھال دیا۔

اری شردہا۔۔ مردانہ پکار پر وہ بے طرح چونکی پھر گردن موڑ کر دیکھا۔ رام ناتھ اسکی جانب چلا آ رہا تھا۔ شردہا کے اعصاب تن گئے۔

کیا کر رہی ہے ادھر۔

دکھائی نہیں دیتا۔ پانی بھرنے آئی ہوں۔ وہ تنک کر بولی۔ رام ناتھ اسکے سر پر آن رکا۔

اکیلی گھر سے مت نکلا کر۔

تجھے کیا تکلیف ہے۔

ہونے والا پتی ہوں تیرا۔ اجت کیا کر میری۔ اسنے رعب جھاڑا۔
پہلے اجت کے لائق تو بن جا۔ شردہا نے گھڑا بھرا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
جبان سنبھال کے بات کر سمجھی۔

اپنی حد میں رہ۔ ڈرتی میں کسی کے باپ سے بھی نہیں۔

ڈریں گے تو تیرے پچھلے بھی پتہ ہے مجھے تو آجکل کن چکروں میں پڑی ہوئی
ہے وہ جو تیرا رشتہ دار آیا ہوا ہے ناں اسکے سپنے دیکھ رہی ہے تو آجکل۔
اپنی بکواس بند رکھ۔ وہ تمللا گئی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

سچ سننے کی ہمت نہیں نہیں ناں۔ مگر میں بھی تجھے چین نہ لینے دوں گا۔ دس
دن کے اندر اندر تجھے اپنی دھرم پتی نہ بنایا تو رام ناتھ نام نہیں میرا۔ وہ منہ
پر ہاتھ پھیر کر اسے چیلنج کر کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اسکی نظروں سے دور ہو گیا
تھا۔ شردہا بوجھل دل کیساتھ واپس گھر چلی آئی۔



ارے بھئی کیا بتاؤں جس دن سے کراچی سے واپس گئے ہیں زین نے تو بس
ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے۔ سلمیٰ آنٹی کے پاس جانا ہے سلمیٰ آنٹی کے پاس
جانا ہے۔ رو رو کر برا حشر کر لیا ہے اپنا۔ ناچار مجھے اسکی ضد کے آگے ہتھیار

ڈالنے پڑے اور چلی آئی۔ مسز اسلم ایکبار پھر اپنا گھر میں موجود تھیں۔ زین بھی انکے ہمراہ آیا تھا اور اس وقت سلمیٰ کی گود میں بیٹھا اس کو جانے کو نسی کہانیاں سنا رہا تھا۔

سلمیٰ بہت نرم دل لڑکی ہے۔ اسلیے زین اس سے اتنا مانوس ہو گیا ہے۔ قدسیہ باجی نے مسکرا کر جواب دیا۔

بالکل۔ بس زین تو اسکا دیونہ ہو گیا ہے کہتا ہے سلمیٰ آنٹی کو ساتھ ہی لیجاتے ہیں۔ مسز اسلم مسکرائیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اسکو کچھ دن کے لیے اپنے ساتھ اسلام آباد لے جاؤں انہوں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ دیکھیں یہ ہمارے رولز کے خلاف ہے۔۔۔ قدسیہ باجی ہچکچائیں۔

سلمیٰ سے پوچھ لیجیے ناں میں ہر طرح کی گارنٹی دینے کو تیار ہوں بالکل اپنی بچیوں کی طرح رکھوں گی اسق اپنے پاس۔ سلمیٰ چلوگی میرے ساتھ اسلام آباد۔ انہوں نے یکدم ایکسائیٹڈ ہوتے ہوئے سلمیٰ کو بھی شامل گفتگو کیا۔ وہ سر اٹھا کر انکی طرف دیکھنے لگی۔

جی۔۔۔ کچھ کہا آپ نے۔۔۔

میں نے پوچھا اسلام آباد چلوگی ہمارے ساتھ۔

اسلام آباد۔ سلمیٰ کے لب ہلے۔ اسکے چہرے پر ناقابل فہم سے تغیرات تھے۔

چلوں گی۔

دیکھیں اب تو سلمیٰ بھی راضی ہوگئی۔ مسز اسلم نے قدسیہ باجی سے کہا۔

اچھا دیکھیں اس سلسلے میں کچھ رولز ہیں انکو فالو کرنا پڑے گا سب سے پہلے مجھے فیصل بھائی سے بات کرنا ہوگی۔ آپ کل تشریف لائیے گا پھر میں آپکو کوئی حتمی جواب دوں گی کیونکہ آخری فیصلہ تو فیصل بھائی ہی کرتے ہیں۔ قدسیہ باجی نے جواب دیا۔ سلمیٰ پھر سے زین میں مگن ہوگئی تھی۔ مسز اسلم نے سر ہلادیا۔ اب انہیں کل کا انتظار تھا۔



تیرے سر آئے تھے آج۔ شکر داس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سن کر شردہا کا دل کھانے سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ سر اٹھا کر باپ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

کہہ رہے تھے کہ اب شیتل بھی اپنے گھر کی ہوگئی ہے گھر سونا ہو گیا ہے اسلیے سوچ رہے ہیں کہ بہو لے آئیں۔ ویواہ کی تاریخ مانگ رہے تھے میں نے کہا شبھ مہورت نکال کر ہی تاریخ رکھیں۔ سو انہوں نے کل مجھے اپنے گھر بلایا ہے وہیں ہم شبھ مہورت دیکھ کر تاریخ طے کر دیں گے۔ شرداس رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے اسے بتا رہا تھا اور شردہا کی جیسے بھوک مرتی جارہی تھی۔

باپو اتنی جلدی کیا ہے۔

جلدی کا ہے کی بٹیا۔ اب ویواہ تو کرنا ہی ہے ناں۔ تین سال ہونے کو آئے

تیری سگائی کو۔

پھر بھی باپو۔۔

پھر بھی کیا پگلی۔ میں جانتا ہوں تو مجھے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی مگر بیٹیوں کو تو ایک دن باپ کے گھر سے جانا ہی ہوتا ہے ناں۔ اسنے شفقت آمیز لہجے میں کہا تو وہ چپ کر گئی وہ اسے کیسے بتاتی کہ اسکا دل اسے چھوڑ کر جانے کے خیال سے ملول نہ تھا۔ اسکے ملال کی وجہ تو کچھ اور تھی۔ اور وہ وجہ اگر شکرداس جان جاتا تو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا۔



اگلے روز شردہا صبح سے جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں چکراتی پھر رہی تھی۔ شکرداس نے صبح کی پوجا کے بعد رام ناتھ کے ہاں چلے جانا تھا اور شردہا کے دل کو کسی طور سکون نہ تھا۔ وہ رام ناتھ سے شادی نہ کرنا چاہتی تھی وہ کسی بھی ہندو سے شادی نہ کرنا چاہتی تھی کہ اسکے دل میں بارڈر پار سے آئے اک مسلمان کا پیکر سج گیا تھا۔ وہ جانتی تھی ولید تو مسافر ہے جانے کب اذنِ رخصت مل جائے اسے مگر پھر بھی اس سے محبت کرنے لگی تھی۔۔۔ شدت سے۔۔۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے۔۔۔ اور اسکے ساتھ نے اسکے دل کو جس غیر محسوس انداز میں اپنے مذہب اور پتھر کی بے جان مورتیوں کے عبادت سے متنفر کیا تھا اس پر تو وہ خود بھی حیران تھی۔ کتنے ہی دن گزرے

تھے کہ وہ پوجا والے کمرے میں نہ گئی تھی مندر نہ گئی تھی۔ اسکے دل پر اک عجب سی وحشت طاری ہو جاتی تھی اس تصور سے کہ وہ ان بیجان مورتیوں کی عبادت کرے۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تو وہ چونکی۔ ولید آنگن میں آ بیٹھا تھا۔ اسکے بال بکھرے اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

ناشتہ بنادوں۔ شر دہا نے پوچھا۔

نہیں۔ بھوک نہیں۔ وہ بہت سنجیدہ سے لہجے میں بولا۔ شر دہا جھولا جھولتے ہوئے اسے ہی تک رہی تھی۔ وہ کچھ متفکر نظر آ رہا تھا۔
 باپو میرے اور رام ناتھ دیواہ کا مہورت نکالنے گیا ہوا ہے میرے سسرال۔
 اسنے اسے اطلاع دی۔

ہممم اچھی بات ہے۔ اسنے بے دھیانی سے جواب دیا۔

کاہے کی اچھی بات ہے۔۔

شادی ہو رہی ہے تمہاری یہ اچھی بات ہی تو ہے۔

جس سے ہو رہی ہے اسکے بارے کیا کہو گے۔

میں کسی کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ مجھے بس یہاں سے جانا ہے جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔ وہ بیزاری سے بولا تو شر دہا کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ وہ

جھولے سے اتری اور گھر کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔ اسکا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔ سارا دن ولید نے اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ کچھ دیر کو گھر سے باہر بھی گیا تھا۔ واپس آیا تو پہلے سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ شام کو شکر داس لوٹا تو اسنے بتایا کہ ٹھیک ایک ہفتے بعد شادی کا مہورت نکلا ہے۔ شردہا کے دل میں سناٹا اتر آیا تھا۔ ولید نے شکر داس کو مبارکباد دی تھی۔ وہ اجنبی سا نظر آ رہا تھا۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر مسکراتی رہی مگر رات کے پچھلے پہر جب سب سو گئے تو اٹھ کر باہر سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ آنسو قطرہ قطرہ اسکی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

اللہ۔۔۔ اسکے دل نے پکارا تھا۔ اسے لگا دور آسمانوں سے اسکی پکار کا جواب آیا ہے۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور بے آواز رونے لگی۔ وہ خاموشی کی زبان میں رب کائنات سے اپنا ربط قائم کر رہی تھی۔ وہ بے بس تھی کمزور تھی اسکی داد رسی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اسنے رب کائنات کو پکارا تھا۔ اور وہ اسکی ہر ہر آہ کو سن رہا تھا۔ شردہا کو یقین آنے لگا کہ انسان کا واحد سہارا صرف اللہ ہی ہے۔ ولید حسن اسکا سہارا نہ تھا شردہا نے یہ اس رات جانا تھا۔ اور صبح ہوتے ہوتے اسکے دل کو واقعی قرار مل گیا تھا۔



اما!

جی بیٹا۔

بابا کیسے تھے؟

بالکل تم جیسے۔

اما میں لک کی نہیں نیچر کی بات کر رہا ہوں۔

نیچر بھی تمہاری بالکل انکے جیسی ہی ہے بیٹا۔ ویسی ہی کئیرنگ اور لونگ۔

اما! آپ نے کبھی مجھے اپنی اور بابا کی شادی کی تصویریں نہیں دکھائیں۔

بیٹا بتایا تو تھا وہ پھپھو کے پاد ہیں وہ جب واپس آئیگی تو لیکر آئیگی پھر دیکھ

لینا۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

پھپھو کب آئیگی اما؟

اگلے مہینے آئیگی۔

سچ اما۔۔۔

جی بیٹا۔ میری کل بات ہوئی تھی ان سے کہہ رہی تھیں کہ بہت سارے

دنوں کے لیے آرہی ہیں۔

واؤ۔ میں ابھی دادو کو بتا کر آتا ہوں۔

انکو پتہ ہے بیٹے۔

سب کو ہی پتہ ہے۔ ایک مجھے ہی نہیں بتایا کسی نے۔

پھپھو کی کال رات کو آئی تھی ناں اور تب آپ سو رہے تھے۔ اور صبح آپ سکول چلے گئے۔ ویسے وہ آپکا بہت پوچھ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ دانی کے لیے بہت سی چیزیں لے کر آئیگی۔

واؤ۔ مجھے تو بہت ایکسائٹمنٹ ہو رہی ہے ماما۔ پھپھو کیساتھ علی اور مریم بھی آئینگے ناں؟

بالکل آئینگے۔

کتنا مزہ آئے گا۔

بہت مزہ آئے گا۔ بس اب آپ سو جاؤ ایک گھنٹے بعد آپکے ٹیوٹر آجائینگے چلو آنکھیں بند کرو شاباش۔

اوکے ماما۔ لو یو۔

لو یو ٹو مائے چائلڈ۔



اری شردھا! پوجا نے اسے چشمے پر جالیا تھا وہ گھڑا دائیں جانب رکھے پاؤں چشمے میں لٹکائے گم سم سی بیٹھی تھی۔ پوجا کی کھنکھتی پکار پر چونکی۔

تو کب آئی؟ اسنے پھیکی سی مسکراہٹ کیساتھ پوچھا۔

ابھی آئی ہوں یار۔ تو بتا کیا ہوا ہے تجھے۔ وہ بھی دھپ سے اسکے برابر آ بیٹھی۔

کچھ نہیں مجھے کیا ہونا ہے۔

چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟

ایسی کوئی بات نہیں۔

جیسے میں تو تجھے جانتی ہی نہیں ہوں ناں۔ ایک ہفتے بعد تیرا دیواہ ہے اور تو بالکل بھی خوش نظر نہیں آرہی۔

خوش ہوں میں تو چتنا نہ کر۔
خوش ہے تو۔۔ ایسی ہوتی ہے خوش لوگوں کی شکل جیسی تو نے بنائی ہوئی ہے۔

پوجا کیا تو بھی۔ میں ٹھیک ہوں بالکل۔ بس مجھے باپو کی چتنا ہے وہ میرے جانے کے بعد اکیلا کیسے رہے گا۔ اسنے بات بنائی۔

لو یہ کیا بات ہوئی ہم ہیں ناں۔ ہم پنڈت جی کا بہت اچھے سے دھیان رکھیں گے تو بس چتنا نہ کر اور آنے والی زندگی کے بارے میں شبھ شبھ سوچ۔ یہ تیرے چتنا کرنے کے نہیں سپنے دیکھنے کے دن ہیں پگلی۔ پوجا نے پیار سے اسکے سر پر ہلکی سی چپت لگائی تو وہ بمشکل مسکرا دی۔

چل گھر چلیں۔ آج شام کو ہم ڈھولکی رکھ لیں گے ماتا جی کہہ رہی تھیں آج

سے تجھے مایوں بٹھا دینا ہے۔ پوجا اٹھتے ہوئے بولی۔ شردہا نے گھڑا اٹھایا اور اسکی تقلید کی۔ پوجا اور بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر اسکی سماعتیں سن کہاں رہی تھیں۔ اس کے ارد گرد تو بس ایک ہی صدا تھی۔۔

میرے ڈوبنے میں باقی نہ کوئی کسر رہی تھی۔۔

کہا المدد محمد تو ابھر گیا سفینہ۔۔۔



لڑکیاں آنگن میں دریاں بچھا کر گول دائرے میں بیٹھی تھیں اور ڈھولکی پر خوب گانے گائے جارہے تھے۔ وہ سب زرتار لباسوں میں ملبوس تھیں۔ اور ان سب کے درمیان پیلی ساڑھی میں ملبوس شردہا سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اسکے دل میں اک طوفان تھا۔ شور ہی شور تھا۔ اتنا شور کہ آس پاس کا شور تو جیسے ان آوازوں میں دب کر ہی رہ گیا تھا۔

ولید سر شام ہی گھر سے نکلا تھا اور اب تک اسکی واپسی نہ ہوئی تھی۔ شردہا جانتی تھی کہ وہ بارڈر کے چکر کاٹتا ہے واپسی کے راستے تلاش کر رہا ہے۔ وہ اسکی مدد نہ کر سکتی تھی مگر اسکے لیے ہر وقت دعا کرتی تھی کہ وہ اپنے وطن جانے کی راہ پالے۔ وہ انہی سوچوں میں گم رہی اور لڑکیاں نو بجے ڈھولک رکھ کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔

بیٹی ادھارک کہاں ہے؟ شکر داس نے اس سے پوچھا۔

باہر گیا ہے باپو۔ گھر بیٹھے بیٹھے تنگ آگیا ہے۔ اسنے جواب دیا۔

بیٹا مجھے کہنا تو نہیں چاہیے مگر میرے من میں ایک سوال ہے آخر یہ ادھارک ہمارے گھر سے جائیگا کب۔ اس نے تو ادھر مستقل ڈیرہ ہی ڈال لیا ہے شکر داس نے بلاآخر وہ بات کردی تھی جو شردها سننا نہ چاہتی تھی۔

چلا جائے گا باپو۔ وہ برا آدمی تو نہیں۔

برا آدمی نہیں ہے بیٹا مگر ہمارا رشتہ دار تو نہیں جو یہیں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ تیرا ویواہ گزر جائے پھر میں اس سے کھل کر بات کرونگا۔ وہ اپنے گھٹنوں پر زور دے کر اٹھا اور ہری اوم ہری اوم کی صدا بلند کرتا پوجا والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی شردها نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ولید اندر داخل ہوا۔

تم کہاں تھے؟

کام سے گیا تھا۔ وہ سنجیدہ سے لہجے میں جواب دے کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا آنگن پار کر کے کمرے میں چلا گیا شردها چند لمحے وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر اسکے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

تم بارڈر تک گئے تھے ناں؟ اسنے بہت مدھم آواز میں پوچھا۔

ہاں۔

کچھ بات بنی؟

ہاں۔ کچھ کچھ۔

میری مدد چاہیے؟

نہیں۔

ادھارک میں تمہاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں۔ ادھر بارڈر پر جو رنگروٹ ڈپٹی (ڈیوٹی) کرتے ہیں وہ میرے باپو کی بہت اجت (عزت) کرتے ہیں۔ میں ان سے تمہاری بات چیت کروا دیتی ہوں تم کسی بہانے سے ان سے بارڈر کی سیر کی اجازت لے لینا اور پھر چپکے سے اپنے دیش نکل لینا۔ شردھا نے بہت مدھم آواز میں پلان تیار کر کے اسے بتایا۔

میں رنبیر سنگھ پورہ کی طرف سے خاردار تاروں کے نیچے سے بھی جاسکتا ہوں مگر اسمیں جان کا خطرہ ہے میں متواتر دو دنوں سے وہیں جا رہا ہوں۔ ولید نے اسے بتایا۔

ادھارک تم میری مانو تو میرے ساتھ کل چلنا۔

شردھا میں پاکستانی فوجی ہوں سات سال بھارت کی قید میں رہا ہوں اور انکو ڈاج دے کر بھاگا ہوں مجھے یقین ہے کہ میرا حلیہ بمعہ تصویر ادھر کے سب بارڈرز پر پہنچا دیا گیا ہوگا تاکہ میں پاکستان واپس نہ جاسکوں۔ مجھے بہت

رازداری کیساتھ واپس جانا ہے۔

شردہا۔۔۔ شکر داس کی پکار پر وہ کمرے سے باہر چلی گئی وہ اسے پانی گرم کرنے کو کہہ رہا تھا وہ سونے سے قبل نہا کر پاٹھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ شردہا نے تعمیل کی۔ پھر باپو کے سو جانے کے بعد وہ چپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے سے باہر نکلی اور ولید کے کمرے کے دروازے پر آکر ہلکی سی دستک دی۔ ولید نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر دروازہ کھول دیا تھا۔

تم۔۔۔ اس وقت۔۔۔

ہاں۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ وہ سرگوشیوں میں بولی۔
جاؤ جا کر سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔ اسنے رکھائی سے کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔
شردہا چند لمحے بند دروازے کو گھورتی رہی پھر ایک بے اختیار سی مسکراہٹ اسکے چہرے کو دمکا گئی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آئی اور لیٹ گئی۔

اگلے روز شکر داس سویرے ہی سویرے مندر کے لیے نکل گیا، ولید ابھی نماز کے لیے نہ اٹھا تھا۔ وہ بڑی سی سیاہ چادر اوڑھ کر گھر سے باہر نکلی اور دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کر کھیتوں کی جانب چل دی۔ اسکے قدموں کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ کچھ ہی دیر میں سچیت گڑھ بارڈر لائن کے قریب پہنچ گئی تھی۔ گیٹ اس وقت بند تھا اور دور سے بھی پہرہ دیتے رنگروٹ نظر

آرہے تھے۔ شردہا اس طرف بڑھتی چلی آئی۔

اری او چھوری کدھر آرہی ہے یہ بارڈر ہے نظر نہیں آتا۔ ایک سپاہی نے دور سے ہی اسے پکارا۔

مجھے لکڑیاں چاہیے۔ اسنے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔

ادھر کوئی لکڑیاں نہیں چل بھاگ ادھر سے۔ اس نے اسے ڈپٹا۔

ارے تم مجھے جانتے نہیں ہو کیا۔ میں پنڈت کی بیٹی ہوں۔ اسنے ذرا رعب جھاڑنا چاہا۔

ارے ناری کاہے کو ہماری نوکری پہ لات مارتی ہے چل شاباش جا ادھر سے۔ لکڑیاں میں سویرے کھود (خود) پنڈت جی کے گھر پہنچا دوں گا۔ وہ اب اسکے سامنے آن رکا تھا۔

فوجی بابو مجھے بھی وہ گیٹ دیکھنا ہے۔ کسی روز دکھا دو ناں۔ وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولی۔

اری وہاں پہ صرف ٹورسٹ آتے ہیں۔ جن کے پاس اسپیشل اجازت نامہ ہوتا ہے۔

تم چاہو تو دکھا سکتے ہو۔ کوشش کرو ناں مجھے لے جاؤ وہاں۔ بھگوان کی سوگند مجھے بڑا شوق ہے اس گیٹ کے پار جانے کا۔ وہ اب حسرت آمیز لہجے میں کہہ

رہی تھی۔

اری چھوری۔۔ اچھا چل ٹھیک ہے میں کچھ کرتا ہوں۔ ابھی تو گھر جا۔
 فوجی بابو میری موسیٰ کا لڑکا بھی چلے گا میرے ساتھ اس پار اسے بھی بڑا شوق
 ہے۔ سری نگر سے آیا ہے بارڈر دیکھنے۔

اچھا اچھا اسکو بھی لے چلنا ابھی تو جا واپس۔ اسنے عجلت مچادی تو شردها سرہلا کر
 واپسی کے لیے پلٹ گئی۔ اب مشرقی افق پر سرخی پھیل رہی تھی۔ وہ اس
 وقت گندم کے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ دور دور تک کوئی ذی
 روح نہ تھا۔ وہ اپنی دھن میں مست چلی جا رہی تھی جب اچانک اسے اپنے
 عقب میں آہٹ کا احساس ہوا اور وہ چونک کر پلٹی۔ رام ناتھ اسکے پیچھے آرہا
 تھا۔ شردها کے اعصاب تن گئے۔

کدھر گئی تھی تو اتنے سویرے سویرے؟ اسنے کڑے لہجے میں پوچھا۔
 تجھ سے مطلب۔

ہونے والا پتی ہوں تیرا۔ وہ اسکے قریب آکر سخت لہجے میں بولا۔
 جب ہو جائے گا ناں پتی تب رعب جھاڑنا۔ ابھی میرا سر مت کھا۔ وہ رکھائی
 سے بولی تو رام ناتھ سے اس کی کلائی تھام لی۔
 تیرے سارے کس بل نکال دوں گا میں۔

ہاتھ چھوڑ میرا۔ گندے۔ موالی۔ اسنے یکدم تمللا کر اسکے چہرے پہ ایک زوردار
چماٹ رسید کر دیا تھا۔ رام ناتھ ایک لمحے کو تو دنگ رہ گیا مگر اگلے ہی لمحے
اسکی آنکھیں آگ اگلنے لگیں۔

تیری یہ ہمت کہ تو مجھے تھپڑ مارے۔

ہاں ہے ہمت جب جب تو مجھے ہاتھ لگائے گا میں یونہی تجھے چماٹ مارو گی۔
سمجھا تو۔ وہ دودو بولی۔

اور وہ جو تیرے گھر میں رہتا ہے اسکے ساتھ تو بڑی خوش رہتی ہے تو۔ کیا وہ
نہیں چھوٹا ہوگا تجھے۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interview

وہ تیری طرح ہوس کا پجاری نہیں ہے۔

بڑی آگ لگتی ہے اسکے ذکر پر تجھے۔

جا جا کر اپنا کام کر ورنہ ابھی ایک مارا ہے۔ تین چار ایسے مارو گی کہ منہ
دکھانے لائق نہیں رہے گا کسی کو۔ وہ کہہ کر تیز قدموں سے آگے بڑھی مگر
رام ناتھ نے لپک کر اسکی کلائی تھام لی اور اسکے کھینچ کر جھاڑیوں میں لے
گیا۔ اس پر درندگی سوار تھی۔ شردہا نے چلانا چاہا مگر اسکے منہ پر رام ناتھ کا
بھاری ہاتھ جما ہوا تھا۔ سچیت گڑھ پر مکمل سکوت طاری تھا۔ گندم کے کھیت
خاموش تھے۔ مندر کے گھنٹوں اور بھجن کی آوازیں بھی اس سکوت کو توڑنے
میں ناکام تھیں۔ اور جب کسان اپنے بیلوں کو لیکر کھیتوں کی جانب بڑھے تو

رام ناتھ اپنی ہوس پوری کر چکا تھا۔

اب تو اس گندے شریر کیساتھ رہ کیونکہ اب میں تجھ سے ویواہ کرنے والا نہیں ہاں مگر تجھے چھونے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ تلخ لہجے میں کہہ کر اسکے قریب زمین پہ تھوک کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا دور کھیتوں میں گم ہو گیا تھا۔ شر دہانے کچھ دور جھاڑیوں میں الجھی اپنی سیاہ چادر اٹھا کر اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹی اور اپنے گھر کی طرف چل دی۔ اسکی آنکھیں ایک تواتر سے بہہ رہی تھیں۔ اسکے ارد گرد بس ایک ہی پکار تھی۔ وہ اپنے ہر انسان سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے۔

اللہ نور ہے۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

وہ اس نور سے دور تھی تبھی تو اسکے وجود کو ناپاک کر دیا گیا تھا۔ ایک یہ مرد تھا ہوس کا پچاری۔ اور ایک مرد وہ تھا جو گزشتہ دو ماہ سے اسکے گھر میں دن رات رہتا تھا۔ جس نے بھولے سے بھی کبھی شر دہا کو چھوا نہ تھا۔ وہ جو شر دہا کی جانب غور سے دیکھتا بھی نہ تھا۔ وہ مسلمان مرد تھا۔ حیا کا درس اسکو اسکے دین نے دیا تھا۔ رام ناتھ اور ولید میں یہی تو فرق تھا رام ناتھ ہندو مذہب کا پیروکار تھا جس میں مرد کو برتر اور عورت کو کمتر تصور کیا جاتا ہے۔ جس کے ماننے والے عورت کو باندی سمجھتے ہیں جس کے ماننے والے سماج میں عورت مرد کے برابر بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتی۔ اور وہ اسلام کا پیروکار مرد

کھانے سے قبل پہلا نوالہ شردہا کی جانب بڑھاتا تھا۔ جنت اور دوزخ کا فرق شردہا پر واضح ہو گیا تھا۔ اسے دوزخ میں نہیں جانا تھا۔ اسے جنت چاہیے تھی۔ وہ دیوانہ وار گھر کے اندر داخل ہوئی۔ ولید آنگن میں چارپائی پر بیٹھا تھا وہ تیر کی طرح اسکے قدموں کے پاس آ بیٹھی۔

ادھارک! مجھے نور دے دو۔۔ وہ رو رہی تھی۔

کیا ہوا شردہا۔۔ ولید اسکے بکھرے بال اور چہرے پر ہونٹ کے قریب نیل دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

مجھے مسلمان ہونا ہے ادھارک۔۔ مجھے اللہ اور محمد کا نام لینا ہے۔ وہ اسکے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے منت کر رہی تھی۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

شردہا! خود کو سنبھالو۔ دین تبدیل کر لینا وقتی جذباتیت کو فیصلہ نہیں ہوتا۔

وقتی کچھ نہیں ہے ادھارک۔ یہ دیکھو میرا وجود ناپاک ہو گیا ہے گندا ہو گیا ہے

مجھے اسکو پوتر کرنا ہے۔ تم کہتے ہو اللہ نور ہے مجھے وہ نور دے دو ناں

ادھارک۔۔ میں پوتر ہونا چاہتی ہوں۔ اسکی آواز حلق میں گھٹ گئی تھی۔

کیا ہوا ہے شردہا مجھے بتاؤ۔ تمہارے چوٹ کیسے آئی؟ ولید نے نرم لہجے میں پوچھا۔

میرے ہونے والے پتی نے میرے شریر سے اپنی ہوس پوری کر لی ادھارک۔

میں گندی ہو گئی۔

کیا۔۔ ولید بے اختیار جیسے اچھل پڑا تھا۔

تم سوچ کیا رہے ہو ادھارک مجھے نور دے دو ناں۔ تم کیوں اتنے کٹھور بن رہے ہو۔ میں تم سے بھیک مانگ رہی ہوں۔ مجھے اس دھرم میں نہیں رہنا جس نے عورت کو عزت نہیں دی۔ مجھے اپنے دھرم میں لے آؤ ادھارک جہاں عورت کو عزت ملتی ہے۔ وہ اسکے مقابل کھڑی بلک رہی تھی۔ اسکی چادر اسکے سر سے گر گئی تھی۔ ولید نے ایک نظر اپنے سامنے کھڑی چھوٹی سی لڑکی کی طرف دیکھا جس کے دل میں ہدایت کی رملق تو ہمیشہ سے ہی موجود تھی۔ ولید نے چادر اس کے سر پر ڈالی۔

پڑھو۔۔ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔

لا الہ۔۔

لا الہ۔۔ شردہا نے اسکے پیچھے دہرایا۔

الا اللہ۔

الا اللہ۔ اسکی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی شدت میں کمی آنے لگی۔

محمد رسول اللہ۔

محمد۔۔۔ اسکی آواز حلق میں گھٹ گئی تھی۔۔ ہیبت سے۔۔ رعب سے۔۔ محبت

سے۔۔ عقیدت سے۔۔

محمد رسول اللہ۔ ولید نے پھر دہرایا۔

محمد رسول اللہ۔ وہ بہتے آنسوؤں کی یورش میں دہرا گئی۔

میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اب وہ اسے ترجمہ بتا رہا تھا۔

میں شہادت دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اسنے دل پہ ہاتھ رکھ کر دہرایا۔ اسکی دھڑکنوں میں جیسے اک تلاطم سا اٹھا تھا۔

اور محمد اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

اور محمد اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ اسنے گواہی دے دی تھی۔ دل کو جیسے صدیوں بعد قرار ملا تھا وہ دل پر ہاتھ رکھے رکھے وہیں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ولید نے گھڑے سے پانی لیا اور اسے دیا وہ چپ چاپ پانی پی گئی۔

میں رام ناتھ کو اچھی طرح دیکھ لوں تم بالکل فکر مت کرو اب کوئی بھی تمہیں کوئی بھی چھو نہیں سکتا تم مسلمان ہو اور تمہاری حفاظت میرے ذمے ہے۔ اسنے اسکے لیے رات کی بچی روٹی اور سالن لاتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

اللہ میری رکھشا کر لے گا ادھارک اب میں اسکی ہوں۔ وہ مطمئن لہجے میں

بولی۔ ولید نے کھانا اسکے سامنے رکھا۔

لو کچھ کھاؤ شاباش۔ اسنے نرم لہجے میں کہا۔

کھانے سے پہلے اللہ کا نام لیتے ہیں ناں ادھارک؟

ہاں۔ پڑھو بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اسنے اسے پڑھایا تھا شردہا نے یہ الفاظ اسکے پیچھے دہرائے اور لقمہ توڑ کر کھانے لگی۔ اسکے انداز میں عجب سی رغبت تھی۔ ولید چپ چاپ ایک جانب کھڑا رہا۔ اسکے دل میں اس لڑکی کے لیے ہمدردی تھی۔ وہ اب جانے سے قبل اسکو کسی محفوظ مقام پر پہنچا کر یا جانا چاہتا تھا۔



دیکھیں مسز اسلم! سلمیٰ کو اگر آپ مستقلاً اپنے ساتھ لیکر جانا چاہتی ہیں تو اس سے قبل آپکو اس کی سرپرست بننا ہوگا آفیشلی۔ یہ ایک بے سہارا لڑکی ہے سو اسکے مستقبل کو محفوظ کرنا بھی ہمارے لیے اہم ہے۔ فیصل بھائی چاہتے ہیں کہ آپ باقاعدہ طور پر اسکی گارڈین بن جائیں اور ایک سال تک ہم بھی وقتاً فوقتاً چیک کرتے رہیں گے کہ آپ نے سلمیٰ کو کس حال میں رکھا ہوا ہے۔ آپ ایک باعزت اور قابل بھروسہ خاتون ہیں مگر ہم پر بھی کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں یہ سب خواتین بچے بچیاں جو یہاں رہتے ہیں یہ سب ہماری ذمے داری ہیں اور یہ ہم پر بوجھ قطعاً نہیں سو انکو کسی کو سونپنے سے قبل ہمیں بہت چھان بین کرنا پڑتی ہے تاکہ یہ دکھی لوگ کسی غلط ہاتھ میں نہ چلے

جائیں۔ قدسیہ باجی نے اپنے مخصوص حلیم لہجے میں مسز اسلم کو تمام صورتحال بتادی تھی۔

مجھے سب منظور ہے۔ سلمیٰ میری بیٹی جیسی ہے۔ میں اسکی سرپرست بننے کو تیار ہوں جیسی بھی گارنٹی آپ چاہیں میں دوں گی۔ انہوں نے بلاتامل جواب دیا تھا۔ آج زین انکے ہمراہ نہ آیا تھا۔

ٹھیک ہے پھر آپ یہ فارم بھر دیں۔ اور بقیہ کی فارمیٹسز کے لیے کل تشریف لے آئیے۔ کل فیصل بھائی بھی آپ سے ملاقات کریں گے۔ قدسیہ باجی نے ایک فارم انکے سامنے رکھتے ہوئے کہا تو مسز اسلم نے مسکرا کر سر ہلایا اور فارم بھرنے لگیں۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews



میرا نام رکھ دو ادھارک؟

نام۔۔

ہاں میرا نام بدل دو۔

سوچنا پڑے گا۔

سوچو۔ ایسا نام جو سب سے اچھا ہو۔۔ ادھارک! محمد لڑکیوں کا نام نہیں ہو سکتا؟

نہیں یہ مردوں کا نام ہے۔

مجھے بہت اچھا لگتا ہے یہ نام۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ محمد کیسے ہونگے
اُدھارک۔۔

بہت حسین سب سے اچھے۔ ساری دنیا کے لیے رحمت۔ ولید نے مدھم لہجے
میں جواب دیا۔

وہ عورتوں کی بہت عزت کرتے تھے اُدھارک؟

ہاں بے حد۔ جتنی عزت انہوں نے عورت کو دی ہے اتنی کوئی نہیں دے
سکتا۔ جانتی ہو انکا کوئی بیٹا نہیں تھا چار بیٹیوں کے باپ تھے وہ اور بیٹیوں کو
رحمت سمجھتے تھے۔ انکی سب سے چھوٹی بیٹی فاطمہ انہیں بہت پیاری تھیں۔ اور
وہ جنت کی تمام عورتوں کی سردار ہیں۔ ولید اسے آسان سے آسان اور عام
فہم انداز میں اسلام کی تعلیمات دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کوئی عالم تو نہ
تھا مگر اسکی حتی الامکان کوشش تھی کہ شردہا کو اسلام کی بنیادی نالج دیدے۔

فاطمہ۔۔ شردہا نے زیر لب دہرایا۔ یہ کتنا پیارا نام ہے۔۔

تمہیں اچھا لگا۔

بہت بہت زیادہ۔

پھر تمہارا نام آج سے فاطمہ ہے۔

سچی۔۔۔ یہ ٹھیک ہے۔ وہ اک سرخوشی کے عالم میں بولی۔ میں کتنی بھاگیشالی ہوں جو تم نے مجھے اتنا اچھا نام دیا۔ تمہارا بہت دھننے واد ادھارک وہ بہت خوش تھی بے حد مسرور۔ اپنے ساتھ بیتے ظلم کو جیسے وہ یکسر بھول چکی تھی۔ اس نام کی برکت سے تمہاری زندگی بہت آسان ہوتی جائیگی شردہا بس ایمان پکا رکھنا چاہے کتنی بھی مصیبتیں کیوں نہ آئیں۔ ایک بات یاد رکھنا سیدھے راستے پر چلنے والوں کی راہ میں بہت رکاوٹیں آتی ہیں مگر کامیاب وہی ہوتے ہیں جو ہر رکاوٹ کو ثابت قدمی سے پار کر جائیں جن کا ایمان کبھی نہ ڈمگائے۔

ادھارک میں سب برداشت کر سکتی ہوں بس مجھے کفر کی اس دنیا سے نفرت ہو گئی ہے۔ جہاں پتھر کی مورتوں کی اجت (عزت) جیتے جاگتے انسان سے زیادہ ہے۔ یہ کیسا سماج ہے جہاں عورت کو ساتھ بٹھا کر کھانا نہیں کھلا سکتا مرد وہ بہت

frustrated

نظر آرہی تھی۔

تم دین اسلام کی طرف آگئی ہو شردہا اب تم دلی طور پر مطمئن ہو جاؤ۔ اور جو مصیبتیں آئینیگی انکو برداشت کرتی جانا کیونکہ اللہ مصیبتیں اور مشکلیں بھی انہی پر بھیجتا ہے جن کو وہ چن لیتا ہے۔ ولید نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔ شردہا

نے مسکرا کر سر ہلایا۔

مجھے نماز سکھاؤ اُدھارک۔ اسنے چند لمحوں بعد فرمائش کی۔

ہاں چلو پہلے وضو کر کے آؤ جیسے میں نے طریقہ سکھایا تھا اسی طرح۔

ٹھیک ہے میں ابھی آتی ہوں۔ وہ اٹھ کر صحن میں ایک جانب لگے ہینڈ پمپ کی جانب بڑھ گئی۔



بھگوان جانے رام ناتھ نے رشتہ کیوں توڑا۔ شکر داس از حد پریشان تھا جبکہ فاطمہ یہ خبر سن کر دل ہی دل میں مسرور تھی۔ آج دوپہر میں کسی وقت رام ناتھ اور اسکا باپ مندر آکر رشتے سے انکار کر گئے تھے۔

باپو انکی نیت میں جرور کھوٹ ہوگا۔ تبھی تو یوں انکار کر گئے تو چنتا نہ کر۔ اسنے اطمینان بھرے لہجے میں کہا تھا۔

اری کیسے چنتا نہ کروں۔ تیرے ویواہ میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے جو یہ انکار کر گئے میں تو سماج میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہا سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ تیری اور رام ناتھ کی بات پکی ہے اور ویواہ ہونے والا ہے۔ شکر داس نے متفکرانہ لہجے میں کہا تھا۔

چھوڑ باپو ہم کونسا سماج کے گھر سے کھاتے ہیں کسی کو کیا تکلیف۔ ہماری زندگی

ہے جو جی چاہے کریں۔ وہ لاپرواہی سے جھولے پر بیٹی تھی۔

تو کچھ زیادہ ہی کھوش نظر آرہی ہے۔ کہیں تو نے ہی تو رام ناتھ کو کچھ الٹا سیدھا نہیں بولا۔ شکر داس نے مشکوک نگاہوں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔

میرا کیا لینا دینا اس سے باپو میں تو گھر سے کہیں جاتی بھی نہیں۔ اسنے معصوم صورت بنالی مگر شکر داس مطمئن نہ ہوا تھا تبھی اگلے روز اسنے رام ناتھ کو مندر بلوایا۔ اور وہ چلا بھی آیا تھا۔ اسنے رام ناتھ سے انکار کا سبب پوچھا تو جواباً کچھ دیر کی پس و پیش کے بعد اسنے شردہا کے کردار کو مشکوک قرار دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ وہ ادھارک یعنی ولید میں بھرپور دلچسپی رکھنے کے باعث اسے دھتکاری رہی ہے۔ یہ سننا تھا کہ شکر داس کا پارہ آسمان تک پہنچ گیا۔ وہ اسی وقت مندر سے نکل کر گھر پہنچا دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ آنگن میں کوئی نہ تھا وہ تیر کی طرح ولید کے کمرے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر جارحانہ انداز میں اندر داخل ہوا۔ ولید اس وقت فاطمہ کو نماز کے اشارے سمجھا رہا تھا۔ فاطمہ زمین پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی اور وہ رکوع کے انداز میں جھکا ساتھ ساتھ اسے کلمات بھی سکھا رہا تھا۔ شکر داس جانے کیا سمجھا اسنے آگے بڑھ کر چوٹی سے فاطمہ کو گھسیٹ کر آنگن میں لیجا کر پٹخا۔ فاطمہ کی چیخیں اور ولید کی ارے ارے بے ساختہ تھیں۔

کیا ہو گیا ہے پنڈت جی آپکو۔ ولید فاطمہ کے بچاؤ کے لیے آگے بڑھا۔

تو دفع ہو جا میرے گھر سے بد ذات۔ نکل یہاں سے۔ میری بچی کو خراب کرتا ہے چل نکل یہاں سے موالی۔ اور تو بول۔ تبھی اس کی اتنی طرفداری کرتی تھی کیونکہ اسکے ساتھ رنگ رلیاں مناتی تھی۔ شکر داس کے منہ سے غلیظ لفظ نکل رہے تھے۔ اسکی چنگھاڑتی پکار سن کر ارد گرد کے گھروں کی دیواروں سے لوگ جھانکنے لگے تھے۔

باپو تجھے شرم آنی چاہیے اپنی بیٹی پر ایسے گھٹیا الزام لگاتے ہوئے۔ فاطمہ چلا اٹھی۔

بکواس بند کر تو نے مجھے کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔ شکر داس نے آگے بڑھ کر ایک زوردار طمانچہ اسکے منہ پر رسید کیا۔
 آرام سے آرام سے۔ انسانوں کی طرح بات کرو بیٹی پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے۔
 ولید تڑپ کر آگے بڑھا تھا۔ شکر داس نے اسے بھی دھکا دیا۔
 ایسی بدکردار بیٹی کو تو زندہ جلا دینا چاہیے۔

ہاں ہاں تم تو جلانے کی بات ہی کرو گے ناں کافر جو ہو۔ فاطمہ یکدم تن کر باپ کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

کیا بکتی ہے مورکھ۔ شکر داس تمللا گیا۔

ٹھیک کہتی ہوں میں۔ تو کافر ہے باپو ان پتھر کی مورتوں کو اپنے ہاتھوں سے

بنا کر انکو پوجتا ہے۔

وہ صرف پتھر کی مورتیں نہیں ہمارے بھگوان ہیں۔ شکر داس دوبدو بولا۔
ارد گرد سے جھانکتے لوگوں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

بھگوان۔۔ فاطمہ تیر کی طرح پوجا والے کمرے کی طرف بڑھی اور وہاں سے
کالی ماں کی مورتی اٹھا کر آنگن میں لائی۔ یہ بھگوان ہے ناں تو اسکو کہہ
تیرے لیے بارش برسا دے۔ بول کہہ اسکو۔ وہ چیلنج کرنے والے انداز میں
بولی۔ شکر داس فوراً کچھ نہ کہہ سکا۔

ہونہم یہ کیا بارش برسائے گی یہ تو اپنی رکھشا نہیں کر سکتی۔ اسنے زور سے
پتھر کی مورتی زمین پر دے ماری۔ وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ زمین بوس
ہوئی اور اسکا سر دھڑ سے الگ ہو گیا۔ ارد گرد سے لوگ ہاں ہاں کر کے دوڑے
اور شکر داس کے گھر بھاگے چلے آئے۔

اری یہ کیا کر دیا تو نے مورکھ۔ مہا پاپ کر دیا۔ کالی ماتا کی مورتی توڑ ڈالی۔
پاپی ہے تو نرگ کی آگ میں جلے گی۔ شکر داس تو باقاعدہ رونے لگا تھا۔

یہ تو مہا پاپ کر دیا شردہا نے

ہائے بھگوان اب تو بستی پر بلائیں آئینگی۔

شردہا نے کالی ماتا کی مورت توڑ ڈالی۔۔

بھانت بھانت کی آوازیں تھیں۔

شر دہا نہیں فاطمہ۔ میں فاطمہ ہوں مجھے کوئی شر دہا نہ کہے میں مسلمان ہوں تم لوگوں کی طرح کافر نہیں۔ وہ چلا چلا کر بولی تھی۔ اس مجمع میں ایک چہرہ ابھرا تھا اور وہ رام ناتھ کا چہرہ تھا۔

ہے بھگوان۔۔ سارے مجمعے نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے جبکہ شنکر داس پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

اری کس نے تجھے بھٹکا دیا۔۔ پوجا آگے بڑھی۔

بھٹکایا نہیں سیدھی راہ پر لایا ہے۔ یہ ادھارک مجھے۔ وہ آج بے خوف تھی۔



ہے بھگوان۔۔ تو۔۔ تو۔۔ مسلا۔۔ شنکر داس ہکلا یا۔

الحمد للہ! مسلمان ہوں۔ ولید نے اطمینان سے جواب دیا۔

پنڈت جی! آپ نے تو کہا تھا کہ یہ لڑکا آپکی دور پار کی بہن کا بیٹا ہوتا ہے۔ رام ناتھ جلدی سے بولا۔ شنکر داس گڑبڑا گیا تھا۔

پنڈت جی نے مصلحتاً جھوٹ کا سہارا لیا تھا ورنہ سچ تو یہ ہے کہ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں میں تو ایک مسافر ہوں جو کچھ دیر کو یہاں رکا ہوں اگلا پڑاؤ جانے کہاں ہو کچھ خبر نہیں۔ ولید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

ہے بھگوان ایک غیر بندے کے ساتھ اپنی جوان لڑکی کو گھر میں تنہا چھوڑ جاتے تھے تم پنڈت۔ توبہ توبہ لڑکی پاپ نہیں کرے گی تو اور کیا کرے گی۔ مجمع سے ملامت کی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں۔

تو نے ایک مسئلے کو اپنے گھر پناہ دے کر اپنا دھرم بھر شٹ کر لیا ہے شکر داس اب تیری سزا موت ہے۔ مندر کے ایک کافی پرانے پجاری نے آگے بڑھ کر فیصلہ صادر کیا۔

میں نے انسانیت کے ناطے اس کو پناہ دی تھی اپنے گھر کیونکہ یہ گھائل تھا۔ شکر داس نے کپکپائی ہوئی آواز میں کہا۔

تو نے ایک مسئلے کو اپنے گھر میں پناہ دی ہی کیوں؟

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں مجھے نہیں پتہ تھا کہ یہ مسلا ہے۔

تو جھوٹا ہے اور تیری لڑکی پاپی ہے۔ ان کے گھر کو آگ لگا دو۔ رام ناتھ نے آگے بڑھ کر حکم دیا۔

تم کون ہوتے ہو کسی کو زندہ جلانے کا حکم لگانے والے۔ اور گنہگار کی خوب کہی تم نے۔ اگر شردھا گنہگار ہے تو کیا تم نیک پاک ہو۔ کیا تم نے اسکی عزت سے کھیلنے کا گھناؤنا جرم نہیں کیا بولو۔ ولید نے رام ناتھ کا گریبان پکڑ کر جھٹکا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر غیض و غضب کی تحریر تھی۔

بکواس ہے۔ یہ شردہا خود آتی تھی میرے پاس۔ رام ناتھ نے سفید جھوٹ بولا۔

جھوٹے موالی تو نے میری اجت (عزت) کیساتھ کھلواڑ کیا میں نے پھر بھی کچھ نہ کہا چپ سادھ لی اب تجھ میں اتنی ہمت ہے کہ تو میرے گھر میں کھڑا ہو کر میرے چلتر پر جھوٹا لالچھن لگا رہا ہے۔ فاطمہ کسی بھوکی شیرنی کی طرح رام ناتھ پر جھپٹی تھی۔

پیچھے ہٹ گندی۔۔ رام ناتھ نے نفرت سے اسے پیچھے ہٹایا۔

گندہ تو ہے۔ میں تو پوتر ہوں اللہ اور محمد کا کلمہ پڑھا ہے میں نے۔ تم سب سن لو۔۔ جب تک ان پتھر کی مورتوں کو پوجتے رہو گے پلید رہو گے نرگ تمہارا مقدر بن جائے گی۔ ہاں اگر اللہ اور محمد کا کلمہ پڑھ لو گے تو پوتر ہو جاؤ گے۔ وہ مجھے کو مخاطب کر کے باواز بلند بولی۔

یہ لڑکی پاگل ہو چکی ہے۔ اسکو پتھر مارو اس نے اپنا دھرم بدل لیا ہے۔ مجھے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور لوگ جھک جھک کر مٹھیوں میں خاک اور پتھر بھر بھر کر شردہا کی طرف پھینکنے لگے ولید اسکے بچاؤ کے لیے فوراً آگے بڑھا۔ خاک اسکے چہرے بالوں اور وجود کو گندہ کر رہی تھی مگر وہ شردہا کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔

باپو! تو کیوں چپ ہے۔ رام ناتھ کا منہ کیوں نہیں نوچتا۔ شردہا نے دہائی دی۔

تو جھوٹی ہے مورکھ۔ تو نے اس مسئلے کیساتھ مل کر میرے سفید بالوں میں خاک ڈال دی ہے۔ اچھا ہے تجھے گاؤں والے مار ڈالیں۔ شکر داس رو رہا تھا۔

باپو میں نے کوئی پاپ نہیں کیا میں مسلمان ہوئی ہوں سیدھی راہ پر آئی ہوں تو کیوں ڈرتا ہے ان سب سے۔ چھوڑ دے ان پتھر کی مورتوں کو اللہ کے راستے پر آجا۔ اسنے باپ کا ہاتھ پکڑ کر جیسے منت کی تھی۔

دور ہٹ جا مجھ سے مورکھ۔ تو پلید ہوگئی ہے۔ نرگ کی آگ میں جلے گی تو۔ شکر داس نے اسے دور ہٹا دیا۔

بس بہت ہو گیا۔ ولید یکدم چنگھاڑا تھا۔ سارے مجمعے پر ایک دم سکوت طاری ہو گیا۔

نکل جاؤ سب ادھر سے ورنہ تم جیسے دس ہزار کو بھی ٹیکل کرنا آتا ہے مجھے۔ نکلو سب۔ اسکے لہجے میں ایسا رعب اور چہرے پر ایسا جلال تھا کہ سبھی مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

نکلو ادھر سے سنا نہیں تم لوگوں نے۔ وہ پھر گر جا۔ مجمعے میں سرگوشیاں ہوئیں اور پھر سب ایک اک کر کے جانے لگے۔ سب سے آخر میں رام ناتھ رہ گیا تھا۔

گیٹ لاسٹ۔۔ ولید نے اسے بھی ڈپٹا۔

مجھے بھی کوئی شوق نہیں یہاں رکنے کا۔ گندے مسلے۔ تھوکتا ہوں میں تجھ پر۔۔۔ تھو۔ اسنے نفرت سے زمین پر تھوکا اور گھر سے چلا گیا۔ اسکے جانے کے بعد ولید نے دروازہ بند کیا اور شکر داس کی طرف پلٹا۔

اس واویلے سے تمہیں کیا حاصل ہوا۔ برسوں کی بنی بنائی عزت خاک میں مل گئی۔ تم مجھ سے اور شر دہا سے آرام سے بھی بات کر سکتے تھے۔

میری اجت (عزت) تو اسی روز خاک میں مل گئی تھی جس دن تمہیں اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ شکر داس باقاعدہ رو رہا تھا۔

تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ولید نے سر جھٹکا۔

دفع ہو جاؤ میرے گھر سے اور اس گندگی کی پوٹ کو بھی ساتھ لے جاؤ میرا اب اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

واٹ۔۔۔ تمہاری بیٹی پاکیزہ ہے۔ تم اس پر الزام کیسے لگا سکتے ہو۔ وہ غصے سے بولا۔ فاطمہ ایک جانب کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

یہ گندی ہے پاپی ہے۔

بس شکر داس بہت ہو گیا۔ اس بیچاری معصوم لڑکی پر اس سے زیادہ ظلم میں برداشت نہیں کرونگا۔ پہلے اس نام نہاد شریف رام ناتھ نے اسکی روح پر زخم لگائے اور اب تم نے ساری بستی کو اکٹھا کر کے اسکی عزت کا تماشا بنایا۔ اس

سے زیادہ کچھ برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ تم پہ بوجھ ہے تمہیں اس سے اتنی ہی نفرت ہے تو میں اسکو اپنے ساتھ لیجاؤں گا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے اسکی زندگی کی حفاظت میرے ذمے ہے اور مجھے اپنے فرائض نبھانا آتے ہیں۔ وہ مضبوط لہجے میں بولا تھا۔ شکر داس بالکل ہی ٹھس ہو گیا۔ فاطمہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ ولید ایک جانب سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک عجیب دن تھا۔ سارا دن ان سب نے کچھ نہ کھایا تھا۔ وہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے رہے تھے۔ شام سے رات ہوئی مگر انکی پوزیشن میں تبدیلی نہ آئی تھی۔ جب رات کچھ ڈھلی تو ولید اٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔ وہ جتنا جلدی واپس جانا چاہتا تھا اتنے ہی اسکے لیے مسائل بڑھ رہے تھے۔ اب وہ اس صورتحال میں فاطمہ کو تنہا چھوڑ کر جانے کا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ چلا گیا تو یہ لوگ فاطمہ کو جان سے مار دیں گے اور یہ اسکے ضمیر کو گوارا نہ تھا کہ ایک نو مسلم لڑکی یوں ماری جاتی۔ وہ بستر کنارے ٹک کر اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کو ترتیب دینے لگا۔ سوچتے سوچتے اسکا ذہن کب نیند کی وادی میں اترا اسے بالکل خبر نہ ہوئی تھی۔ وہ تب چونکا جب شور کی آوازیں اسکے کانوں میں پڑیں۔ ہر طرف دھوئیں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر کمرے سے باہر نکلا اور پھر باہر کا منظر دیکھ کر ایک ثانیے کو تو وہ دنگ رہ گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ رات کے اندھیرے میں شکر داس کے گھر کو نذر آتش کر رہے تھے۔ گھر کو چاروں جانب سے آگ کے شعلوں نے اپنے لپیٹ

میں لے رکھا تھا۔

شردہا۔۔۔ ولید چلایا۔۔۔ وہ جانے کہاں تھی۔ وہ بھاگ کر دوسرے کمرے میں آیا وہاں ایک اور دلدوز منظر اسکا منتظر تھا۔ شکر داس گلے میں رسی ڈالے چھت سے لٹکا ہوا تھا اور فاطمہ زمین پر بیٹھی سسک رہی تھی۔ ولید سرعت سے آگے بڑھا اور شکر داس کے وجود کو چھوا۔ اسمیں جنبش نہ تھی اسکی گردن ایک جانب کو ڈھلک چکی تھی۔ وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ولید نے اسکے جسم کو احتیاط سے اتار کر بستر پر ڈالا۔

شردہا اٹھو ہمیں نکلنا ہے وہ لوگ گھر کو آگ لگا رہے ہیں اٹھو کم آن ہری اپ۔ اسنے فاطمہ کا شانہ ہلایا۔ باہر انسانوں کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ سب اپنے خداؤں کی شان میں بھیجنے لگے تھے۔

مجھے کہیں نہیں جانا میرا باپو میری وجہ سے سے مر گیا ادھارک مجھے یہیں مر جانے دو۔ وہ بلک رہی تھی۔

بے وقوفی کی باتیں مت کرو پاگل لڑکی۔ مرنے والوں کیساتھ کوئی مر نہیں سکتا اٹھو ہمیں جینا ہے۔ اٹھو۔ اسنے اسے بازو سے تھام کر زبردستی اٹھایا تھا۔ وہ غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔

باپو۔۔۔ وہ چیخی۔

وہ مرچکا ہے شردہا پلینز پاگل مت بنو۔

میں اپنے باپو کو چھوڑ کر نہیں جاؤنگی۔ وہ دوڑ کر مردہ شکر داس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

شر دہا یہ جذبات سے نہیں عقل سے کام لینے کا وقت ہے۔ آگ پھیلتی جا رہی ہے پلیز اٹھو۔ ولید نے اسکا بازو تھام کر اسے اٹھایا۔ وہ مچل رہی تھی۔ چلا رہی تھی رو رہی تھی۔ ولید اسے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لایا۔ اماوس کی گھنٹی رات میں آگ کے بلند ہوتے شعلوں کی روشنی بہت کافی تھی۔ اسنے فاطمہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

چپ۔۔ وہ سختی سے بولا۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ ولید اسے لیے چھت پر جاتی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ آگ اب آنگن میں پھیل رہی تھی۔ کچن دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ کمرے بھی آگ کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ جلد ہی یہ سیڑھیاں بھی آگ سے محفوظ نہ رہیں۔ وہ اسے ساتھ لیے چھپتا ہوا تیز تیز سیڑھیاں طے کر کے کھلی چھت پر نکل آیا۔ گھر کے باہر انسانوں کا اک ہجوم تھا۔ وہ فاطمہ سمیت چھت پر اکڑوں بیٹھ گیا مبادا باہر اکٹھا لوگوں کی ان دونوں پر نظر نہ پڑ جائے۔ فاطمہ کو وہیں چھوڑ کر وہ رینگتے ہوئے عقبی منڈیر تک پہنچا اور نیچے جھانکا۔ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے مگر یہاں سے بھاگنا پھر بھی ممکن تھا۔ وہ واپس پلٹ کر فاطمہ کے پاس آیا۔

شر دہا سنو! ہمیں اس دیوار کے ذریعے سے نیچے اترنا ہے۔ تمہیں ہمت کرنی

ہے اوکے۔ اسنے اسکا چہرہ تھپتھپا کر اسے جیسے ہوش کی دنیا میں واپس لانے کی کوشش کی تھی۔

تم جاؤ ادھارک اپنے دیش لوٹ جاؤ۔ مجھے یہیں جلنے دو۔ وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

بیکار کی باتیں مت کرو۔

تم چلے جاؤ ادھارک مجھے نہیں جانا تمہارے ساتھ۔ میں تمہاری راہ کی رکاوٹ نہیں بننا چاہتی۔ اللہ کے لیے چلے جاؤ۔ اس نے منت کرنے والے انداز میں کہا۔

میں تمہارے بغیر کہیں نہیں جاؤنگا سمجھی تم اب بیکار ناک مت کرو چلو میرے ساتھ۔ اب کی بار وہ کچھ سختی سے بولا اور اسکی کلائی تھام کر جھٹکا دیا۔

چھوڑو مجھے۔ وہ اپنا بازو اسکی گرفت سے چھڑوا کر دبی دبی آواز میں چلائی۔ اسی لمحے نچلے منزل سے لکڑی کے شہتیر چل چل کر گرنے کی آوازیں آنی لگیں۔ فاطمہ بے قراری سے بھاگ کر منڈیر تک گئی۔ سارا گھر آگ کے شعلوں کی زد میں تھا اور اب یہ آگ زینوں پر بھی پھیل رہی تھی۔

باپو۔۔ وہ منڈیر پر سر رکھ کر سکنے لگی تبھی آگ کا اک شعلہ ابھرا ولید نے آگے بڑھ کر فاطمہ کو منڈیر سے دور ہٹایا۔

تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ جل کر مرنے کا ارادہ ہے کیا تمہارا۔ وہ غصے سے بولا۔

میں جی کر کیا کرونگی اب ادھارک۔ مجھے مر جانے دو۔ وہ رو رہی تھی۔
 بکو مت۔ اٹھو اب آگ پھیل رہی ہے کچھ دیر بعد فرار کی سبھی راہیں مسدود
 ہو جائیں گی۔ پلیز اٹھو شردہا پلیز۔

تم چلے جاؤ ناں کیوں میرے لیے اپنی راہ کھوٹی کرتے ہو۔
 میں تمہیں لیے بغیر نہیں جاؤنگا شردہا۔

لیکن کیوں۔ کیوں تم میرے پیچھے پڑے ہو مر کیوں نہیں جانے دیتے مجھے آخر
 تمہارا کیا نقصان ہے میرے مر جانے سے۔ وہ جھلا اٹھی۔

تم نے کیوں نہیں مر جانے دیا تھا مجھے اس زور چشمے کے کنارے۔ تمہارا کیا
 نقصان ہو رہا تھا میری موت سے۔ اسنے الٹا اس سے سوال کیا۔ وہ ایک لمحے کو
 چپ کر گئی۔

اب اٹھ چلو بیکار کے ڈرامے بعد میں کبھی کر لینا۔ اسنے اسے بازو سے تھام کر
 اٹھایا۔ اب کی بار اسنے کوئی پس و پیش نہ کی تھی۔ وہ میکاکی انداز میں اس
 کیساتھ گھسٹی منڈیر تک آئی۔ چھت سے زمین تک کوئی دس سے بارہ فٹ کا
 فاصلہ رہا ہوگا۔ اتنی لمبی چھلانگ ولید کے لیے تو بڑی بات نہ تھی مگر فاطمہ

کیساتھ اس فاصلے کو پار کرنا ایک چیلنج ثابت ہونے والا تھا۔ اس نے ایک بار پھر نیچے جھانکا۔ آگ کے شعلے ابھی پوری طرح پچھلی دیوار تک نہ پھیلے تھے۔ شردہا! کیا تم اس دیوار پر قدم جما سکتی ہو۔ اسنے فاطمہ سے پوچھا۔

پتہ نہیں۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ولید نے ایک طویل سانس لی اور اسے اپنے پشت پر اٹھا کر دیوار پر دونوں پاؤں دوسری جانب لٹکا کر بیٹھ گیا۔

مجھے مضبوطی سے تھامے رکھنا شردہا۔ اسنے فاطمہ کو ہدایت جاری کی۔ شردہا کی گرفت اسکی کمر پر مضبوط ہو گئی۔ ولید دیوار کے سوراخوں میں پاؤں پھنسا کر اب بالکل دیوار کیساتھ لگا کھڑا تھا۔ اسے یہاں سے چھلانگ لگانا تھی۔ آگ کے شعلے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ حدت اتنی زیادہ تھی کہ اس سرد موسم میں بھی انکے وجود پسینے سے بھیگ گئے۔

شردہا میں جمپ کرنے لگا ہوں مجھے مضبوطی سے تھامے رکھو اپنے حواس جمع رکھنا۔ تمہاری گرفت ڈھیلی نہیں ہونی چاہیے آنکھیں بند کر لو نیچے مت دیکھنا۔ اسنے فاطمہ کو جلدی جلدی ہدایتیں جاری کیں۔ فاطمہ نے عمل کیا۔ ولید نے ایک بار پھر نیچے نظریں دوڑا کر فاصلے کا اندازہ لگایا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی اسے آگ کے شعلوں پر گرا سکتی تھی مگر یہ رسک تو لینا ہی تھا۔ سو اسنے دل ہی دل میں اللہ کا نام لیکر چھلانگ لگادی۔ ٹرینڈ ہونے کی باعث اسنے چھلانگ لگاتے وقت اپنے جسم کو بالکل صحیح زاویے میں رکھا تھا اور زمین پر قدم جماتے

ہیں وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ آگ کے شعلے ان سے قریب تر تھے۔ وہ تیزی سے دوزڑنے لگا۔ دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے وہ کچھ دور بھاگنے کے بعد رکا اور فاطمہ کو پشت سے اتار۔ وہ نیم بیہوشی کے عالم میں تھی۔

شردہا۔ آنکھیں کھولو۔ اسنے اسکا شانہ زور زور سے ہلایا تھا۔

ادھارک۔۔ باپو۔۔ وہ بمشکل بولی۔

شردہا ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے ہمیں یہاں سے دور بھاگنا ہے۔ پلیز اٹھو۔ خود کو مضبوط بناؤ شردہا پلیز۔ وہ اسکو ہمت دلانے کے کوشش کر رہا تھا۔ وہ بمشکل اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسلام کی راہ میں بہت مشکلات آتی ہیں شردہا۔ تم یاد کرو جب نبی پاک طائف گئے تھے تو وہاں کو لوگوں نے انکو پتھر مارے تھے وہ لہولہان ہو گئے تھے سوچو شردہا۔ وہ دو جہان کے بادشاہ ہو کر اتنی بڑی بڑی تکلیفیں سہ گئے اللہ کی محبت میں تو کیا ہم اتنی ذرا سی تکلیف نہیں سہ سکتے۔ رات کے اندھیرے میں ولید نے اس نو مسلم لڑکی کے ہاتھوں میں امید کی مشعل تھمائی تھی۔ فاطمہ میں تھوڑی ہمت پیدا ہوئی۔ محمد مصطفیٰ کی محبت ہی تو اسے دائرہ اسلام تک لائی تھی۔ اسے پیچھے نہیں ہٹنا تھا نہ ہی ہمت ہارنی تھی۔

ہم یہاں سے رنبیر سنگھ پورہ جائینگے پھر وہاں جاکر کوئی پلان ترتیب دیں گے۔ ولید نے اسے سمجھایا۔ اس نے کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلادیا۔

پھر وہ دونوں چلنے لگے۔ فاطمہ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتی جہاں شکر داس کا گھر دھڑا دھڑا جل رہا تھا۔ وہ تب تک اپنے آشیانے کو تکتی رہی جب تک وہ نگاہوں سے او جھل نہ ہو گیا تھا۔ اسکی آنکھیں دھندلانے لگیں اور قدموں میں تیزی آگئی۔ وہ ولید کی رفتار کے برابر چل رہی تھی۔ صبح کی روشنی پھیلنے تک وہ رنیر سنگھ پورہ پہنچ گئے تھے۔ یہ 194 دیہاتوں پر مشتمل ایک تحصیل ہے اور یہاں سے مقبوضہ وادی کے دار الحکومت سری نگر کا فاصلہ قریب 320 کلو میٹر ہے۔ یہاں کی بس سروس کافی آرام دہ ہے۔ توئی جموں ریلوے اسٹیشن یہاں سے بائیس جبکہ ایئر پورٹ پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہیں۔ وہ دونوں یہاں پہنچ کر ایک درخت کی چھاؤں میں سستانے کی غرض سے جا بیٹھے۔

اب کیا کیا جائے۔ اسنے فاطمہ سے پوچھا۔ وہ بالکل نڈھال سی درخت کے تنے سے ٹکی ہوئی تھی۔

تم اپنے دیش چلے جاؤ ادھارک۔ وہ نقیبہ لہجے میں بولی۔ ولید نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ سیاہ چادر میں اسکا سفید چہرہ خطرناک حد تک زرد نظر آرہا تھا۔ اسکے چہرے پر کچھ خراشیں بھی تھیں جو گزشتہ رات آگ کی وجہ سے آئی تھیں۔ سبز آنکھیں بالکل ویران تھیں۔ ولید نے ہاتھ بڑھا کر اسکی پیشانی کو چھوا۔ وہ تپ رہی تھی۔

تمہیں تو بخار ہے۔ وہ بڑبڑایا۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ اب تم نقل و حرکت کے قابل نہیں رہی۔

تم جاؤ ادھارک ادھر سے بارڈر پار کر جاؤ۔ اسنے بند ہوتی آنکھوں کیساتھ جواب دیا۔

اور تم۔۔ تم میرے ساتھ پاکستان نہیں چلو گی۔

نہیں میں نے دھرم بدلا ہے قومیت نہیں۔ میں کشمیری ہوں میرا جینا مرنا کشمیر سے ہے۔ اسنے نقیہ آواز مگر مضبوط لہجے میں جواب دیا تھا۔ ولید نے ایک طویل سانس لی۔

ٹھیک ہے پھر میں تمہیں کشمیر میں ہی کسی مسلم اکثریت والے علاقے میں کسی محفوظ مقام پر چھوڑنے کے بعد ہی واپس پاکستان جاؤنگا۔ اسنے بھی قطعیت سے کہا۔

تمہاری پتی اور بچہ تمہاری راہ تکتے ہونگے ادھارک انکو مزید انتظار نہ کرواؤ۔ اسنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

انکے لیے تو میں سات سال قبل مر گیا تھا شردہا میرا جانا انکے لیے سرپرائز ہوگا۔ ہاں میں ان سے ملنے کے لیے بے طرح بے تاب ہوں مگر میں اپنی خوشیوں کی خاطر تمہیں بے آسرا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔

میں بے آسرا نہیں ہوں ادھارک میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔

بس چپ۔ میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ اسنے اسے ڈپٹا۔ وہ چپ ہوگئی۔

پھر اب ہم کہاں جائینگے۔ چند ثانیے بعد شردہا نے پوچھا۔

تمہی بتاؤ۔

سرینگر چلتے ہیں وہاں مسلمان رہتے ہیں سارے۔

ہم ٹھیک ہے۔

بس یا ٹرین سے جاسکتے ہیں۔ فاطمہ نے بتایا ولید نے سر ہلادیا۔ وہ کچھ سوچ رہا

تھا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

لیکن سفر پر تو اخراجات آئینگے۔ اب کیا کریں ہمارے پاس تو پیسے بھی نہیں

ہیں ادھارک۔ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا یار۔ تم پریشان نہ ہو۔ ولید نے اسے اطمینان

دلواایا۔ کچھ دیر سستانے کے بعد وہ پھر چل پڑے۔ ایک جگہ رک کر انہوں

نے ہینڈ پمپ سے پانی پیا اور کھیتوں میں ہو لیے۔ موسم خاصا سرد تھا۔ وہ

دونوں بے سمت چلتے جا رہے تھے۔

سنو کیوں نہ کسی کے گھر پناہ لے لی جائے۔ فاطمہ نے کہا۔ اسکے چہرے پر

نقاہت کے آثار تھے۔ بخار نے اسکے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا

تھا۔ ولید نے اسکی طرف غور سے دیکھا پھر سر ہلادیا۔

اچھا چلو۔ اس طرف سامنے بستی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔ ولید نے ہاتھ اٹھا کر کھیتوں کے پار نظر آتی کچے گھروں کی قطاروں کی جانب اشارہ کیا اور وہ پھر چلنے لگے۔ بستی میں پہنچ کر انہوں نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ فاطمہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ ایک بوڑھی سی عورت نے دروازہ کھولا تھا جس نے ساڑھی کی بجائے شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور بڑی سی سفید چادر میں اسکا نورانی چہرا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔

السلام علیکم جی بیٹا۔ وہ جب بولی تو اسکے لہجے میں شائستگی تھی۔ ولید اور فاطمہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

جی وعلیکم السلام۔ ماں جی ہم مسافر ہیں بہت دور سے آئے ہیں کچھ کھانے کو مل سکتا ہے۔ ولید نے شائستہ لہجے میں کہا۔

جی جی بیٹا آجاؤ۔ آؤ بیٹی۔ بوڑھی نے ایک جانب ہٹ کر انہیں اندر آنے کی اجازت دی وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک صاف ستھرا چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ کچے آنگن میں ایک جانب نیم کے درخت تلے چارپائی بچھی تھی جس پر ایک تکیہ رکھا تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا باورچی خانہ تھا جس میں ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی۔ آنگن میں ایک جانب مرغیوں کا ڈربہ رکھا تھا اور مرغیاں کچے آنگن میں گھوم پھر رہی تھیں۔ عقب پر بنے دو کمروں کے سامنے خوش رنگ

پردے جھول رہے تھے۔

بیٹھو بیٹا۔ بوڑھی نے چارپائی کی جانب اشارہ کیا وہ دونوں بیٹھ گئے۔ بوڑھی نے گھرے سے پانی مٹی کے کٹوروں میں نکال کر انہیں تھمایا۔ وہ ٹھنڈا میٹھا پانی اس سے ان دونوں کو بڑا ہی بھلا لگا تھا۔

بہت شکریہ ماں جی۔ ولید نے کٹورا اسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

تمہاری بیوی کچھ بیمار لگ رہی ہے۔ بوڑھی نے فاطمہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ یہ میری بیوی نہیں ہے ماں جی مگر بیمار واقعی ہے۔ ولید نے فوراً سے کہا۔ بیوی نہیں ہے تو پھر کون ہے۔ بوڑھی نے مشکوک نظروں سے دونوں کو گھورا۔ فاطمہ ولید کے کچھ کہنے سے قبل ہی بول اٹھی۔

یہ میرا محسن ہے ماں جی ہمارے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہے اور وہ ہے اسلام۔ اسکی بات سن کر بوڑھی ایک لمحے کو انہیں گھورتی رہی۔

مسلمان ہو۔۔ اسنے پوچھا۔

الحمد للہ۔ وہ دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

میں بھی مسلمان ہوں بیٹا۔ وہ کچھ نرم پڑھ گئیں۔

آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں کیا۔ فاطمہ نے پوچھا۔

ایک بیٹا ہے وہ ولایت چلا گیا ہے شوہر کی وفات ہو چکی ہے۔ بس اب اکیلی ہی رہتی ہوں۔ پہلے یہاں کے سرکاری گرلز سکول میں پڑھاتی تھی اب ریٹائر ہو گئی ہوں پنشن آتی ہے تو اچھا گزر بسر چلتا ہے۔ گاؤں کے لوگ بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ متین لہجے میں بولتی گئیں۔

تم دونوں کہاں سے آئے ہو۔

سچیت گڑھ سے۔ فاطمہ بولی پھر اس نے نان اسٹاپ اپنی ساری کتھا بوڑھی کے گوش گزار کر دی۔ ولید کی گھوریاں اسنے قطعی نظر انداز کر دی تھیں۔

میری بچی کتنے ستم جھیلے تو نے۔ بوڑھی تو باقاعدہ فاطمہ کو سینے سے بھینچ کر رو دی تھی۔ فاطمہ بھی رونے لگی۔ ولید کو اب شردہا پر غصہ آرہا تھا۔ ہر کسی پر کیسے آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لیتی تھی۔

تجھے تو کتنا تیز بخار ہے۔ بوڑھی نے فاطمہ کی پیشانی چھو کر کہا پھر اسے وہیں چارپائی پر بٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

کیا ضرورت تھی سب کچھ بتانے کی۔ ولید نے دبی زبان میں اس کو مخاطب کیا۔

اتنی بھلی عورت ہیں۔ نیک اور ہمدرد۔ وہ اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

اتنی جلدی کسی پر اعتبار نہیں کرتے بے وقوف لڑکی۔

تم پر بھی تو کر لیا تھا میں نے اعتبار پھر کیا ہوا تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا ناں۔
انشاء اللہ آگے بھی مجھے دھوکے نہیں ملیں گے کیونکہ مسلمان دھوکے باز نہیں
ہوتے۔ وہ پر یقین انداز میں بولی تبھی بوڑھی ایک سٹیل کا گلاس تھامے چلی
آئی۔

لو بیٹا کاڑھا پی لو۔ مجھے بھی کل سے زکام کی شکایت محسوس ہو رہی تھی تو یہی
استعمال کر رہی ہوں۔ کافی افاقہ ہوگا اس سے۔ اسنے گلاس اسکی جانب بڑھاتے
ہوئے اسکے فوائد بھی بتادیے۔ فاطمہ نے گلاس تھاما اور بدذائقہ مشروب کے
گھونٹ بھرنے لگی۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews



اما!

جی بیٹے۔

پھپھو کب آئینگی؟

تین دن بعد آجائینگی۔

جب وہ آئینگی پھر آپ مجھے اپنی اور بابا کی شادی کی تصویریں دکھائینگی ناں؟

اگر پھپھو البمز ساتھ لے کر آئیں تو ضرور دکھاؤں گی۔

ماما آپ کے پاس بابا اور اپنی کوئی ایک بھی تصویر نہیں۔ آپ دونوں نے کبھی موبائل میں سیلفی نہیں لی تھی

بیٹا پرانے موبائل میں تھیں تصویریں وہ خراب ہو گیا تو تصویریں بھی ضائع ہو گئیں۔ تمہارے بابا کے موبائل میں تھیں بہت سی تصویریں مگر وہ تو اپنا موبائل ساتھ لے کر گئے تھے۔

بڑے پاپا کے سیل فون میں بھی کوئی پکچر نہیں آپ دونوں کی پتہ نہیں بیٹا۔ اتنے سالوں بعد کہاں رہی ہو گی انکے پاس تصویریں۔

ماما آپکو پتہ ہے میرے فرینڈ سنی کی سسٹر کی شادی ہوئی ہے وہ کل تصویریں لیکر آیا تھا۔ شی واز کلنگ سو پریٹی۔ ماما آپ دلہن بن کر کیسی لگ رہی تھیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کیسی لگ رہی ہو گی میں۔

بہت اچھی ماما آپ تو ہیں ہی بہت پریٹی بالکل سنو وائٹ جیسی۔

اچھا جی۔ اور آپ ماما کی جان ہو تبھی اتنے پیارے سے ہو۔

ماما میری شکل آپ سے کیوں نہیں ملتی۔

کیونکہ آپ اپنے بابا جیسے ہو۔

آئی وش ماما میری آنکھیں آپ جیسی ہوتیں

میرے بیٹے کی آنکھیں بہت پیاری ہیں ماما کی تو جان ہے ان آنکھوں میں۔
آئی لو یو ماما۔

آئی لو یو ٹو مائے لو۔



میری ایک بہن ہے جو سری نگر میں رہتی ہے۔ اگر تم لوگ اسکے پاس چلے جاؤ تو کم از کم ان وسوسوں سے آزاد ہو جاؤ گے کہ کہیں اس بچی کے گاؤں والے اسکو تلاش نہ کر لیں۔ بوڑھی نے کافی سوچ بچار کے بعد یہ حل نکالا تھا۔

مگر ہم انکو جا کر کہیں گے کیا۔ اور وہ ہمیں پناہ کیوں دینگیں فاطمہ جلدی سے بولی۔

میں اسکے نام ایک خط لکھ دیتی ہوں ناں وہ تم اسکو دے دینا اور بیٹا وہ بڑی بھلی عورت ہے۔ اکیلی رہتی ہے تمہیں کھلے دل سے پناہ دے گی۔

وہ کیوں اکیلی رہتی ہیں انکا خاندان میاں بچے کدھر ہوتے ہیں۔ ولید نے پوچھا ارے وہ جنم جلی بیچاری۔۔ بوڑھی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ میری بہن بیچاری کی داستان بہت دکھ بھری ہے۔ اسکی اور میری شادی ایک ہی دن ہوئی تھی میں تو بیاہ کر ادھر آگئی جبکہ وہ وہیں سری نگر میں رہی۔ اسکے شوہر اللہ بخشے

بہت ہی نیک انسان تھے۔ میری بہن اچھی زندگی گزار رہی تھی۔ اللہ نے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نواز دیا۔ بس اسکے ہنستے بستے گھر کو نظر لگ گئی۔ ایک دن حالات بہت خراب تھے کرفیو لگا ہوا تھا۔ جو بھی مسلمان گھر سے باہر نکلتا بھارتی اسے مار ڈالتے۔ ایسے میں بس ایک لمحے کو میرے بہنوئی نے مسجد جانے کی غرض سے گھر سے قدم باہر نکالا اور ظالموں نے فائر کھول دیے۔ انکی شہادت کو ابھی دس دن بھی نہ گزرے تھے کہ بڑا بیٹا دکان سے واپسی پر بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ابھی یہی زخم نہ بھرے تھے کہ ایک روز اسکول سے واپسی پر بڑی بیٹی اور اسکی کچھ سہیلیاں اغواء ہو گئیں اور کچھ دن بعد انکی لاشیں کچرے کے ڈھیر سے ملیں۔ منجھلی بیٹی اور سب سے چھوٹا بیٹا زندہ بچے تھے میری بہن انہی کے سہارے زندگی گزار رہی تھی کہ ایک روز سری نگر میں مکمل ہڑتال تھی بھارتی فوجیوں کی دہشتگردی جاری تھی کہ کچھ فوجیوں نے مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر انکی عزتوں کے جنازے نکال دیئے۔ میرا بھانجا اس وقت کالج گیا ہوا تھا جب پیچھے سے گھر پر قیامت گزر گئی۔ منجھلی لڑکی کو ماں کے سامنے بے عزت کیا گیا اور وہ بیچاری شرم سے ہی مر گئی۔ جب میرا بھانجا گھر لوٹا تو بہن کی برہنہ لاش کو صحن میں پڑے پایا اور اسکے سرہانے بیٹھی ماں جو رو رو کر نڈھال ہو چکی تھی۔ اس دن میرے بھانجے نے بہن کا خون آلود دوپٹہ سر پر باندھ کر عہد کیا کہ وہ کشمیری مجاہد بن کر زندگی کو آزادی کی تحریک کے نام کردے گا۔ اس نے میری بہن کو ہمارے

آبائی گاؤں میں ہمارے آبائی گھر میں منتقل کر دیا اور خود اسکا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ زیادہ تر وہ مجاہدین کیساتھ ہی رہتا ہے۔ کبھی گھر آتا ہے تو مجھے خط لکھتا ہے۔ بہت ہی نیک ہے میرا بھانجا ماشاء اللہ۔ بوڑھی بولتے بولتے بہک گئی تھی۔ دیکھیں ماں جی مجھے تو جانا ہے واپس پاکستان یہ میرے ساتھ جانے پر رضامند نہیں ہے اسلیے میں اسکو محفوظ ہاتھوں میں سوئپ کر جانا چاہتا ہوں۔ ولید مطلب کی بات پر آیا۔

مقبوضہ وادی مسلمانوں کے لیے محفوظ تو نہیں ہے بیٹا۔ ہاں مگر میری بہن اور بھانجا قابل اعتبار ہیں اسکی میں گارنٹی دیتی ہوں۔ وہ پر ملال سی مسکراہٹ کیساتھ بولیں۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

ٹھیک ہے آپ خط لکھ دیجیے۔ ہم آج ہی نکل جائینگے۔

ٹھیک ہے بیٹا۔ بوڑھی نے کہا اور اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ فاطمہ سر اٹھائے آسمان کی وسعتوں میں جانے کیا تک رہی تھی۔ ولید اٹھ کر چھت پر جاتی کچی سیڑھیوں پر آبیٹھا۔ اسکے دل میں جانے کہاں سے چھم سے ایہا کا پیکر اترتا تھا۔ یادوں کا اک در کھلا تھا۔ اسنے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ وہ ایک روشن دن اسکی یادداشت پر ابھرا تھا جب نکاح سے اگلے روز وہ اچانک ایہا کے گھر گیا تھا اور وہ نیہا کے ساتھ مل کر کپڑے دھو رہی تھی۔ اسکے بال بکھرے ہوئے تھے۔ قمیض کے بھیگے دامن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور مہندی

رچے ہاتھ کلائیوں تک پانی سے تر تھے۔ وہ ہنس رہی تھی اور اسکے دائیں گال میں پڑتا وہ گہرا بھنور۔ ولید نے بارہا اس بھنور کر چھو کر محسوس کیا تھا۔ وہ اس بھنور میں ڈوب جاتا تھا۔ وہ نرم سا لمس آج بھی اسے اپنی سانسوں سے بھی قریب تر محسوس ہوتا تھا۔ وہ اسے کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے کبھی بھی کہیں بھی اچانک یاد آجاتی تھی۔ وہ اسے بھولی ہی کب تھی۔ ایہا کاظم تو اسکی روح میں بستی تھی۔ وہ اسے خود سے الگ کرتا تو جیتا کیسے۔

ادھارک۔۔ کسی نے زور سے اسکا شانہ ہلایا تو وہ بے طرح چونکا۔ اسنے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ فاطمہ کھڑی تھی۔

تم رو رہے ہو ادھارک۔ فاطمہ کی آنکھوں میں حیرت کے آثار ابھرے۔ ولید نے بے اختیار اپنے گالوں کو چھوا۔ جانے کب اسکی آنکھیں چھلک پڑیں تھیں۔ شاید۔ اسنے اپنے گال رگڑے۔

ایہا کو یاد کر رہے تھے ناں۔ فاطمہ نے پوچھا۔ ولید کچھ نہ بولا بس دھیمے سے اثبات میں سر ہلادیا اسکی سیاہ آنکھوں میں بڑی افیت تھی۔

محبت رلاتی کیوں ہے ادھارک۔۔ فاطمہ نے اچانک سوال کیا تھا۔

اللہ جانے۔۔ لیکن یہ سچ ہے کہ محبت کا گہرا رشتہ ہے آنسوؤں سے۔۔ چاہے وہ محبت اللہ کی ہو رسول پاک کی ہو یا کسی اور انسان کی۔۔ اسنے گہری سانس بھر کر کہا۔

تم میری وجہ سے بہت مشکلات میں گھر گئے ہو ناں ادھارک۔

ایسی بات نہیں ہے۔ تم ایسا مت سوچو۔ تمہاری محافظت کی ذمہ داری میرے لیے باعث فخر ہے کیونکہ تم وہ بہادر لڑکی ہو جس نے سارے سنسار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ اعلان کیا کہ ہاں میں مسلمان ہوں۔۔ موت کا ڈر نہیں تھا تمہیں۔۔ تم بہت عظیم ہو شردہا۔
فاطمہ۔ فاطمہ نے اسکی تصحیح کی۔ ولید مسکرایا۔

جانتی ہو میں اپنی بیٹی کا نام فاطمہ رکھنا چاہتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اگر ابیہا کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی ہو تو اسنے اسکا نام فاطمہ ہی رکھا ہوگا۔ اسنے اسے بتایا۔ فاطمہ افسردگی سے مسکرائی۔

مگر میں تمہاری بیٹی نہیں ہوں۔ وہ کہہ کر پلٹ گئی۔ ولید کچھ نہ بولا تھا
ولید کچھ نہ بولا۔ تبھی اماں جی کمرے سے باہر آئیں۔ انکے ہاتھ میں ایک سفید لفافہ اور ایک سیاہ رنگ کا برقعہ تھا۔ ولید اٹھ کر انکے پاس چلا آیا۔
لو بیٹا اسمیں میری بہن کے گھر کا مکمل پتا اور اسکے نام ایک خط بھی ہے اسکے علاوہ تم لوگوں کے جانے کا کرایہ بھی ہے۔ انہوں نے لفافہ ولید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

بہت شکریہ ماں جی آپ کا یہ احسان ہم کبھی نہ چکا پائیں گے۔ ولید نے سر کو

ختم کر کے تشکر آمیز لہجے میں کہا تھا۔ اماں جی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی اور فاطمہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

بیٹا تمہاری چادر کافی شکستہ حالت میں ہے بہتر ہے کہ تم یہ برقعہ اوڑھ لو۔ انہوں نے برقعہ اسکی طرف بڑھاتے ہوئے ہدایت جاری کی تو اس نے سر اثبات میں ہلادیا۔ اور برقعہ تھام کر کمرے میں چلی گئی۔ چند ثانیے بعد اسکی واپسی ہوئی تھی۔ سر تاپا پرانے طرز کے سیاہ برقعے میں ملبوس اسنے پردہ چہرے پر نہ گرایا ہوا تھا۔ اسکا معصوم سا چہرہ بہت پاکیزہ دکھ رہا تھا۔

ماشاء اللہ بیٹا۔ باہر نکلتے وقت پردہ چہرے پر گرالینا۔ انہوں نے اسے ہدایت دی تو فاطمہ مسکرا دی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں اماں جی کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے گھر سے نکل آئے اور قریبی بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ شومئی قسمت کہ انکو سری نگر جانے والی بس روانگی کے لیے تیار ملی۔ انہوں نے ٹکٹ خریدے اور بس میں سوار ہو گئے۔



ولید نے ایکبار پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذ پر نظر دوڑائی اور مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔

ہم صحیح پتے پر پہنچ گئے ہیں۔ ولید نے فاطمہ کو مخاطب کیا جو سر اٹھا ارد گرد پھیلے قدرت کے حسین مناظر کو تک رہی تھی۔ ولید نے داہنی طرف اشارہ کیا

اور وہ نشیب میں اترنے لگے۔ یہاں کچے مکانوں کی قطاریں تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ یہاں پر کچھ لوگوں کی آمد و رفت بھی دکھائی دے رہی تھی۔ فاطمہ نے جلدی سے اپنے چہرے پر نقاب گرالی۔ ولید نے رک کر ایک راگبیر سے پتا کنفرم کیا اور پھر سے قدم بڑھا دیئے۔ وہ ولید کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ایک مکان کے سامنے وہ رک گیا۔ فاطمہ کے پیروں کو بھی بریک لگی۔ انکے سامنے لکڑی کا بوسیدہ سا دروازہ تھا۔ ولید نے اس پر دستک دی۔ چند ثانیوں بعد دروازہ کھل گیا۔

جی۔ آپ کون۔ اسکے سامنے ایک گورا چٹا اور لمبا اونچا انتہائی پرکشش کشمیری کھڑا تھا جس کی عمر تیس سے بتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اسنے اپنی بھاری آواز میں ولید سے پوچھا۔ سوال کشمیری زبان میں کیا گیا تھا اسلیے ولید کچھ خاص سمجھ نہ پایا۔

کیا آپ اردو میں بات کر سکتے ہیں۔ اسنے اس خوب رو نوجوان سے پوچھا۔ جی ضرور۔ فرمائیے میں آپکی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ اسنے شستہ اردو میں دریافت کیا تھا۔ فاطمہ ولید کے عقب میں تھی۔ اور نوجوان کی نظر اس پر نہ پڑ سکی تھی۔

ہمیں رنبیر سنگھ پورہ سے آپکی خالہ زمانی خاتون نے بھیجا ہے۔ یہ انکا دیا ہوا خط ہے آپکی والدہ کے نام۔ اسنے تمہید باندھتے ہوئے خط اسکی جانب بڑھایا۔

نوجوان نے وہ خط اس کے ہاتھ کے لیکر اس پر جلدی جلدی نگاہیں دوڑائیں اور پھر گہری سانس بھری۔

تشریف لے آئے۔ مجھے حیدر عباس کہتے ہیں آپکی تعریف۔ اس نے اپنا ہاتھ اسکی طرف بڑھایا تھا۔

ولید حسن۔ ولید نے اندر داخل ہوتے ہوئے مسکرا کر اس سے مصافحہ کیا اور پھر پلٹ کر دیکھا۔ فاطمہ اب تک چوکھٹ پر ہی کھڑی تھی۔ اسکا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

آجاؤ فاطمہ۔ اسنے اسے مخاطب کیا تو وہ جھجھکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔
تشریف رکھے ولید صاحب۔ اماں جان برابر والوں کے گھر تک گئی ہیں کچھ دیر تک آجاتی ہیں۔ حیدر نے ولید کو آنگن میں بچھی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا ولید تو آرام سے جا بیٹھا۔ فاطمہ جھجھکتی ہوئی آنگن میں آن رکی۔ اور چہرے سے نقاب ہٹایا۔ عین اسی لمحے حیدر اسکی جانب پلٹا تھا۔ اسکی نظر ایک لمحے جو فاطمہ کے چہرے کی جانب اٹھی اور پھر جیسے پلٹنا بھول گئی۔ فاطمہ نے اسکی نظروں کا ارتکاز محسوس کر لیا تھا سو وہ جلدی سے چارپائی کی طرف بڑھ گئی۔ ولید نے کونے میں کھسکتے ہوئے اسکے لیے جگہ بنائی اور وہ سمٹی سمٹائی سی بیٹھ گئی نقاب پھر سے چہرے پر گرا لیا تھا۔ حیدر پلٹا اور فاطمہ کے چہرے کو پھر سے نقاب میں دیکھ کر آپ ہی آپ شرمندہ ہونے لگا۔ جانے کیسا سحر تھا اس

چہرے میں کہ اسکی نگاہ پلٹنا بھول گئی تھی۔ وہ ایک بہادر مجاہد تھا اسکی خشک سی زندگی میں کشت و خون کے علاوہ کچھ نہ تھا مگر اس سے اس نازک سی کشمیری لڑکی نے اس فولاد جیسے جوان کے دل میں جیسے گھنٹیاں سی بجا دی تھیں۔ وہ فوراً ہی اس منظر سے ہٹ کر باورچی خانے میں چلا گیا اور مہمانوں کے لیے چائے تیار کرنے لگا۔



انکی ساری روداد سننے کے بعد زمانی خاتون کی بہن آسیہ خاتون نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے فاطمہ کو اپنی بیٹی مان لیا تھا۔ حیدر تب تک گھر سے جا چکا تھا اسے کچھ کام تھا شاید۔ ان دونوں کی یہ کتھا وہ نہ سن سکا تھا۔ آسیہ خاتون نے ولید کے لیے کمرہ در سر کر دیا اور فاطمہ کو اپنے کمرے میں ہی بستر لگا دیا۔ انکو بہت عرصے بعد کوئی سامع ملا تھا سو وہ اسے رات دیر تک اپنے مرحوم بچوں اور شوہر کے قصے سناتی رہیں بولتے بولتے کبھی وہ رونے لگتیں تو کبھی مسکان انکے ہونٹوں کو چھو جاتی۔ فاطمہ کو انکے دکھوں کی داستان اتنے سنتے اپنے دکھ پھر سے یاد آنے لگے اور اسکی آنکھیں بھی بھگنے لگیں۔

اگلی صبح حیدر لوٹ آیا تھا۔ اس وقت آنگن میں بچھی چارپائی پر ولید بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا جبکہ فاطمہ ابھی جاگی نہ تھی آسیہ خاتون باورچی خانے میں تھیں۔ حیدر آکر سیدھا ولید کے پاس آبیٹھا۔

کیسے ہیں محترم۔ معاف کیجیے گا میں آپ کا نام بھول گیا۔ اسنے شائستہ لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

ولید حسن۔ ولید نے حسب عادت اپنی پلیٹ اسکے سامنے کی۔
شکریہ آپ کھائیے۔

لیجیے مجھے تنہا کھانے کی عادت نہیں ہے۔ ولید کا اسرار اپنائیت بھرا تھا اسلیے حیدر انکار نہ کر سکا اور اسکے ساتھ ہی ناشتہ کرنے لگا۔ اسی اثناء میں آسیہ خاتون ایک اور گرما گرم پراٹھ لیے چلی آئیں۔ انہوں نے حیدر سے کشمیری زبان میں کچھ گفتگو کی اور پھر واپس باورچی خانے میں چلی گئیں۔

ہاں تو ولید صاحب آپ پاکستانی فوجی ہیں اور اس لڑکی کو ریسکیو کر کے لائے ہیں۔ اسنے بات شروع کی۔

جی مگر آپکو کیسے معلوم ہوا۔

خالہ کے خط میں مختصراً یہی تحریر تھا۔

اوہ اچھا۔ ولید نے سر ہلایا۔ میری پہلی ترجیح فاطمہ کو محفوظ ہاتھوں میں سونپنا ہے اسکے بعد میں پاکستان واپسی کے متعلق سوچوں گا۔

واپس کیسے جائینگے آپ اور آپ ادھر پہنچ کیسے گئے۔ کیا جاسوسی کی غرض سے آئے تھے۔ حیدر نے سوال کیا۔ جواباً ولید نے اپنی ساری کتھا اسکے گوش

گزار کردی۔ حیدر کافی متاثر نظر آرہا تھا۔

میں آپکی بہادری کو سلام پیش کرتا ہوں کیپٹن۔ اسنے ہاتھ پیشانی تک لیجا کر عقیدت سے کہا تھا۔

دوست بہادر تو آپ لوگ ہیں جو اس مقبوضہ وادی میں ستر سالوں سے بھارت کے مظالم سہہ رہے ہیں۔ مگر آپ کے پایہء استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ ولید نے توصیفی لہجے میں کہا۔ آپکی خالہ بتا رہی تھیں کہ آپ بھی مجاہد ہیں۔ جی۔ الحمد للہ۔ آج تک اپنے ہاتھوں سے کئی ظالم بھارتیوں کو جہنم واصل کرچکا ہوں۔ طالب علمی کے دور میں ہی ایسے حادثات کا سامنا کرنا پڑا کہ دل نے ٹھان لی بقیہ زندگی آزادی کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے گزارنی ہے۔ میں نے اک منظم گروپ بنانے کا سوچا۔ پہلے پہل میرے ساتھ لوگ کم تھے مگر آہستہ آہستہ پورا قافلہ بن گیا۔ ہمارا گروپ بہت مضبوط ہے ولید صاحب۔ ہم انشاء اللہ ایک دن آزادی حاصل کر کے رہیں گے۔ اسکے لہجے میں عزم تھا ولید نے دل سے آمین کہا تھا۔

پاکستانیوں سے مل کر بہت مسرت ہوتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ کچھ دن یہاں رکیں۔

ضرور۔ مگر مجھے اپنی واپسی کے متعلق کچھ سوچنا ہے پلاننگ کرنی ہے۔

میری خدمات حاضر ہیں۔ ان فیکٹ ہمارا گروپ بارڈر پار کروانے میں آپکی

بھرپور مدد کر سکتا ہے۔ اسنے پرجوش لہجے میں کہا۔ ولید کھانے سے ہاتھ روک کر اسے تکتے لگا۔

کیا واقعی۔ اسکے لہجے میں امید تھی۔

جی انشاء اللہ۔ اسنے اسے یقین دلایا تھا۔ تبھی فاطمہ کمرے سے باہر آئی اس سے وہ سیاہ چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔ اسکی آنکھیں خواب آلود ہو رہی تھیں اور چہرے پر سرخی دوڑ گئی تھی۔ حیدر بلا ارادہ ہی اسکی طرف متوجہ ہوا تھا۔ السلام علیکم! اسنے از خود اسے مخاطب کیا۔ فاطمہ نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔

جی وعلیکم سلام! وہ جلدی سے بول کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ حیدر نے سر جھٹک کر ولید کی طرف دیکھا جو جانے کس سوچ میں گم تھا۔

کہاں کھو گئے دوست۔ اسنے اسکی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تو وہ چونکا۔

کہیں نہیں بس اپنی بیوی اور بچے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جائینگے۔ میرے سب گھر والے تو مجھے سات سال پہلے رو چکے ہیں حیدر۔۔ اب میں جا کر انکو سرپرائزڈ کر دوں گا۔ وہ کھلی آنکھوں سے سپنے بن رہا تھا۔ حیدر نے اسکے درد کو اپنے دل میں محسوس کیا تھا۔

تم بہت جلد پاکستان جاؤ گے ولید یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اسنے اسکے شانے پر

ہاتھ رکھ کر مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ ولید نم آنکھوں سے مسکرا دیا۔



تمام مراحل بخوبی حل ہو گئے تھے اور سلمیٰ مسز اسلم کے ہمراہ اسلام آباد چلی آئی۔ جو نہی گاڑی اسلام آباد شہر کی حدود میں داخل ہوئی سلمیٰ کے چہرے پر اک عجیب سی بے چینی کے آثار نظر آنے لگے۔

کیا ہوا بیٹا۔ اسکو بار بار سیٹ پر پہلو بدلتے دیکھ کر مسز اسلم نے نرم لہجے میں پوچھا۔

کچھ نہیں آپ کہاں رہتی ہیں آنٹی۔ اسنے سر جھٹک کر پوچھا۔
ایف ٹین میں۔ مسز اسلم نے جواب دیا تو سلمیٰ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔ ایف ٹین۔۔ ایف ٹین۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنی پیشانی مسلنے لگی۔

آنٹی۔ زین نے اسے پکارا تو وہ چونکی۔

جی بیٹا۔ وہ مسکرائی۔

آپ اب کبھی واپس تو نہیں جائیگی ناں۔ اسنے اپنی توتلی زبان میں پوچھا۔

جی بیٹا اب میں ہمیشہ آپکے ساتھ رہوں گی۔ سلمیٰ نے جھک کر محبت سے اسکے پھولے پھولے گال چوم لیے۔ زین کی معصوم آنکھوں میں چمک دوڑ گئی تھی۔



ماما۔۔ پھپھو آگئی۔۔

اوہ اچھا۔

جی ماما چلیں ناں وہ دادو سے مل رہی ہیں ابھی۔

تم چلو بیٹا میں آتی ہوں۔

نہیں ماما آپ چلیں بس۔

افوہ دانی مجھے کھینچو تو مت بیٹا۔

چلیں چلیں چلیں۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اوکے چل رہی ہوں ناں۔

جلدی چلیں۔

جلدی ہی تو چل رہی ہوں اب بھاگنے لگ جاؤں کیا۔

پھپھو۔۔ پھپھو۔۔

ہائے دانی۔۔

پھپھو ماما آگئیں۔

کہاں ہیں

یہ رہی۔

ہیلو کیسی ہو روحی۔

میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو۔

میں بھی ٹھیک۔ تمہارا سفر کیسا رہا۔

اچھا رہا۔ دانی بیٹا آپ اپنے کزنز سے نہیں ملے۔ آؤ میں آپکو ملواتی ہوں۔

پھپھو پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ ماما اور بابا کی شادی کی تصویروں کا البم لائی ہیں یا نہیں۔

تصویروں کا البم۔۔۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews



تم جارہے ہو ادھارک انہیں وہاں پہنچے ساتواں روز تھا جب ولید کے جانے کا سن کر فاطمہ نے اس سے پوچھا۔

جانا تو ہے ہی۔

مگر اتنی جلدی ادھارک۔

فاطمہ میں تمہیں محفوظ ہاتھوں میں سونپنا چاہتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں سو اب میں مطمئن ہو چکا ہوں۔ اسلیے واپسی کا سوچ رہا ہوں۔

ہوں یہ تو ہے۔ مگر ادھارک کیا تم سے میری دوبارہ کبھی ملاقات نہ ہو پائے گی۔۔ فاطمہ کی سبز آنکھوں میں اداسی تھی۔

کیا پتہ۔۔ شاید قسمت ہمیں پھر کسی موڑ پر آمنے سامنے لے آئے۔ وہ ہولے سے مسکرایا۔

ادھارک۔۔ وہ جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئی۔۔

یہ ادھارک کیوں بلاتی ہو تم مجھے بھئی میرا نام ولید ہے۔

کیونکہ تم میرے لیے ادھارک ہی تو ہو۔۔

اچھا مگر ادھارک کا مطلب کیا ہے۔

ادھارک یعنی وہ جو کسی کو نجات دلائے۔

یعنی نجات دہندہ۔۔

ہاں شاید اردو میں اسکا یہی مطلب ہوگا۔ فاطمہ نے سر ہلایا۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

تم مجھے یاد رکھو گے ادھارک اس نے سوال پوچھا۔

ہاں فاطمہ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں کیونکہ تمہیں یاد رکھنے کی میرے پاس بہت سی وجوہات ہیں۔ تم نے میری جان بچائی مجھے نئی زندگی دی۔ اور سب سے بڑھ کر فاطمہ تم نے مسلمان کی حیثیت سے مجھے میرا فرض یاد دلایا۔ ورنہ

میں تو سات سالوں سے صرف پاکستان واپس جانے کی چاہت لیے بیٹھا تھا۔ تم میری زندگی میں آئی تو مجھے سمجھ آیا کہ مجھے قدرت نے کشمیر کیوں بھیجا میرا ادھر آنے کا مقصد کیا تھا۔ اللہ نے مجھے موقع دیا تھا کسی بھٹکے ہوئے کو راہ دکھانے کے لیے۔ تم نے میرے اندر کے پکے مسلمان کو جھنجھوڑا ہے فاطمہ۔ مجھے پتہ چلا کہ زندگی صرف ایسا کی محبت نہیں ہے بلکہ اصل زندگی تو اللہ کی خاطر جینے کا نام ہے۔ تم نے مجھے لفظ محبت کے اصل معنی سکھائے ہیں فاطمہ۔ اور اب میں اس جگہ سے مطمئن دل لیکر واپس جا رہا ہوں۔ تمہاری ثابت قدمی نے مجھے بہت حوصلہ دیا ہے فاطمہ تم نے اپنی ساری محبتیں چھوڑ دیں اللہ کی محبت کی خاطر یہ بات قابل تقلید ہے۔ اور میں اب مرتے دم تک اللہ کی محبت میں جیوں گا انشاء اللہ۔ اور جب جب اللہ کی محبت مجھ سے قربانی مانگے گی مجھے تم یاد آؤ گی تمہاری قربانی یاد آئے گی اور میں بخوشی اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاؤں گا۔ وہ اک عزم سے پر لہجے میں بولتا جا رہا تھا۔ اور فاطمہ نم آنکھوں کیساتھ کسی سحر زدہ کی طرح اسے تک رہی تھی۔

ادھارک! تم میری زندگی میں آنے والے سب سے اچھے انسان ہو۔ تم نے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھایا ہے۔ میں تو آج تک بس انسانوں کی خاطر جیتی رہی تھی مگر تم نے مجھے ایمان کی روشنی تھما کر اللہ کے سہارے جینا سکھایا ہے یہ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان رہے گا۔ اور میں اس احسان کے بدلے ساری

جنگی تمہاری کھوشیوں کے لیے پراتھنا کرتی رہو گی۔ جب تم پاکستان پہنچ کر اپنے پری وار سے ملو گے ناں تو اپنی پتی کو میرا سلام کہنا اور اپنے بچے کو میرا بہت پیار دینا۔ اس نے بہتے آنسوؤں کیساتھ کہا تھا۔ ولید کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔

تمہاری زندگی میں اب سب کچھ اچھا ہی ہوگا فاطمہ مجھے یقین ہے۔ اسنے اسکے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ فاطمہ نے سر جھکا لیا۔ اسکی آنکھیں زار و قطار بہہ چلی تھیں۔ قرینے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وقتِ رخصت آن پہنچا ہے۔

تم ابھی جا رہے ہو ادھارک۔۔ اسنے پوچھا۔
 حیدر نے کہا تھا کہ کچھ دیر تک نکلیں گے۔ اس نے بتایا۔ فاطمہ کا دل ڈوب کر ابھرا۔

ادھارک! وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

مت روؤ فاطمہ۔ مجھے تو جانا ہی تھا۔

ہاں جانتی ہوں۔۔ مگر۔۔ اسکی آواز اسکے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ ولید نے ایک گہری نظر فاطمہ پر ڈالی۔ جو کھلے سے ڈھیلے ڈھالے لباس پر لمبی سی سیاہ چادر اوڑھے بہت پاکیزہ نظر آرہی تھی۔ نظریں جھکائے آنسو بہاتی ہوئی۔ اس سے اسے فاطمہ میں ایسا کا عکس نظر آیا تھا۔ حالانکہ فاطمہ کے حسن بلاخیز کا تو عشرِ عشیر بھی ایسا کے پاس نہ تھا مگر وہ پاکیزگی تھی جو ان دونوں میں

مشترک تھی۔

فاطمہ

ہاں ادھارک۔ اسنے نظریں اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔ سبز آنکھیں لبالب بھری ہوئی تھیں۔

آنسو صاف کرو۔ اسنے نرم لہجے میں کہا تو فاطمہ نے میکانیکی انداز میں ہاتھوں کی پشت سے گالیں رگڑ ڈالیں۔

خود کو بہت مضبوط رکھنا ہے تم نے فاطمہ۔ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے ہیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ تم میرے ساتھ پاکستان چلو مگر تم یہیں رہنا چاہتی ہو تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا مگر کچھ نصیحتیں ضرور کرونگا۔ دیکھو فاطمہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں مگر یہ یاد رکھنا کہ کبھی بھی کسی پر اچانک سے اندھا اعتماد نہیں کر لینا چاہیے۔ تم مقبوضہ وادی کی ایک مسلمان شہری ہو سو ظلم کی تلوار تمہارے سر پر ہر وقت لٹکتی رہے گی۔ زندگی میں کتنا بھی تکلیف دہ وقت

کیوں نہ آئے کبھی اسلام سے نہ پھرنا۔ ہمیشہ ثابت قدم رکھنا۔ میں نے تمہارے لیے بہت نیک تمنائیں کی ہیں فاطمہ۔ میرے پاس وقت کم ہے ورنہ میں خود تمہارے لیے ایک نیک شوہر ڈھونڈ کر لاتا۔ لیکن میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ تم انشاء اللہ بہت اچھا اور صالح شریک سفر پاؤ گی۔ وہ مدہم لہجے میں اس سے مخاطب تھا اور اسکا ایک ایک لفظ فاطمہ اپنی سماعتوں

میں محفوظ کر رہی تھی۔ تبھی دروازہ بجا تو وہ دونوں چونکے۔ ولید نے چھوٹا سا آنگن پار کر کے دروازہ کھولا۔ حیدر اندر داخل ہوا۔ سفید شلوار قمیض پر خاکی جیکٹ پہنے پیروں میں جاگرز پہنے بکھرے بالوں کیساتھ وہ سفری بیگ کاندھے پر ڈالے تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

السلام علیکم! آپ تیار ہیں ولید صاحب۔ اسنے چھوٹے ہی پوچھا۔

ہاں بالکل تیار ہوں۔ ولید نے جواب دیا۔

بس تو پھر چلیں۔ اماں کدھر ہیں۔ اسنے گھر کے اندر قدم دھرتے ہوئے پوچھا۔ فاطمہ آنگن میں ایک جانب ہو کر کھڑی تھی۔ حیدر کی نظریں اس پر نہ پڑی تھیں۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

وہ باورچی خانے میں ہیں۔ ولید نے اسے بتایا۔ حیدر باورچی خانے میں چلا گیا۔ ولید کے پاس کچھ خاص سامان تو نہ تھا اسنے بس سفر کے دوران ضروری چیزیں ایک بیگ میں ڈال لی تھیں۔ اسنے وہ بیگ کاندھے پر ڈالا۔ وہ حیدر کے سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھا سیاہ رنگ کا سویٹر بھی اسی کا تھا۔ فاطمہ تیر کی طرح اسکے سامنے آن رکی۔

اپنا خیال رکھنا اُدھارک۔

تم بھی اپنا خیال رکھنا فاطمہ۔

رابطہ رکھنے کا کوئی بندوبست نہیں ہو سکتا اُدھارک

میں نے حیدر کا موبائل نمبر اپنے پاس رکھ لیا ہے اگر پاکستان تک زندہ سلامت پہنچ گیا اور سامان میرے پاس رہا تو ضرور رابطہ کرونگا۔ اسنے جواب دیا۔

اگر۔۔۔ فاطمہ بڑبڑائی۔

سچویشن تمہارے سامنے ہیں فاطمہ ایسے میں کوئی کنفرم بات کیسے کہی جاسکتی ہے۔ ولید نے نرم لہجے میں کہا تبھی حیدر اپنی ماں سمیت باورچی خانے سے برآمد ہوا۔

چلیں دوست۔ حیدر نے اسے مخاطب کیا تھا۔
ہاں چلو۔ اچھا ماں جی اجازت دیجیے۔ وہ آسیہ خاتون کے سامنے تعظیماً جھکا۔

جیتے رہو بیٹا۔ اللہ تمہیں ساتھ خیریت کے اپنے وطن پہنچائے۔ آسیہ خاتون نے اسکے سر پر ہاتھ پھیر کر دل سے دعا دی۔

فاطمہ کا بہت خیال رکھیے گا ماں جی۔ میں اسے آپکے آسرے پر چھوڑے جا رہا ہوں۔ یہ یاد رکھیے گا کہ یہ ایک بہت دکھی لڑکی ہے۔ اسکو ہمدردی اور محبت کی بہت ضرورت ہے۔ اسنے گزارش کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

فاطمہ کو میں نے اپنی بیٹی کہا ہے بیٹا جب تک میرے دم میں دم ہے میں

اسکو اپنے کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ آسیہ خاتون نے فاطمہ کو اپنے بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے مضبوط لہجے میں جواب دیا تھا۔

چلو ولید۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ حیدر نے اسے مخاطب کیا تو وہ پلٹا۔

ہاں چلو۔ اچھا ماں جی۔ فاطمہ اللہ حافظ۔ اسنے ان دونوں کو ہاتھ ہلایا اور حیدر کے ہمراہ قدم داخلی دروازے کی طرف بڑھا دیئے۔ حیدر اس سے ایک قدم آگے تھا وہ دروازہ پار کر گیا جب فاطمہ تیزی سے آئی اور ولید کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

اُدھارک۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ولید اسکی جانب پلٹا۔ دروازے کے پاس کھڑا حیدر بھی انکی طرف متوجہ ہو گیا۔ فاطمہ اور ولید اک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ فاطمہ کے سر سے چادر ڈھلک کر شانوں تک آن پہنچی تھی اسکی سبز آنکھوں سے آنسو اک تواتر سے جاری تھے۔

مجھے جانا ہے فاطمہ۔ ولید کی آنکھیں جیسے اسے وارن کر رہی تھیں۔

جانتی ہوں۔۔ فاطمہ نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی مگر آنسو تھے کہ اک تواتر سے بہہ رہے تھے۔

خود کو سنبھالو فاطمہ۔ ایک نئی زندگی تمہاری منتظر ہے۔ تم نے اسلام قبول کیا ہے اسکی تعلیمات حاصل کرو اور ہاں مجھے دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھنا۔ میں ابیہا کو تمہارے متعلق ضرور بتاؤں گا۔ بات کے اختتام میں وہ مدھم سا مسکرایا تھا۔

فاطمہ بھی مسکرائی۔ نم آنکھوں سے مسکرانا کیسا کٹھن تھا۔ ولید نے اسکی چادر اسکے سر پر اوڑھائی۔

اللہ تمہیں ہمیشہ ہدایت پر قائم رکھے فاطمہ۔ اسنے اسے دل سے دعا دی تھی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ ولید نے اسکے سر پر ہاتھ رکھا۔ اسکی آنکھیں بھی چھلک پڑی تھیں۔

الوداع۔ شر دھا۔ اسنے نم آنکھوں کیساتھ بہت آہستہ آواز میں کہا تھا فاطمہ کے سوا کوئی سن نہ پایا تھا۔ فاطمہ کے ہونٹوں پر سوگوار سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

الوداع اُدھارک۔ اس نے بھی حساب برابر کر دیا تھا۔ ولید کھل کر مسکرایا۔ پھر اسے ہاتھ ہلا کر جانے کو پلٹ گیا۔ وہ وہیں چوکھٹ کے قریب کھڑی اسے دم بہ دم دور جاتا دیکھتی رہی۔ ولید نے ایک بار بھی مڑ کر نہ دیکھا تھا۔ فاطمہ اسے تکتی رہی یہاں تک کہ وہ اسکی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ دھیرے دھیرے وہیں دروازے کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔

ایک بات جو میں نے تم سے کبھی نہیں کہی وہ ان کہی میری زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے ادھارک۔۔ مگر اس سچائی کو تو ان کہا ہی رہنا تھا۔ اگر میں پہلے جیسی مشرک اور دنیا دار شر دھا ہوتی تو تمہیں اپنے ہی تک محدود کرنے کے جتن کرتی۔۔ مگر فاطمہ ایسا نہیں کر سکتی۔ میں اگر چاہتی تو تمہارے ساتھ

پاکستان چلی جاتی مگر میں تمہاری محبت کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔
تم نے اور تمہاری پتی نے سات سال ایک دوسرے کی جدائی میں گزارے ہیں
تم دونوں کے درمیان کسی تیسرے کی گنجائش نہیں۔ تم نے جو ایمان کی
مشعل مجھے تھمائی ہے اُدھارک میں اس کی روشنی میں ساری عمر گزار سکتی
ہوں۔

میں تمہیں آخری دم تک یاد رکھوں گی اُدھارک مگر کبھی کسی کو وہ ایک بات
نہ بتاؤں گی۔۔ جو میں نے کبھی خود سے بھی نہ کہی۔۔ کیونکہ وہ تو میرا راز
ہے۔۔ اور راز کسی کو بتائے نہیں جاتے۔ وہ دل ہی دل میں ولید سے مخاطب
تھی اور آنسو قطرہ قطرہ اسکی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔۔
بیٹی اندر چلو۔ آسیہ خاتون نے اسے پکارا تو وہ چونکی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایکبار
پھر دروازے سے باہر جھانکا۔ پہاڑی راستہ سنسان تھا۔ مسافر جاچکے تھے۔۔ اور
مسافروں کو تو جانا ہی تھا۔ اسنے ایک گہری سانس بھر کر اپنے چہرے سے سب
آنسو مٹا ڈالے اور دروازہ بند کر کے اندر پلٹ آئی۔



رات کے اندھیرے میں ولید بارڈر پار کرنے کو تیار تھا۔ حیدر اسکے ہمراہ تھا۔
ولید غیر قانونی طور پر بارڈر پار کر رہا تھا جو کہ ایک بہت بڑا رسک تھا۔ مگر
اسے یہ رسک تو لینا ہی تھا۔ اسنے پلٹ کر حیدر کی طرف دیکھا۔ اماوس کی

گھنی رات میں حیدر کا چہرہ اندھیرے میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں گزشتہ تین دنوں سے بارڈر کی پوزیشن چیک کر رہے تھے۔ ولید نے نقشے کی مدد سے بارڈر کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ خاردار تاروں کے نیچے سے بارڈر پار کرنا بہت خطرناک تھا مگر ولید ہر طرح کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

سو۔۔ حیدر بولا۔ اسکی آوا سرگوشی سگ بلند نہ تھی۔

سو۔۔ ولید بھی اسی انداز میں بولا۔

اب کیا پلان ہے۔

بس تین بجتے ہی میں بارڈر کی طرف موو کرونگا۔ اسنے جواب دیا۔

اور میں ڈیوٹی پر موجود فوجیوں کا دھیان بٹانے کی خاطر ایک دھوئیں کا بم پھینکوں گا۔ تم اپنا رخ ناک کی سیدھ میں رکھنا میں بم بائیں جانب پھینکوں گا تاکہ ایک بھگدڑ مچ جائے اور تم باسانی بارڈر پار کر جاؤ۔ حیدر نے سارا پلان دہرایا۔ ولید نے سر ہلادیا۔ وہ دونوں دم سادھے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی گھڑی نے رات کے تین بجائے ولید نے حیدر سے الوداعی معانقہ کیا اور اک دوسرے سے الوداعی کلمات کا تبادلہ کرنے کے بعد وہ دونوں ہی مخالف سمتوں میں رینگ گئے۔ رات کا اندھیرا بہت گہرا تھا۔ ولید جھاڑیوں میں کسی چھپکلی کی طرح سینے کے بل رینگ رہا تھا جھاڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ بھی نہ تھی۔ اس طرح رینگنے کی مشق انہیں باقاعدہ کروائی جاتی تھی۔ ولید کے ذہن میں

سارا نقشہ محفوظ تھا وہ رینگتا رہا جب اسکے اندازے کے مطابق وہ بارڈر سے چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو وہ رک گیا۔ بارڈر پر ڈیوٹی دینے والی فوجی گشت کر رہے تھے۔ اسنے جھاڑیوں سے ذرا سا سر ابھارا خاردار تاروں کے اس طرف اسکا پیارا پاکستان تھا۔ ہر طرف گھور تاریکی کا راج تھا اور سناٹے میں جھینگروں کی آوازیں بہت واضح تھیں۔ ولید دم سادھے زمین سے چپکا رہا۔ اسکے اندازے کے مطابق اب حیدر کو دھوئیں کا بم پھینک دینا چاہیے تھا۔ وہ خاموشی سے آہٹ لے رہا تھا جب اچانک فضاء میں کسی الو کی تیز آواز گونجی۔ ولید چونکا ہو گیا۔ الو کی آواز ایک بار پھر سنائی دی اور وہ بالکل الٹ ہو گیا۔ یہ ایک سنگل تھا حیدر کی طرف سے کہ وہ دھوئیں کا بم پھینکنے لگا ہے۔ ولید تیزی سے ناک کی سیدھ میں ریگنے لگا۔ خاردار تاریں اس سے ذرا سی دوری پر تھیں۔ وہ رک کر آہٹ لینے لگا۔ گشت کرنے والے فوجی اس طرف آرہے تھے۔ اسی لمحے بم دھماکے کی تیز آواز کیساتھ ہی ہر طرف روشنی کے کوندے لپک گئے۔ ولید جھاڑیوں میں دبکا رہا۔ فوجی بھڑک کر بھاگے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ ولید نے جھاڑیوں سے سر ابھارا۔ دور آگ لگی ہوئی تھی۔ اور فوجی مصیبت زدوں کی طرح اس جانب بھاگے جارہے تھے۔ دوسری جانب پاکستانی فوجی بھی اسی جانب اکٹھا ہو رہے تھے۔ ولید کے لیے میدان صاف تھا۔ وہ تیزی سے رینگتا ہوا خار دار تاروں کے نیچے سے بارڈر پار کر گیا۔ اسکی پشت زخمی ہو گئی تھی۔ مگر وہ رک نہیں ریگتا رہا۔ کافی آگے تک جا کر جھاڑیوں کا سلسلہ رک گیا

تھا۔ ولید نے گردن موڑ کر دیکھا۔ آگ کے لپٹے آسمان تک جارہے تھے اور نواحی گاؤں کے لوگ بھی اب جوق در جوق بارڈر کی طرف جارہے تھے۔ مقامی دیہاتیوں کا اک ہجوم کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ ولید کھسکتا ہوا آگے بڑھا اور ہجوم تک پہنچ کر اس میں ضم ہو گیا۔ وہ سب بارڈر کی طرف جارہے تھے مگر فوجیوں نے انکو بارڈر کے پاس نہ جانے دیا تھا۔ سو وہ سب واپسی کے لیے پلٹ گئے۔ ولید بھی اسی ہجوم میں چلتا گاؤں میں آبادی میں چلا آیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جارہے تھے۔ وہ چپکے سے ایک طرف کھسک گیا۔ کچھ ہی دیر بعد کھیت بالکل سنسان ہو گئے تھے۔ کھلے آسمان تلے وہ تنہا کھڑا تھا۔ ولید نے دو تین گہری گہری سانسیں لیں پھر بے اختیار ہی زمین پر جھکا اور سجدے میں گر گیا۔ وہ اپنے وطن واپس پہنچ گیا تھا۔ وہ بے طرح رو پڑا۔ یا اللہ تیرا شکر۔ وہ بس یہی الفاظ دہرا رہا تھا۔ سات سال بعد اس نے اپنے وطن کی سرزمین کو چھوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں مٹی بھر کر اسکی خوشبو کو اپنی سانسوں میں اتارا۔ اسے مٹی کی مہک دنیا کے بیش قیمت پرفیومز کی مہک سے کہیں زیادہ افضل لگی تھی۔ اسکا دل چاہا وہ کسی ننھے بچے کی طرح اچھلتا ہوا خوشی کے نعرے بلند کرے۔۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور بھاگتا ہوا کھیت کے چکر لگانے لگا۔ بھاگتے بھاگتے تھک گیا تو ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اسکا دل جھوم رہا تھا۔ سات سال قبل جب اسے بھارت میں ہوش آیا تھا تو اسے یہ ایک فیصد بھی امید نہ تھی کہ وہ کبھی واپس اس سرزمین پر قدم دھرے گا مگر یہ اسکے رب کا کیسا کرم

تھا کہ وہ کئی بار موت کے منہ سے بچ کر زندہ سلامت اپنے وطن لوٹ آیا
تھا۔ ولید حسن کا خوشی سے جھومنا قدرتی سی بات تھی۔



اما آپ تو کہتی تھیں کہ فوٹو البمز پھپھو کے پاس ہیں مگر انکے پاس تو نہیں
ہیں۔

شاید میں کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں گی۔

مگر آپ تو کہہ رہی تھیں کہ پھپھو نے کہا ہے وہ لے کر آئیں گی۔ آپ نے
جھوٹ بولا تھا ناں اما۔

دانی اسٹاپ اٹ۔ میں ماں ہوں تمہاری مجھ سے یوں تھانیداروں کی طرح سوال
جواب مت کرو۔

آئم سوری۔۔

جاؤ جاکر سو جاؤ۔

اما پلیز ناراض مت ہوں۔ میں آئندہ کبھی البمز کا نہیں پوچھوں گا آئی پراس۔

دانی فار گاڈز سیک۔ پلیز سو جاؤ جاکر۔ ابھی میرا سر مت کھاؤ۔

اچھا ٹھیک ہے اما میں جاکر سو جاتا ہوں آپ پلیز اسٹیریس نہ لیں۔



سلمیٰ مسز اسلم کے گھر آکر ذہنی طور پر کافی ڈسٹرب نظر آنے لگی تھی۔ وہ اکثر ٹیرس پر کھڑی رہتی یا زین کو ساتھ لیے قریبی پارک میں جا بیٹھتی۔ مسز اسلم نے بارہا اس سے اس بے چینی کا سبب پوچھا مگر وہ تو خود اس کے سبب سے نابلد تھی انہیں کیا بتاتی۔۔ اس کا ذہن جیسے اک طویل عرصے بعد گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔ مگر ابھی وہ اجالے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی یوں جیسے اگر بہت دیر تک اندھیرے میں رہنے کے بعد اچانک اجالے میں آیا جائے تو کچھ دیر تک آنکھیں دیکھنے کے قابل نہیں رہتیں۔ سلمیٰ کیساتھ بھی کچھ ایسا ہوا تھا وہ سات سالوں سے اندھیرے میں رہ رہی تھی اس کے شعور و لا شعور کی سطح بالکل پر سکون تھی۔ مگر اب اس پر سکون جھیل میں اک تلاطم آنے کا بے قرار تھا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews



ولید کی جیب میں ایک روپیہ نہ تھا اور اس کے سامنے سب سے پہلا مرحلہ آرمی ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کرنے کا درپیش تھا۔ وہ پیدل ہی شہری آبادی تک پہنچا۔ بھوک کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ وہ ایک جگہ رک کر سانس بحال کرنے لگا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سڑکوں پر کافی رَش تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ غنیمت تھی کہ سردیوں کا موسم تھا ورنہ ولید کا پیاس کے مارے برا حال ہو چکا ہوتا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ سڑک کے اس پار ایک باوردی پولیس والا کھڑا تھا۔ ولید کے ذہن میں ایک خیال نے سر اٹھایا اور وہ

اٹھ کر تیزی سے سڑک پار کر کے پولیس والے کے پاس چلا آیا۔

السلام علیکم! اسنے پولیس والے کو مخاطب کیا۔

جی وعلیکم السلام فرمائیں۔ وہ اسکی طرف متوجہ ہوا۔ ولید کا حلیہ بہت اچھا نہ تھا اسلیے اسکی آنکھوں میں شبے کی جھلکیاں تھیں۔

میرا نام ولید حسن ہے۔ مجھے آپکی مدد کہ ضرورت ہے۔ اسنے نرم اور شائستہ لہجے میں کہا۔

جی فرمائیے۔

میں پاکستان آرمی سے تعلق رکھتا ہوں۔ سات سال قبل میں سیاحین میں پوسٹڈ تھا اور وہاں پر ایک طوفان کا شکار ہو کر میں بھارت پہنچ گیا پھر سات سال میں وہاں جیل میں رہنے کے بعد اب بھاگ آیا ہوں۔ اسنے ایک ہی سانس میں مختصراً اپنی کتھا سنادی۔ پولیس والے کی آنکھوں میں شبے کی جھلکیاں مزید بڑھ گئیں اور اسنے جھپٹ کر ولید کا بازو تھام لیا۔

اوائے سچ سچ بتا کون ہے تو۔ اسنے جلدی جلدی اسکا جسم ٹٹولا مبادا وہ کوئی خود کش بمبار نہ ہو۔

میں نے آپکو اپنے متعلق سب سچ سچ بتادیا ہے۔ آپ پلیز آرمی ہیڈ کوارٹر تک پہنچا دیں مجھے۔ اسنے ہنوز نرم لہجے میں کہا تھا۔ مھر پولیس والے نے اسے

گردن سے دبوچا اور چند قدم کے فاصلے پت بنی چوکی میں لے آیا۔ وہاں موجود اے ایس آئی نے بھی اسکی کتھا سنی اور اسکے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر لاری میں لاد کر تھانے لے آئے۔ ولید اس ساری کرروائی میں بالکل چپ رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اسکی بات پر یقین کرنا مشکل تھا۔ تھانے کے انچارج نے اس کی ساری بات سننے کے بعد کچھ دیر اپنی داڑھی کھجائی پھر اٹھ کر فون کا رسیور اٹھا کر اپنے اعلیٰ حکام سے بات کرنے لگا۔ یکے بعد دیگرے کچھ کالز کرنے کے بعد اسنے رسیور رکھ کر ولید کی طرف دیکھا جو سر جھکائے کھڑا تھا۔ نام کیا ہے تمہارا۔ اسنے کڑک لہجے میں پوچھا۔

ولید حسن ولد حسن احمد خان۔ اسنے ترنت جواب دیا۔
 اپنی جاب ڈیٹیل بتاؤ کونسی بٹالین میں تھے۔ وہ اپنے تئیں اسکا امتحان لے رہا تھا۔ ولید نے بلا جھجک اپنی بٹالین بتادی۔

اسکا بیان ریکارڈ کرو۔ انچارج نے محرر کو حکم دیا۔ اگلے آدھے گھنٹے تک اسکا بیان ریکارڈ ہوتا رہا اسکے بعد وہ بیان انچارج نے سنا اور پھر سے فون پر مصروف گیا۔ ولید کا بیان بمعہ تصویر آرمی کو ارسال کر دیا گیا اور ولید کو حوالات میں ڈال دیا گیا۔ ایک روز بعد ہی آرمی کی جانب سے ولید کے ریکارڈ کی تصدیق کردی گئی اور اسے آرمی ہیڈ کوارٹر سیالکوٹ میں طلب کیا گیا۔ وہاں اسکو کچھ شناختی مراحل سے گزارا گیا اور شناخت کے بعد اسکی کتھا پھر سے سنی

گئی۔ ولید نے تفصیل سے خود پر بتی گئی تمام داستان سنائی تو اسکے آفیسرز نے اسے خوب داد دی اور پریس ریلیز جاری کر دی گئی۔ ولید کے گھر والوں سے بھی رابطہ کیا گیا۔ شومئی قسمت کہ وہ لوگ آج تک اسلام آباد میں اسی گھر میں رہتے تھے۔ ولید کو اسلام آباد بھیج دیا گیا۔ اسے ایئر پورٹ پر ریسیو کرنے کے لیے مئی سکندر اور روحینہ آئے تھے۔ ولید تو اپنی ماں کو دیکھ کر دنگ ہی رہ گیا تھا۔ وہ اس حسین اور خوبصورت شکلیہ بیگم کا سایہ ہی نظر آتی تھیں۔ کمزور اور لاغر اپنی عمر سے بھی کہیں زیادہ عمر رسیدہ لگنے لگی تھیں۔ ولید بے اختیار ماں سے لپٹ گیا۔ اسکی آنکھوں سے ساون بھادوں جاری تھا۔ شکلیہ بیگم بھی سسک رہی تھیں۔ وہ سب ہی دنگ تھے۔ جس ولید کو سات سال قبل وہ روچکے تھے وہ آج زندہ سلامت انکے سامنے کھڑا تھا۔ وہ خوش ہوتے یا دکھی انکی سمجھ سے باہر تھا۔ دوسری طرف ولید کی نظریں بے قراری سے ایہا کا تلاش کر رہی تھیں۔ مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہ دی تھی۔

مئی ایہا کدھر ہے۔ اسنے بلاخر پوچھ ہی لیا۔

گھر چلتے ہیں ناں بھیا۔ روحینہ جلدی سے آگے بڑھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ بھر چکی تھی مگر اسکی خوبصورتی آج بھی برقرار تھی۔

بیا گھر پہ ہے ناں روحی۔ اسکی بے چینی عروج پہ تھی۔

ارے میرے بھائی مجھ سے تو مل لے۔ سکندر نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا

تھا اور وہ بھی اسکی جانب متوجہ ضرور ہو گیا تھا مگر اسکا دماغ ایسا میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ کچھ ثانیے بعد وہ سب سکندر کی بڑی ہی سی سیاہ کرولا میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو گئے۔ روحینہ تمام رستہ اسے اپنی فیملی اور بچوام کے متعلق بتاتی رہی ولید کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ہوائی اڈے سے گھر تک کا فاصلہ کافی طویل تھا ولید کو آج یہ راستہ کچھ زیادہ ہی طویل لگا تھا۔ خدا خدا کر کے گاڑی گھر کے سامنے رکی۔ وہ عالیشان گھر آج بھی ویسا ہی تھا بس گیٹ تبدیل ہو چکا تھا اور بیرونی دیواروں کا رنگ و روغن۔ چوکیدار نے ہارن کی آواز سن کر جلدی سے گیٹ کھولا۔ گاڑی زن سے پتھریلی روش کا سینہ چیرتی ہوئی پورچ میں آن رکی۔ لان اور برآمدے کی تمام بتیاں روشن تھیں۔ ولید کا دل کسی نو عمر عاشق کی طرح اچھلنے لگا جو پہلی بار اپنی محبوبہ سے ملاقات کرنے جا رہا ہو۔ ایسا کا حیران چہرہ اسکی آنکھوں کی نمی اسکے ذہن میں گھومنے لگی اور وہ ایکسائیٹڈ سا ہوتا گاڑی سے اتر کر تیزی سے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ لکڑی کا منقش دروازہ بند تھا۔ ابھی اس نے اطلاعی گھنٹی پر انگلی نہ رکھی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک سات آٹھ سالہ بہت پیارا سا بچہ باہر نکلا جس کے سر کے بال بہت ریشمی چمکیلے اور سیاہ تھے اور ماتھے پر گر رہے تھے۔ وہ ایک چھریرے بدن کا پھرتیلا سا بچہ تھا۔ اسنے پوری گردن اٹھا کر ولید کی طرف دیکھا۔ پھر اسکی آنکھیں چمکنے لگیں۔

بابا۔۔۔ وہ اپنی باریک سی آواز میں چلایا۔ ولید بے اختیار گھٹنوں کے بل اسکے

سامنے بیٹھا۔

تم میرے بیٹے ہونا۔ اسنے بے یقینی کے عالم میں اس سے پوچھا جو ہو بہو اسکا عکس تھا۔ اسنے چمکتی سیاہ آنکھوں کے ساتھ سر زور زور سے ہلایا۔

جی ولی بھیا یہ آپکا ہی بیٹا ہے۔ عقب سے روحینہ نے کہا تھا۔ ولید نے بے اختیار اپنے بیٹے کو چھوا۔ وہ ہو بہو اسکے جیسا تھا۔

زین۔۔ وہ بے آواز بولا۔ ابیہا کو تو یہی نام پسند تھا۔

میرا نام دانیال ہے بابا مگر ماما پیار سے دانی کہتی ہیں۔ وہ اسکے ہونٹوں کی بے آواز جنبش کو بھی سمجھ گیا تھا۔

دانیال۔ ولید نے بے یقینی سے دہرایا۔ ابیہا نے اسکے پسندیدہ نام کو یاد رکھا تھا۔ اسنے بے اختیار اپنے بیٹے کو سینے سے بھینچ لیا۔ اسکی آنکھیں چھلک اٹھی تھیں۔

میرا بچہ۔۔ اسکے لبوں سے بس یہی الفاظ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

بابا! میں روز آپکی پکچر دیکھتا تھا۔ وہ باپ کی والہانہ محبت سے سرشار سا اسے بتا رہا تھا۔ ولید نے اسکا چہرہ چوم لیا۔

ماما آپکو بہت یاد کرتی ہیں بابا۔ اسنے بتایا۔

میں نے بھی تم دونوں کو بہت بہت یاد کیا بیٹا۔ تمہاری ماما کہاں ہیں۔ وہ اسے گود میں لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

ماما اندر ہیں آپکا ویٹ کر رہی ہیں۔ ماما ماما۔ ولید اسے لیے اندر داخل ہوا۔
دانیال زور زور سے اپنی ماں کو بلا رہا تھا۔ عقب میں شکیلہ بیگم سکندر اور
روحینہ بھی تھے۔

کیا بات ہے دانی ایک مترنم سی آواز کیساتھ ہی سامنے والے کمرے سے ایک
معطر وجود باہر نکلا تھا۔ ولید کے قدم بے اختیار ہی تھمے۔

ماما دیکھیں بابا آگئے۔ دانیال نے ایکسائٹمنٹ سے پر لہجے میں بتایا تھا۔ سامنے
کھڑی عورت کے چہرے پر اک عجب سا تلاطم ابھرا تھا۔ اسکے قدم تھم چکے
تھے۔ اور تھم تو ولید بھی گیا تھا۔ اسکی بے حرکت آنکھیں سامنے کھڑے وجود
پر جمی تھیں۔ اور چہرے پر حیرت اور شاک کے ملے جلے تاثرات تھے۔



سارا دن فاطمہ آنکسی سے لیٹی رہی۔ اسکے سر میں شدت کا درد تھا۔ باپو کے
جانے کا غم ولید کے جانے کا غم اپنا پیارا گاؤں چھوٹ جانے کا غم خود پر بیتے
ظلم کا غم۔۔ نجانے ہی کتنے دکھ تھے جو اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور وہ چپکے چپکے
آنسو بہا رہی تھی۔ آسیہ خاتون نے بھی اسے نہ چھیڑا وہ جانتی تھی کہ اسکے
دکھوں کا مداوا کوئی نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اسکے آنسوؤں کا بھرم رکھنے کی
خاطر اسے مکمل تنہائی فراہم کر دی تھی۔ شام کے سایے پھیلنے لگے تو وہ اٹھ کر
کمرے سے باہر نکلی۔ آسیہ خاتون صحن میں ایک جانب لگے ہینڈ پمپ سے پانی

نکال کر وضو کر رہی تھیں۔ وہ بھی وہیں چلی آئی۔

نماز پڑھنے لگی ہیں۔ اسنے ان سے پوچھا۔

ہاں بیٹا۔ تم بھی وضو کر لو۔ انکا اردو کا لہجہ بالکل صاف نہ تھا مگر مافی الضمیر سمجھا لیتی تھیں۔ فاطمہ نے آستینیں چڑھائیں چادر کو سر کی پشت پر منڈھ لیا اور جھک کر وضو کرنے لگی۔ آسیہ خاتون نے اپنی چادر کو سر کے گرد اچھی طرح لپیٹا اور کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ فاطمہ پھرتی سے وضو کر کے چادر سر کے گرد لپیٹتی کمرے میں آئی جہاں آسیہ خاتون جاء نماز بچھائے نیت باندھنے لگی تھیں۔

مجھے بھی نماز پڑھا دیں۔ اسنے جلدی سے کہا۔ تو آسیہ خاتون نے سر ہلا کر اسے اپنے برابر کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ فاطمہ انکے برابر آکھڑی ہوئی۔ آسیہ خاتون قدرے بلند آواز میں نیت باندھنے لگیں۔ فاطمہ انکی تقلید کرنے لگی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد انہوں نے اسکو کچھ دعائیں پڑھائیں۔ اور پھر جاء نماز سمیٹ کر وہ دونوں باورچی خانے میں چلی آئیں۔ نماز نے فاطمہ کے اعصاب پر خاصا اچھا اثر ڈالا تھا۔ اور وہ خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی تھی۔

کل سے میں تمہیں قرآن پڑھانا شروع کرونگی۔ آسیہ خاتون نے کہا۔

یہ ٹھیک ہے۔ اسنے خوشی خوشی سر ہلادیا۔ اور مجھے نماز بھی یاد کروائیں گی ناں۔

وہ تو تم روز میرے ساتھ پانچوں نمازیں پڑھوگی تو تمہیں خود ہی یاد ہو جائے

گی بیٹا۔ قرآن کی سورتیں بہت آسانی سے یاد ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے چولہے میں لکڑیاں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ فاطمہ بھی انکی مدد کرنے لگی۔

حیدر پتہ نہیں کب آئے گا۔ کچھ لمحوں بعد آسیہ خاتون نے کہا تبھی بیرونی دروازے پر دستک ہونے لگی۔

جا بیٹا جا کر دروازہ کھولنا حیدر آیا ہے۔ انہوں نے مصروف سے انداز میں کہا تھا وہ اپنے بیٹے کی دستک پہچانتی تھیں۔ فاطمہ جھجھکتی ہوئی باورچی خانے سے باہر نکلی اور آنگن پار کر کے لکڑی کے بوسیدہ سے دروازے کے سامنے آن رکی۔

کون ہے۔ اسنے اپنی تسلی کی خاطر بلند آواز میں دریافت کیا تھا۔
حیدر۔ باہر سے جواب ملا تو اسنے کنڈی کھول دی۔ حیدر اندر داخل ہوا وہ دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔

السلام علیکم! وہ بلند آواز میں سلام کرتا دروازہ بند کرنے کو پلٹا تو فاطمہ پہ نظر پڑ گئی۔ ملگجے سے اندھیرے میں وہ سیاہ چادر میں لپیٹی کھڑی تھی۔

کیسی ہیں آپ۔ اسنے دروازہ بند کرتے ہوئے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

ٹھیک ہوں۔ اسنے جواب دیا۔

اماں کدھر ہیں۔

رسوئی میں۔ اسنے جواب دیا تو وہ باورچی خانے کی طرف بڑھا۔

سنیں۔ اسنے بے اختیار اسے پکارا وہ رک کر پلٹا۔

جی۔

ادھارک۔۔ اپنے دیش چلا گیا۔ اسنے دل میں کب سے ابھرتے خیال کو زبان دی۔

جی چلا گیا ہے۔ ویسے اسکا نام تو ولید ہے آپ اسے ادھارک کیوں کہتی ہیں۔
حیدر نے یونہی پوچھ لیا۔

وہ میری جنگی میں ادھارک ہی بن کر آیا تھا۔ فاطمہ نے اختصار سے جواب دیا۔ حیدر نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

واقعی وہ بہت اچھا انسان ہے۔ اسنے فاطمہ کے خیال کی تائید کی پھر باورچی خانے کہ طرف چلا گیا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی پھر کمرے کی طرف چلی گئی۔ اسکا دل مطمئن ہو گیا تھا یہ سن کر کہ ولید اپنے وطن واپس چلا گیا ہے۔



بیا۔۔ اسکے ہونٹ بے آواز ہلے اسنے بے اختیار ہی دانیال کو گود سے اتار دیا۔
وہ دوڑتا ہوا اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔

اما آپ بلا سے تو مل لیں ہر وقت تو انکو یاد کر کے روتی تھیں وہ اپنی ماں کا ہاتھ کھینچ کھینچ کر کہہ رہا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ولید پلکیں

جھپکائے بغیر اسکی طرف دیکھا رہا تھا یلخت وہ شکلیہ بیگم کی طرف مڑا۔
 می۔۔ ابیہا کدھر ہے؟ اسکی آواز میں صدیوں کی پیاس تھی۔ شکلیہ بیگم کے
 چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ابھرے۔

می ابیہا کدھر ہے۔ اسنے ایک ایک لفظ ہر زور دے کر اپنا سوال دہرایا۔ شکلیہ
 بیگم کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ روحینہ رخ پھیر کر منظر سے ہٹنے لگی مگر ولید نے
 جھپٹ کر اسکی کلائی تھام لی۔

مجھے بتاؤ روحی۔۔ ابیہا کدھر ہے۔ اسنے ضبط کی کڑی منزلیں طے کرتے ہوئے
 اس سے دریافت کیا تھا۔ روحینہ نے نظریں چرائیں۔
 ابیہا۔۔۔ وہ منہ اوپر کر کے چلایا کہ شاید کہیں وہ اوپری منزل سے نیچے اتر
 آئے۔۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا تھا۔

ابیہا۔۔۔ وہ پاگلوں کی طرح چلایا۔ روحینہ اضطراری انداز میں آگے بڑھی۔
 بھیا پلیز کام ڈاؤن۔ ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ دانی کے سامنے سین کری
 ایٹ مت کریں پلیز۔ اسنے ولید کا بازو تھام کر منت آمیز لہجے میں کہا۔ ولید
 نے ضبط کی کڑی منزلیں طے کرتے ہوئے حاضرین پر اک نگاہ ڈالی۔ دانیال
 اپنی ماں کی ٹانگوں سے لپٹا سہا سا کھڑا تھا۔ اسنے اس عورت کے چہرے پر نگاہ
 ڈالی جہاں کرب الم دکھ کیا کیا نہ تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ
 بھرتا ہال کمرے میں چلا گیا۔ روحینہ نے ماں کی طرف دیکھا وہ نظریں چرا

گئیں۔

دانی کو کمرے میں لے جاؤ۔ سکندر نے دانیال کی ماں کو حکم دیا وہ کسی روبروٹ کی طرح دانیال ہاتھ پکڑے وہاں سے چلی گئی تھی۔

ممی بھیا کو بتانا تو ہوگا ہی۔ روحینہ نے ماں سے کہا۔

مجھ میں تو ہمت نہیں ہے وہ تکلیف دہ وقت یاد کرنے کی۔ شکیلہ بیگم نے دکھ سے کہا۔

ممی آپ تو ہمت مت ہاریں۔ سکندر بولا۔

میرا بچہ اتنے سالوں بعد گھر آیا ہے میں کیسے اسے یہ خبر دے دوں کہ جس آئیڈیل فیملی کا تصور اسکی آنکھوں میں سجا تھا وہ ایک سراب تھا اور بس۔ شکیلہ بیگم دبی دبی آواز میں دکھ سے پر لہجے میں بولیں۔

مگر ممی اس سب میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں ہے ناں۔ سکندر نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔

مگر وہ ہمیں ہی بلیم کرے گا میں جانتی ہوں۔ وہ اپنے بیٹے کو اچھی طرح سمجھتی تھیں۔

ممی ولی بھیا اتنے بھی بے عقل نہیں ہیں۔ آپ چلیے اور سب حقائق انکے سامنے رکھ دیں بس۔ روحینہ نے ماں کو ہمت دلائی۔ وہ تینوں جھجھکتے ہوئے

بڑے کمرے میں داخل ہوئے جہاں ولید سامنے والی گلاس ونڈو کے پاس کھڑا تھا آہٹ پر پلٹا۔ اسکی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

بیا مرگئی ہے ناں روحی۔ اسنے رندھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ تینوں دھک سے رہ گئے۔

کاش مرجاتی وہ۔ شکیلہ بیگم بولیں۔

کیا مطلب۔۔ کیا وہ زندہ ہے۔۔ کہاں ہے وہ۔ می پلینز مجھے بتائیں۔ میں نے اتنے سال اسکی یاد میں تڑپ تڑپ کر گزارے ہیں۔ وہ آج بھی تڑپ ہی تو رہا تھا۔ روحینہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

جس کے لیے آپ تڑپتے رہے ولی کاش وہ بھی آپ کے لیے اسی طرح تڑپتی۔ شکیلہ بیگم نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

می پلینز پہلیاں مت بھجوائیں۔ مجھے بتائیں کہاں ہے بیا۔ وہ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے عین انکے سامنے آن رکا تھا۔

تم پہلے خود میں ہمت پیدا کرو ولید کیونکہ جو خبر ہم تمہیں سنانے جارہے ہیں وہ خوش آئند نہیں ہے۔ سکندر نے غیر جذباتی انداز میں کہا تھا ولید کے چہرے پر اک ہیجان برپا تھا۔

پلینز مجھے بتائیں میری بیا کہاں ہے۔ میرے صبر کا اتنا امتحان نہ لیں می پلینز

کوئی مجھے بتادو بیا کدھر ہے وہ تو میرے بغیر اک لمحہ نہیں گزار سکتی تھی اب میرے آنے کی خبر سن کر وہ کہاں جا چھپی ہے۔ وہ منت کر رہا تھا۔

بھاگ گئی ہے آپکی بیا۔ جاچکی ہے اس گھر سے آج نہیں سات سال پہلے۔
شکیلہ بیگم یکدم چلا اٹھی تھیں ولید بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹا۔ تبھی پردہ ہٹا کر وہ عورت کمرے میں داخل ہوئی جس کو دانیال ماں کہتا تھا۔
نہیں۔۔ ولید نے بے یقینی سے کہا۔

یہی سچ ہے جو ہم آپکو نہیں بتا رہے تھے ولید۔ ابیہا سات سال قبل دانیال کی پیدائش کے فوراً بعد ہی اسے ہسپتال میں چھوڑ کر چلی گئی تھی وہ کہاں گئی ہم نہیں جانتے مگر ہم نے اسے بہت تلاش کیا وہ نہ ملیں۔ ہمیں بعد میں علم ہوا کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ اپنے سب زیورات اور نقدی بھی ساتھ لے گئی تھی۔ شکیلہ بیگم سچ کا آئینہ اسکے سامنے رکھ رہی تھیں۔ اور ولید حسن کے دل میں شدت سے یہ امنگ جاگی تھی کہ وہ سات سال قبل برف کے اس طوفان میں ہی مر گیا ہوتا۔

میں نہیں مانتا ممی۔ بیا ایسی نہیں ہے۔ اسنے نفی میں سر ہلایا۔

ہاں آپکی ماں جھوٹی بہن بھائی جھوٹے بس ایک آپکی بیا سچی

آپ لوگ جھوٹے نہیں ہیں مگر ہو سکتا ہے آپ سب کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ ابیہا ایسی نہیں ہے وہ بہت ڈرتی ہے دنیا سے ممی وہ اکیلی کوئی فیصلہ نہیں

کر سکتی۔ میں اسے جانتا ہوں وہ پر یقین لہجے میں کہہ رہا تھا۔



جذباتی ہونے سے حقیقت تبدیل نہیں ہو جائے گی۔ تمہاری بیوی بدکردار تھی اسی لیے تمہاری شہادت کی خبر سنتے ہی زنجیریں تڑوا کر نکل بھاگی۔ تمہاری بیوہ بن کر رہنے میں اسکا کوئی فائدہ نہ تھا اسلیے اس نے فرار کا راستہ اختیار کر لیا۔ سکندر نے خشک لہجے میں کہا تھا۔ ولید نے بے یقینی سے بھائی کے چہرے کی جانب دیکھا۔

بیا ایسی نہیں ہے سکندر بھائی میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایسا قدم اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ سب کو کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ولید اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔

ہمیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ سات سالوں سے ہم غلط فہمی میں جی رہے ہیں۔ ڈونٹ بی سلی ولید۔ ہم وہ ہیں جن کے پاس اپنا چند گھنٹوں کا بچہ چھوڑ کر وہ بھاگ گئی تھی۔ تب اس لیلیٰ نے تمہارا بچہ گود میں لیا اور اسے اپنی اولاد کی طرح پالا۔ تم ہماری قربانیوں سے بھری زندگی کو غلط فہمی کیسے قرار دے سکتے ہو۔ شکیلہ بیگم جیسے پھٹ پڑی تھیں۔ دروازے کے پاس کھڑی لیلیٰ کی پلکوں پر نمی اترنے لگی۔ ولید نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔

لیلیٰ نے کیوں پالا دانیال کو۔ آپ سب تھے ناں پھر اس کی زندگی کو کیوں

محدود کیا۔ اسنے شکیلہ بیگم سے پوچھا۔

یہ میرا اپنا فیصلہ تھا ولید۔ سات سال قبل ابیہا کے جانے کے بعد سب سے پہلے دانیال کو میں نے گود میں لیا تھا اور تبھی میرے دل نے کہا تھا کہ یہ میرا بچہ ہے اسکو میں ہی پالوں گی۔ لیلیٰ آگے بڑھی اسکی سنہری آنکھوں میں گزرے سالوں نے سنجیدگی کو جیسے رقم کر دیا تھا۔ ولید کچھ نہ بولا۔

ممی مجھے بیا کو تلاش کرنا ہے۔ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ میں اس سے بات کرنے کے بعد ہی کرونگا۔ اسنے کچھ دیر بعد فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

سات سال بیت چکے ہیں بھیا اگر اسنے واپس آنا ہوتا تو آپچی ہوتی۔ روحینہ تھکے تھکے لہجے میں بولی تھی ولید نے شدومد سے نفی میں سر ہلایا۔

میری بیوی ایسی نہیں ہے۔ وہ ضرور کسی مشکل میں پھنس گئی ہوگی۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ اسنے پختہ لہجے میں کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے چلا گیا۔ اسکے جاتے ہی شکیلہ بیگم سر پکڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

اچھا ممی میں چلتا ہوں۔ کل آؤنگا۔ سکندر نے جانے کے لیے پر تولے۔ کئی سال گزرے وہ اس گھر سے شفٹ ہو چکا تھا۔

ہاں ہاں چلے جاؤ۔ سب چلے جاؤ ماں کو چھوڑ کر۔ ماں کو زہر ہی دے دو۔ وہ سر اٹھا کر ہسٹریک انداز میں بولیں اور زور زور سے رونے لگیں۔ سکندر نے ناگواری سے ماں کی طرف دیکھا۔

ممی فار گاڈز سیک بلاوجہ میں ٹریجڈی کوئین مت بن جایا کریں۔ پورا خاندان تو آپکے پاس رہتا ہے میں شہزاد اور بچے بھی آتے جاتے رہتے ہیں اور اب تو ولید بھی واپس آگیا ہے پھر آپکو کیا مسئلہ ہے۔ کیوں بیکار میں سین کری ایٹ کرتی رہتی ہیں آپ۔ وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولتا گیا۔

بھیا پلیز کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ روحینہ نے ملاستی انداز میں کہا تھا۔

روحی پلیز۔ ممی کو عادت ہو چکی ہے ہر روز اس طرح کے میلو ڈراما کری ایٹ کرنے کی۔ خود کو سب سے بڑی مظلوم سمجھتی ہیں یہ۔ جبکہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ تلخ لہجے میں بولتا ہوا تیز تیز قدموں سے چلتا کمرے سے چلا گیا تھا۔ شکیلہ بیگم کے آنسو میں مزید تیزی آگئی تھی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ممی پلیز مت روئیں۔ روحینہ انکو پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

انکو رونے دو روحی۔ یہ اپنی رونے کی قسط پوری کر کے ہی دم لیں گی اب۔ لیلا نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا اور کمرے سے چلی گئی تھی۔ روحینہ کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ اسنے ایک نظر بری طرح بلکتی ہوئی ماں کی طرف دیکھا پھر گہری سانس بھر کر کمرے سے باہر آئی اور ولید کی تلاش میں اوپری منزل پر چلی آئی۔ ولید ٹیرس پر کھڑا تھا۔ وہ اسکے پاس چلی آئی۔

ولی بھیا۔ اسنے اسے پکارا۔

روحی میں نہیں مانتا۔ بیا ایسی نہیں ہے۔ وہ مدھم آواز میں بولا۔ ٹیرس پر اس

سمے ملگجا اندھیرا تھا۔ سامنے سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔
 بھیا میں تو خود بھی ادھر نہیں تھی تب۔ جب میں واپس آئی تو یہ قیامت گزر
 چکی تھی۔ روحینہ نے اسے بتایا۔

میری شہادت کی خبر سن کر تم پاکستان نہیں آئی تھیں روحی۔ ولید نے گردن
 موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔

مجھے دو دن بعد کی فلائیٹ ملی تھی بھیا۔ جبکہ بیا کی ڈیلیوری تو اسی روز رات کو
 ہوگئی تھی جس دن آپکی شہادت کی خبر آئی تھی۔

اسی روز۔۔ مگر تب تو۔۔ ولید الجھا۔
 قبل از وقت ڈیلیوری تھی یہ۔ می لوگ بتاتے ہیں کہ یہ نیوز سن کر بیا کی
 حالت بگڑ گئی تھی اسے ہسپتال لے جایا گیا جہاں اسنے دانیال کو جنم دیا۔ کچھ
 دیر کے لیے می سکندر بھیا کے ساتھ گھر آئی تھیں کچھ چیزیں لینے جب وہ
 واپس اسپتال پہنچیں تو بیا جاچکی تھی اور دانیال نرسری میں تھا۔ روحینہ نے
 تفصیل بتائی۔ ولید کی پیشانی پر شکنوں کا جال تھا۔

قبل از وقت بچے کی پیدائش کے بعد کیا اسکی کنڈیشن ایسی ہوگی روحی کہ وہ
 کہیں جاسکتی۔ اسنے روحی سے سوال کیا۔ روحینہ نے شانے اچکائے۔
 اللہ جانے ولی بھیا۔ میں نے تو آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا۔

روحی کیا تم بیا کو اتنی چالاک سمجھتی ہو۔ کیا تمہارا ذہن یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ بیا ایسی تھی۔

سچ پوچھیں تو یقین مجھے بھی نہیں آیا تھا مگر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا بھیا۔ مئی لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے بیا کو بہت تلاش کیا مگر یہ بات بھی میرے لیے بس سنی سنائی ہی ہے کیونکہ میں بس ایک ہفتہ ہی یہاں رک سکی تھی میری ساس کی طبیعت خراب تھی اس لیے جلد ہی واپس جانا پڑا تھا اور اسکے بعد میں بس ایکبار پاکستان آئی تھی اپنے بیٹے کی پیدائش کے بعد۔ تب میں دو ماہ یہیں رہی تھی۔ اور اسکے بعد میں اب آئی ہوں۔ روحینہ نے اسے بتایا۔ اور لیلیٰ نے دانیال کو کیوں پالا۔ وہ واپس کینیڈا کیوں نہیں گئی یہ بات مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔ دانیال کو مئی خود بھی پال سکتی تھیں جانے کیوں انہوں نے لیلیٰ کا سہارا لیا۔

لیلیٰ۔۔۔ ولید نے طویل ہنکارا بھرا۔ لیلیٰ اتنی بے غرض تو نہیں کہ بے غرض ہو کر اتنی بڑی قربانی دے۔ اتنا تو میں جانتا ہوں اسکو۔

پتہ نہیں ولی بھیا۔ مگر یہ بات تو سارا خاندان جانتا ہے کہ لیلیٰ نے کتنی محبت سے دانی کو پالا ہے۔ اسکے لیے اس نے خود کو سرتاپا مامتا بنالیا۔ میں خود لیلیٰ کو ایک نکچڑھی لڑکی سمجھتی تھی مگر اسکی اس عظیم قربانی نے مجھے بھی اس کا معتقد کر لیا ہے۔ روحینہ نے بلاتامل لیلیٰ کی خدمتوں کا اعتراف کیا تھا۔ ولید کے

چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ روحینہ کے دلائل سے قائل نہیں ہوا۔

خیر میں بیا کے امی ابو کے گھر جا رہا ہوں

مگر وہ لوگ تو اب ادھر نہیں رہتے۔

کہیں اور شفٹ ہو گئے ہیں۔۔ ایڈریس بتادو میں چلا جاؤنگا۔

ارے وہ پاکستان سے باہر جا چکے ہیں۔

پاکستان سے باہر۔۔۔ مگر کیوں۔۔ آئی مین کب۔ ولید کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔

آپکے سیاحن جانے کے چند ہی دنوں بعد عامر دوہی چلا گیا تھا اور ایہا کے اس اقدام کے بعد بدنامی کے خوف سے اسنے اپنے امی ابو اور دادی کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ نیہا بھی کافی عرصہ ہوا اپنے شوہر کیساتھ قطر سیٹل ہو چکی ہے۔ اسنے تفصیل بتائی تو ولید کی پیشانی پر شکنوں کا جال بچھ گیا۔

ایسے کیسے سب ہی باہر چلے گئے۔ کیا ایہا کے والدین نے بھی اسے تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ کیا انہوں نے بھی سنی سنائی پر یوں آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ وہ جذباتی انداز میں بولا۔

میرے سامنے تو بس ایک ہی بار ایہا کے والدین یہاں آئے تھے نیہا بھی انکے ہمراہ تھی۔ نیہا نے ہی ہمیں بتایا تھا کہ ایہا شادی سے پہلے کسی اکبر نامی لڑکے

کو پسند کرتی تھی اور شادی کے بعد بھی اکثر اسی کو یاد کیا کرتی تھی۔ ہم تو غیر ہیں ایسا کے تو اپنے پیرنٹس نے یقین کر لیا تھا ایسا کی بدکرداری کا۔

روحینہ انکشاف پہ انکشاف کر رہی تھی اور ولید کا ذہن الجھتا ہی چلا جا رہا تھا وہ یکدم پلٹا اور تیز تیز قدموں سے چلتا اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ یہ کمرہ آج سات سال بعد کھولا گیا تھا۔ ولید کے بعد اس پہ تالا رہتا تھا شکلیہ بیگم اس کمرے کی صفائی بھی اپنی نگرانی میں ہی کروا کر کمرہ پھر سے مقفل کر دیا کرتی تھیں۔ آج ولید کی آمد کے موقع پر اس کمرے کو کھولا گیا تھا۔ ولید نے لائٹ روشن کی۔ کمرہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ وہی فرنیچر پردے کا پٹ۔۔۔ بس ایک کمی تھی۔۔۔ دیواروں پر لگے اسکے اور ایسا کی شای کے فوٹو فریمز اور ایسا کا مہکتا وجود۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا عین مسہری کے سرہانے آن رکا۔ اسکی یادداشت کے پردے پر ماضی کے کچھ چمکیلے منظر گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ وہ انکی شادی کا دن۔۔۔ سارا کمرہ سرخ گلابوں کی مہک سے بھرا ہوا تھا مسہری تازہ گلابوں سے سبھی تھی اور اس کے بچوں بیچ سسٹی مسٹائی سی بیٹھی ایسا۔۔۔ سرخ لہنگے میں روایتی دلہن بنی وہ کیسے اس کے دل میں اتر رہی تھی۔ ولید نے سر جھٹکا۔ یادوں کا فسوں ٹوٹا تھا۔ وہ تھکے ہارے انداز میں مسہری پر گر سا گیا۔

اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں سچ مچ تم سے پہلے مر جاؤں۔

تو مرنے سے قبل مجھے بھی گولی مار دیجئے گا۔

صرف چار ماہ ہوئے ہیں ہماری شادی کو اور آپ مرنے کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ یہ، سراسر ظلم ہے۔۔

وہ تو اسکی موت کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی وہ کیسے اتنی سازشی ہو سکتی تھی۔ ولید کے لیے یقین کرنا ناممکن تھا۔ وہ کوئی غیر نہیں اسکی بیوی تھی۔ اسکی خلوتوں کی ساتھی۔۔ وہ جو نظر ملا کر اس سے بات کرتے ہوئے بھی گھبراتی تھی وہ ایسی بے جھجک کیسے ہو سکتی تھی۔ ولید کو آج بھی وہ دن یاد تھے جب شادی سے قبل ایسا اور اسکا سامنا ہوتا تھا وہ کتنا جھجھکتی تھی۔۔ گھبراتی تھی۔۔ وہ تو شادی کے بعد بھی اس کا قرب پا کر چھوئی موئی سی ہو جایا کرتی تھی۔ ولید نے اسکی آنکھوں میں ہمیشہ حیا کی داستان رقم دیکھی تھی وہ کیسے مان لیتا کہ وہ لڑکی جس کو اس نے اسکی حیا کی بنیاد پر اپنی شریک سفر کے لیے منتخب کیا تھا وہ ایسی بے جھجک اور منافق ہو سکتی تھی۔ وہ اس بات پر کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اسکی ایسا بے وفا تھی۔



فاطمہ نے آنگن میں جھاڑو لگا کر پانی کا چھڑکاؤ کیا تاکہ گرد بیٹھ جائے اور مرغیوں کا ڈربہ کھول دیا۔ رنگ برنگی مرغیاں اپنے پیلے پیلے چوزوں کیساتھ باہر نکل کر آنگن میں واک کرنے لگیں۔ آج صبح سے آسیہ خاتون کی طبیعت کچھ اچھی نہ تھی سردی بڑھتے ہی انکو فلو نے آگھیرا تھا ساری رات وہ سر درد کے باعث سو نہ سکی تھیں صبح کے قریب آکر انکی آنکھ لگی تھی اسلیے فاطمہ

نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا تھا۔ حیدر ابھی سو کر نہ اٹھا تھا۔ چھت پر بنے واحد کمرہ اسی کا تھا۔ فاطمہ نے یونہی گردن اٹھا کر اوپر کی جانب دیکھا۔ آسمان پر بادل اکٹھا ہو رہے تھے۔ اسکی نظریں بھٹکتی ہوئیں کچے بنیرے کے اس پار بنے کمرے تک گئیں تبھی لکڑی کا بوسیدہ دروازہ کھلا اور حیدر برآمد ہوا۔ اسکے جسم پر سیاہ پرانی سی ٹی شرٹ اور سرمئی رنگ کا گرم ٹراؤزر تھا۔ اسنے بھی فاطمہ کو دیکھ لیا تھا تبھی ایک ہلکی سی مسکان نے اسکے بھرے بھرے ہونٹوں کا احاطہ کر لیا۔ فاطمہ نے ایک دم اپنے نظروں کا زاویہ تبدیل کیا اور سر جھکائے تیز تیز چلتی باورچی خانے میں چلی آئی۔ لکڑیاں جلا کر اسنے ہاتھ دھوئے۔ آٹا گوندھا پڑا تھا اسنے چولہے پر توا رکھا اور پراٹھے کا پیڑہ بنانے لگی۔ تبھی باورچی خانے کے دروازے پر آہٹ ہوئی تو وہ بے طرح چونکی۔ حیدر بہت عجلت میں اندر داخل ہوا اور پھر فاطمہ کو چولہے کے سامنے بیٹھے دیکھ کر اسکے قدموں کو بے اختیار بریک لگے تھے۔ وہ کچھ نادام سا دکھائی دینے لگا تھا۔

اماں کدھر ہیں؟ اس نے استفسار کیا

سورہی ہیں۔ انکی طبیعت اچھی نہیں۔ فاطمہ نے لیئے دیئے انداز میں جواب دیا۔ اچھا۔ ناشتہ مل سکتا ہے۔ حیدر نے جھجھکتے ہوئے پوچھا۔

جی بنادیتی ہوں۔ کیا کھاتے ہیں آپ؟ فاطمہ نے پراٹھا توے پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

جو آپ بنا رہی ہیں۔ وہ سر ہلا کر بہت تابعداری سے بولا تھا۔ فاطمہ نے پراٹھے کے کناروں کو گھی سے تر کرتے ہوئے ذرا کی ذرا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسی آدھی آستینوں والی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا جس میں اسکا کسرتی جسم نمایا ہو رہا تھا بھورے بال بے ترتیبی سے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے اسکی داڑھی بھی کچھ بے مرمت سی تھی۔

کیا ہوا کیا میرا ایک پراٹھا پکانا آپکی طبیعت ہر گراں گزر رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو کوئی بات نہیں میں اپنا ناشتہ خود بنا لوں گا۔ وہ اسکے چہرے کے عجیب سے تاثرات سے یہی سمجھا تھا کہ شاید وہ اسکے لیے ناشتہ نہیں بنانا چاہتی سو جلدی سے وضاحتی انداز اختیار کر لیا۔

ایسا تو نہیں کہا میں نے۔ وہ سر جھٹک کر پراٹھے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ تبھی باہر سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھنے لگی۔ حیدر نے آنگن میں جھانکا آسمان سے موٹی موٹی بوندیں برسنے لگی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا تو فاطمہ نے جھرجھری سی لی۔ حیدر نے کواڑ بھینٹ دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر باہر جھانکنے لگا۔ بارش بہت تیز تھی۔ فاطمہ کو اسکی موجودگی سے الجھن ہونے لگی۔

آپ پراٹھا کیسے کھائیں گے؟ اسنے ایک بے تکا سوال پوچھا تھا۔

ہاتھ اور منہ سے۔ سنجیدہ سا جواب آیا تھا۔

میرا مطلب ہے چائے بناؤں؟ فاطمہ نے جلدی سے سنبھالا لیا۔

جی اگر بنالیں گی تو مہربانی ہوگی۔ وہ اب بہت توجہ سے اسکا جائزہ لے رہا تھا۔ فاطمہ نے توا چولہے سے اتارا اور چائے کا پانی رکھ دیا۔ بارش کی تیز بوندیں آنگن کے ایک جانب بنے اسٹور نما کمرے کی ٹین کی چھت پر برس کر جلت رنگ پیدا کر رہی تھی۔

آپ کچھ نہیں کھائیں گی کیا؟ حیدر نے دریافت کیا۔ فاطمہ کو یکدم یاد آیا کہ اسنے صرف ایک ہی پراٹھا بنایا تھا۔

آپ کھالیں پھر میں بھی کھالوں گی۔ اسنے دھیمی آواز میں جواب دیا۔
کیوں میری موجودگی میں کھانے پہ کوئی اعتراض ہے؟ وہ بحث کرنے لگا۔
ایسا نہیں ہے۔

پھر کیسا ہے؟

مجھے نہیں پتہ۔ وہ اکتا گئی۔ پانی ابلنے لگا تھا سو وہ اسمیں پتی اور چینی ڈالنے لگی۔ حیدر کچھ نہ بولا تھا چپ چاپ باورچی خانے سے نکل کر ماں کے پاس چلا گیا۔ فاطمہ نے سکھ کا سانس لیا اور چائے تیار کر کے کیتلی چولہے سے اتار کر رکھی۔ خود تو کچھ کھانے کا دل نہ کر رہا تھا سو ایک کپ میں چائے ڈال کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔ بارش ہنوز جاری تھی۔ دو ہی منٹ گزرے ہونگے کہ

حیدر کی دوبارہ آمد ہوئی۔

اماں کو تو بخار ہے۔ اسنے اندر آتے ہی اسے اطلاع دی۔

میں دیکھتی ہوں انہیں آپ ناشتہ کر لیں۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اسکا جواب سنے بغیر ہی باورچی خانے سے نکل کر آسیہ خاتون کے پاس چلی آئی۔ وہ کمبل سر تک تانے ہوئے تھیں۔

اماں۔ اسنے انکے سرہانے جا کر انہیں پکارا۔

ہوں۔ وہ کراہیں۔

ناشتہ کرو گی؟ اسنے پیار سے پوچھا۔

دل نہیں کر رہا۔

کچھ تو کھا لو ناں۔

چائے دیدے بس۔ آسیہ خاتون نے منہ سے کمبل ہٹا کر جواب دیا تو فاطمہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا کہ ہی انہیں تھما دیا۔

حیدر نے ناشتہ کر لیا

جی بنا دیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔

تمہارا شکریہ بیٹا۔ میری طبیعت تو ایسی ہی چلتی ہے اور حیدر کو خود ہی کھانے

بنانے پڑتے ہیں۔

اسمیں شکرے کی کوئی بات نہیں اماں تم لوگوں نے مجھے پناہ دی ہے مجھ پر احسان کیا ہے تو کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتی تم دونوں کے لیے۔ وہ احسانمند تھی۔

نہیں بیٹا ہم نے کوئی احسان نہیں کیا۔ تم میری بیٹی ہو۔ مجھ دکھاری ماں کی آنکھوں کو سالوں بعد بیٹی کی صورت دیکھنے کو ملی ہے۔ وہ نم آنکھوں کیساتھ بولیں۔

تم دکھی مت ہوا کرو اماں۔ اسنے پیار سے انکا سر سہلایا تو وہ بمشکل مسکرا دیں۔ میں باورچی خانہ سمیٹ کر آتی ہوں۔ وہ کہہ کر پلٹی اور کمرے سے باہر نکلی۔ بارش کی رفتار میں اب کمی آگئی تھی مگر سرد ہواؤں کے تھپڑے جوں کے توں تھے۔ اسنے ایک جھر جھری سی لی اور اپنی سیاہ چادر کو پیشانی تک کھینچتے ہوئے باورچی خانے میں آئی۔ حیدر ناشتہ کر کے شاید اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ وہ چولہے کے قریب پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ چنگیر میں رکھے روماں میں کچھ لپٹا ہوا تھا اسنے اسے کھولا تو اسمیں ادھ کھایا پراٹھا رکھا تھا۔ اسکی نظریں بھٹکتی ہوئیں کیتلی تک گئیں اسکے پاس پڑے کپ میں آدھی چائے بھی پڑی تھی۔ فاطمہ کی آنکھیں بے اختیار دھندلائی تھیں۔ اسے کوئی شدت سے یاد آیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ مرد ولید حسن تھا جس نے اسے اپنے کھانے میں شریک

کیا تھا اور اب حیدر۔۔۔ دونوں میں ایک قدر مشترک تھی۔ اور وہ تھا دونوں کا دین۔۔۔ اسلام۔۔۔ یہ مسلمان مرد چاہے کسی بھی خطے رہنے والے ہوں انکے اقدار اور غیرت کے اصول کتنے ملتے جلتے ہیں۔ یہ کتنے بھی برے ہوں مگر عورت کو عزت دینا انکی گھٹی میں شامل ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو عورت کی تکریم تو کرنا تو دنیا کو سکھایا ہی اسلام نے ہے۔

دو مرد یہ تھے جو اس کے کچھ نہ لگتے تھے مگر اسکو کیسا مان دیتے تھے اور ایک وہ مرد تھا جو اسکا ہونے والا شوہر تھا۔ مگر اسکی عزت کا لٹیرا بن گیا تھا۔

ادھ کھایا پراٹھا ہاتھ میں پکڑے وہ زار و قطار رو پڑی۔ باہر بارش پھر تیز ہو چکی تھی۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews



ولید نے ابیہا کے پرانے محلے میں جاکر کافی چھین بین کی تھی مگر کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوسکا تھا۔ روحینہ سے ملی گئی اطلاعات کے علاوہ کچھ بھی مزید معلوم نہ ہوسکا تھا۔ شادی کے فوراً بعد کیونکہ ولید کو ڈیوٹی جوائن کرنا تھی اسلیے وہ ولیمے کے تین دن بعد ہی لاہور روانہ ہو گئے تھے۔ ابیہا کے خاندان میں سے کسی کی بھی دعوت وہ قبول نہ کرسکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ ابیہا کے خاندان کو اتنا جانتا نہ تھا۔ اور اب وہ پچھتا رہا تھا۔ اگر سات سال قبل وہ

اسکے خاندان والوں سے کچھ ملنا جلنا رکھتا تو آج یوں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہ مار رہا تھا۔ دن بھر کی نخل خواری کے بعد وہ شام کے وقت گھر پہنچا تو وہاں ایک ہنگامے نے اسکا استقبال کیا تھا۔ علیشا اپنے میاں اور تین بچوں سمیت آئی ہوئی تھی۔ دانیال اور روحینہ کے دونوں بچے بھی وہیں موجود تھے اچھا خاصا طوفانِ بد تمیزی برپا تھا۔ وہ خصوصیت سے کسی کو بھی مخاطب کیے بناء سلام کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

بابا۔ عاشی پھپھو آئی ہیں۔ عقب سے دانیال نے اسے پکارا تھا۔ وہ بے اختیار ہی تھما۔

کیسے ہو ولی؟ علیشا نے بھی اسے پکارا تھا وہ پلٹا۔ علیشا سبز شلوار قمیض میں سفید گرم شال شانے پر ڈالے ہلکے ہلکے میک اپ میں کافی سوبر لگ رہی تھی۔ گزرے سالوں نے اسکو حسن پر کوئی اثر نہ چھوڑا تھا۔

ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟ وہ سنجیدگی سے بولا۔

ٹھیک ہوں۔ وہ مسکرائی۔ ولید گہری سانس بھر کر آگے بڑھا اور اسکے شوہر سے مصافحہ کر کے کچھ فارمل جملوں کا تبادلہ کیا اور کرٹسی کے اظہار کی خاطر کچھ دیر کو وہیں ٹک گیا



اور سناؤ ولی واپس آکر کیسا فیل ہو رہا ہے؟ علیشا نے ولید سے پوچھا۔

سب کچھ بہت بدل گیا ہے۔ وہ بمشکل مسکرایا۔

ہاں واقعی تمہارے لیے تو سب کچھ ہی بدل گیا ہے۔ وہ معنی خیزی سے بولی۔
ولید نے کچھ فاصلے پر بیٹھی روحینہ کی طرف دیکھا جو اپنی بیٹی مریم کی کوئی
بات دھیان سے سن رہی تھی۔

آئی بتا رہی تھیں کہ تم ایسا کو تلاش کر رہے ہو۔ علیشا نجانے کیوں اسکی دکھتی
رگوں کو چھیڑنے کے موڈ میں تھی۔ ولید نے ایک سنجیدہ سی نگاہ علیشا پر ڈالی
اور پھر علی کیساتھ کھیتے دانیال کی طرف دیکھا۔

دانیال علی آپ لوگ آنسکریم کھانے چلو گے؟

یس۔۔ وہ دونوں اپنا کھیل چھوڑ چھاڑ کر خوشی سے اچھل پڑے تھے۔

ماموں میں بھی جاؤنگی۔ تین سالہ مریم بھی فوراً اچھلتی ہوئی اسکے پاس چلی آئی۔
ہاں ہاں کیوں نہیں ہماری پرنس بھی چلیں گی۔ ولید نے اسکے پھولے پھولے
گال چوم لیے۔ اور اسے گود میں لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ تبھی لیلیٰ کمرے میں داخل
ہوئی۔ سفید لمبے فرائ میں بالکل سنو وائٹ جیسی۔۔

ماما بابا ہمیں آنسکریم کھلانے لے کر جارہے ہیں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں
گی ناں؟ دانیال نے پر جوش ہوتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔ لیلیٰ سمیت سبھی
حاضرین کی سنجیدہ سی نظریں ولید کی جانب اٹھیں جو لا تعلقی سے مریم سے

لاڈ کرنے میں مصروف تھا۔

نہیں بیٹا تم لوگ جاؤ۔ لیلیٰ نے بہت سرد لہجے میں جواب دیا تھا۔

اما پلیز چلیں ناں بابا اما کو کہیں ناں ہمارے ساتھ چلیں۔ دانیال نے بے تکلفی سے ولید کا ہاتھ تھام کر اس سے التجا کی۔ وہ لمحہ ولید کے لیے آزمائش کا تھا۔ اس نے ایک نگاہ حاضرین پر دوڑائی اس سے وہاں موجود ایک اک نفس اس کے جواب کا منتظر تھا۔

بیٹا جن کا موڈ نہ ہو انکو ساتھ لیجانے پر اصرار نہیں کرتے۔ اس نے سنجیدہ سے لہجے میں دانیال کو جواب دیا۔

مگر مجھے تو اما کے بغیر مزہ نہیں آتا۔ اگر اما نہیں جائیں گی تو میں بھی نہیں جاؤنگا۔ وہ یکدم ماں کا بیٹا بن گیا تھا۔

بابا کیساتھ جاؤگے تو مزہ کیسے نہیں آئے گا بھئی۔

میں ہر جگہ اما کیساتھ جاتا ہوں آپ کیساتھ تو فرسٹ ٹائم کہیں جا رہا ہوں۔ وہ اکھڑا اکھڑا سا بولا۔ ولید کو یکدم احساس ہوا تھا۔ اس کے اور دانیال کے درمیان سات سالوں کی دوری حائل ہو گئی تھی۔ اسے ساری دنیا بے رنگ لگنے لگی۔

چلو تم بھی ہمارے ساتھ۔ اس نے دل پر پتھر رکھ کر لیلیٰ کو بھی ساتھ چلنے کی

دعوت دے ڈالی تھی۔

ہاں ماما پلینز چلیں ناں اب تو بابا نے بھی کہہ دیا۔ دانیال کے چہرے و لہجے میں تازگی دوڑ گئی تھی۔ لیلیٰ کے چہرے پر طمانیت کے آثار ابھرے اور وہ دانیال کی انگلی تھام کر پلٹ گئی۔ ولید نے گہری سانس بھری اور علیشا کے بچوں کو بھی ساتھ آنے کا کہہ کر باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

وہ بلیو ایریا کے ایک مشہور آنسکریم پارلر سے نکل کر گاڑی یکجانب بڑھے ولید نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی لیلیٰ برابر والی سیٹ پر آ بیٹھی۔ بچے غبارے خرید رہے تھے۔ ولید نے گردن موڑ کر لیلیٰ کی طرف دیکھا جو ملکجی سی روشنی میں بھی دمک رہی تھی۔

وہ معصوم بچہ تو تمہیں اپنی ماں سمجھ سکتا ہے مگر تم میری زندگی میں ایسا کی جگہ کبھی نہیں لے سکتی۔ اسکے لہجے میں ٹھنڈک تھی۔

میں ایسا کہ جگہ لینا بھی نہیں چاہتی وہ میرے نزدیک کل بھی کمتر تھی آج بھی اسکا اسٹیٹس وہی ہے۔ لیلیٰ کا لہجہ بھی بہت سرد تھا۔

لیلیٰ تم ساری دنیا کو اپنی بے غرضی کے ڈرامے سے متاثر کر سکتی ہو مگر مجھے نہیں۔ میں سات سال قبل کی وہ رات اب تک نہیں بھولا۔

بھولنا بھی مت کیونکہ وہ ایک حقیقت تھی۔ آج سات سال بھی میں اس رات کہی اپنی ایک بات پر قائم ہوں اور دیکھو قسمت نے مجھے موقع بھی دیا یہ

پرو کرنے کا کہ جو میں نے کہا تھا وہ حرف بہ حرف صحیح تھا۔ وہ گردن
 اکڑائے تفاخر سے بول رہی تھی۔ ولید جواباً کوئی سخت سا جملہ کہنے ہی والا تھا
 کہ بچے چلے آئے اور ہنستے مسکراتے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر ایک اک
 کر کے اندر بیٹھ گئے۔ ولید نے انگنیشن میں کنجی گھمائی ایکسلیٹر پر پاؤں کا دباؤ
 ڈالا اور گاڑی دوڑا دی۔ اسکے اندر ایک جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ بہت ریش
 ڈرائیونگ کر کے اس نے گاڑی گھر کے سامنے روکی اور کسی سے بھی مخاطب
 ہوئے بغیر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ لیلیٰ کی ڈھٹائی نے اسکے اندر جلتی آگ پر
 تیل کا کام کیا تھا۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسکے ہر قدم میں ایک اضطراب
 تھا۔ اسکا ذہن سات سال قبل پہنچ گیا تھا۔ وہ دن جب روحینہ کے ولیمے کے
 بعد وہ لوگ گھر پہنچے تھے۔ ایسا بہت تھک چکی تھی سو اسنے اسے دوا کھلا کر
 سونے کی ہدایت جاری کی اور تب تک اسکے سرہانے بیٹھا رہا جب تک وہ
 گہری نیند سو نہ گئی تھی۔ اسکے سونے کے بعد وہ اٹھ کر لائبریری میں آبیٹھا
 تھا۔ آنکھوں میں دور دور تک نیند نہ تھی اسلیے ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا۔
 سارے گھر میں سکوت کا راج تھا۔ سبھی تھک کر سوچکے تھے۔ گھڑی کی متواتر
 ٹک ٹک کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی۔ اسے کتاب پڑھتے ہوئے کافی دیر ہو چکی
 تھی جب لائبریری کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اسنے چونک کر گردن گھمائی۔
 دروازہ کھول کر لیلیٰ اندر داخل ہوئی تھی۔ سیاہ ریشمی شب خوابی کے لباس میں
 ہمیشہ سے کہیں زیادہ حسین اور ہوش ربا۔ اسکے سنہرے بال لچھوں کی

صورت میں اسکے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ولید بے اختیار ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

کیا ہوا؟ اسنے لیلا سے پوچھا۔

کچھ نہیں۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی سوچا کوئی کتاب ہی دیکھ لوں۔ اسنے نارمل سے لہجے میں جواب دیا اور قدم بائیں بازو والے ریک کی طرف بڑھا دیئے۔ ولید پھر سے اپنی نشست پر براجمان ہو گیا اور نظریں کتاب پر جمادیں۔

تمہاری ابیہا سے لو میرج ہے ناں؟ کتابیں الٹتے پلٹتے ہوئے اسنے سرسری سے لہجے میں اس سے پوچھا۔

ہاں۔ ولید نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔

لو کی کوئی خاص وجہ؟ وہ ایک کتاب ہاتھ میں لیئے اسکی طرف مڑی۔ ولید نے ایک نظر اسکی طرف دیکھا جو رات کے اس پہر شب خوابی کے سیاہ لبادے میں خطرناک حد تک خوبصورت لگ رہی تھی۔ لیکن صرف خوبصورت۔۔ حیا نام کی کوئی چیز نہ تھی اسمیں۔۔

حیا۔ ایک حرفی جواب دے کر وہ پھر سے کتاب کی جانب متوجہ ہو گیا۔

ویل۔۔ یہ تو بالکل بودی دلیل ہے۔ میرے نزدیک لائف پارٹنر میں تعلیم پیسہ گڈ لکس اور شاندار کیریئر یہ سب کاؤنٹ کرتا ہے۔ وہ کتاب ہاتھ میں پکڑے

اپنے انگریزی لب و لہجہ میں اپنا مطمع نظر واضح کر رہی تھی۔

ہر کسی کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ مجھے عورت میں جو واحد بات فیسی نیٹ کرتی ہے وہ حیا ہے۔ اسنے ہموار لہجے میں جواب دیا۔

تم کافی شاؤنسٹک ہو گئے ہو اور مجھے لگتا ہے کہ اسکی سب سے بڑی وجہ تمہاری مڈل کلاس ٹینٹ میں چھپی جاہل بیوی ہے۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے ایہا کی شخصیت کا پوسٹمارٹم کیا تھا۔ ولید کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

میرا خیال میں تم تہذیب کی حدود کو پھلانگ رہی ہو۔ اسنے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ لیلیٰ ہولے سے کھلکھلائی۔ اسکے ہنسی نے اس سکوت میں جیسے جلت رنگ بکھیر دی تھی۔

میں تکلفات کی قائل نہیں ہوں ولید اسلیے صاف بات کرونگی۔ وہ انگریزی میں گویا ہوئی۔ مجھے تم اپنے لائف پارٹنر کے طور پر بہت پسند ہو اور تمہاری بیوی سے ملنے کے بعد سے تو مجھے تمہاری حماقت پر افسوس ہونے لگا ہے۔ تم اتنے ہینڈسم ٹیلنٹڈ اور ویل ایجوکیٹڈ ہو یہ تمہارا مقام نہیں ہے کہ تم نوکری کرو اور ایک جاہل سی عورت کو اپنی بیوی کی حیثیت میں قبول کرلو۔ تمہارا لیول ان سب باتوں سے بہت اونچا ہے۔

ان سب باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ ولید نے سرد لہجے میں پوچھا۔

میرا مطلب بالکل واضح ہے ولید۔ وہ بولتے ہوئے اسکے قریب چلی آئی اور اسکی

کرسی کی پشت پر ہاتھ ٹیک کر آگے کو جھکی اسکے خوشبودار سنہرے بال ولید کے چہرے سے ٹکرائے تھے۔ ولید جیسے کرنٹ کھا کر کرسی سے اچھلا تھا۔ ایسا کو طلاق دو اینڈ میری می۔ میرے ساتھ کینیڈا چلو یہ گھٹیا سا ملک تمہارے لائق نہیں ہے۔ اسنے اطمینان سے اپنی بات مکمل کر دی تھی۔

شٹ اپ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنا گر سکتی ہو۔

اسمیں گرا ہوا ہونے کی کیا بات ہے۔ میں نے جو فیل کیا کہہ دیا۔ مجھے اپنی فیلنگز چھپانا نہیں آتی۔ آئی لائیک یو اور اپنی زندگی تمہارے ساتھ بتانا چاہتی ہوں دیٹس اٹ۔ اب تم ایسا کو طلاق دینے کا فیصلہ کرو اور میرے ساتھ کینیڈا چلو۔ وہ اسکے قریب چلی آئی تھی۔ اسکے چاندی جیسے ہاتھ ولید کے سینے پر رینگ رہے تھے۔ ولید کا ہاتھ اٹھا تھا اور لیلیٰ کے منہ پر پانچوں انگلیوں کے نشان ثبت ہو گئے تھے۔ وہ لڑکھڑا گئی۔

تم جیسی بے حیا عورت پر میں تھوکتا ہوں۔ دور رہو مجھ سے۔ وہ انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دیتا ہوا پلٹا۔

یہ بے حیا عورت تمہاری اس حیا دار بیوی سے کہیں بہتر ہے ولید حسن یہ بات تمہیں وقت بتائے گا۔ وہ عقب سے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی تو ولید نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ اسکے سفید روئی جیسے گال پر طمانچے کا لال نشان بہت واضح تھا۔

ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

ایسا ہی ہوگا ولید حسن۔ وقت تمہیں ایک دن اسی بے حیا عورت کے قدموں میں لیکر آئے گا اسنے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ ولید نے سر جھٹکا اور مڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے چلا گیا تھا۔ اسنے تہیہ کر لیا تھا کہ صبح ہی ممی سے اس موضوع پر کھل کے بات کرے گا۔ مگر اسے اس کا موقع نہ مل سکا تھا اگلے روز صبح ہی صبح اسکی جی ایچ کیو طلبی ہوئی تھی اسکے سیاچن پوسٹنگ کے آرڈرز آچکے تھے اور وہ چند ہی دنوں میں چلا گیا تھا۔ اسکے پیچھے سے کیا کیا ہوا وہ کچھ نہ جانتا تھا۔ سات سال نے اس سے اسکی ہر خوشی چھین لی تھی۔ ایک پرفیکٹ فیملی کا جو خواب اس نے دیکھا تھا وہ وقت کی دھول میں کہیں دب کر رہ گیا تھا۔ اسکی حیات کے دھاگے الجھ گئے تھے جن کو سلجھانے میں اسے جانے کتنا وقت لگ جانا تھا۔



سلمیٰ بہت بے چین تھی۔ مسز اسلم کو لگا وہ کراچی واپس جانا چاہتی ہے سو وہ اسے ساتھ لیے کراچی چلی آئیں اور اسے ایدھی ہوم بھجوا دیا تاکہ وہ کچھ دن اپنی پرانی ساتھیوں کے ساتھ بتالے۔ انہی دنوں سیڑھیوں سے گر کر سلمیٰ کی دائیں پنڈلی ٹوٹ گئی جس کے باعث وہ نقل و حرکت کے قابل نہ رہی لہذا اسکا پلاسٹر کھلنے تک مسز اسلم نے کراچی میں ہی رکنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ سلمیٰ کا فریکچر کافی سنجیدہ نوعیت کا تھا اور اسکا پلاسٹر تین ماہ بعد کھلنا تھا۔ مسز اسلم نے

زین کو بھی کراچی ہی بلوالیا اور اپنے فارم ہاؤس میں مستقلاً شفٹ ہو گئیں سلمیٰ بھی انکے ہمراہ تھی۔



ولید کو کہیں سے بھی ایہا کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو پارہا تھا۔ اوپر سے اس پر کام کا پریش بڑھنے لگا تھا۔ اس نے ڈیوٹی جوائن کر لی تھی اور اسکی جرات کے عملی مظاہرے کی بدولت اسکو ترقی دے کر میجر کا رینک عطا کر دیا گیا تھا۔ صدر مملکت نے اسکی خدمات کے عیوض اسے ہلال جرات سے بھی نوازا تھا۔ ولید تاحال پنڈی میں ہی تعینات تھا اور وہ جلد از جلد ایہا کا تلاش کر لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ریسورسز استعمال کر کے اپنی سی پوری کوشش کر رہا تھا مگر سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اسکے پاس ایہا کی کوئی تصویر بھی نہ تھی۔ گھر سے ایہا کی ایک اک تصویر یوں غائب ہو چکی تھی جیسے ایہا نامی لڑکی کبھی وہاں آئی ہی نہ تھی۔ ولید تلاش کر کر کے ہارا تھا مگر اس ایہا کی کوئی تصویر نہ ملی تھی۔ شکیلہ بیگم سے استفسار کیا تو جواب میں انکی لمبی سی جذباتی تقریر سننی پڑی تھی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ایہا جیسی بدکردار عورت کی تصویر بھی وہ اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتیں۔ ولید اب بالکل اندھیرے میں آن پھنسا تھا اسے اس بھری دنیا میں اپنا آپ بالکل تنہا لگتا تھا۔ انہی ویران شب و روز میں ایک دن وہ شام کے وقت ٹیرس پر کرسی پہ بیٹھا مغربی افق پر پھیلتی لالی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ آکاش کی وسعتوں میں طائرین کے غول کے غول اڑتے ہوئے

اپنے اپنے آشیانوں کو واپس جارہے تھے مطلع بالکل صاف تھا۔ دور دور نظر آتیں مارگلہ کی سرمئی پہاڑیاں سر اٹھائے آسمان کو تک رہی تھیں۔ ولید کی سیاہ آنکھیں آسمان کی وسعتوں پر مرکوز تھیں اور ڈوبتے سورج کی لالی کا عکس اسکی آنکھوں کو لہو رنگ کر رہا تھا۔

بابا۔ ایک ننھی سی معصوم پکار پر وہ بے طرح چونکا پھر گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ جو سیاہ کھلی سی پینٹ پر سرمئی سویٹر پہنے سر پر ہیٹ اور پیروں میں جاگرز پہنے بہت معصوم اور پیارا لگ رہا تھا۔ اسکی شکل بالکل ولید جیسی تھی۔ ولید نے بازو وا کر کے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ بلا جھجک اسکے پاس چلا آیا تھا۔ ولید نے اسکے دونوں ہاتھ تھامے۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کہاں تھے؟

پڑھ رہا تھا۔ اسنے اچھے بچوں کی طرح جواب دیا۔

ویری گڈ کس کلاس میں ہو تم؟

تھری میں۔

شاباش۔ کونسا سبجیکٹ فیورٹ ہے تمہارا؟

جیو گرافی۔ اسنے بلا تامل جواب دیا تھا۔ ولید کے دل کو دھکا سا لگا۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔

آپکو کونسا سبجیکٹ پسند ہے بابا؟

مجھے۔۔۔ مجھے بھی جیوگرافی پسند ہے۔ وہ مدھم سا مسکرایا تھا۔ دانیال نے ہونٹ بھینچ کر تھوک نگلا۔ ولید اسے تکتا رہ گیا تھا۔ اسکی یہ ادا بالکل ایسا جیسی تھی اور اسکے دائیں گال میں پڑتا گہرہ بھنور۔۔۔ وہ ایسا کا بیٹا تھا۔ اس جیسا کیسے نہ ہوتا۔ واؤ بابا۔ آپکی اور میری چوائس تو سیم سیم ہے۔ وہ پر جوش ہوا تھا۔ اسکی آنکھیں گہری سیاہ تھیں بالکل ولید جیسی۔

وہ اسلیے کیونکہ آپ میرے بیٹے ہو۔ وہ دل میں ابھرتے درد کو دباتے ہوئے اپنی کل کائنات کو تک رہا تھا۔
 میں تو ماما کا بھی بیٹا ہوں بٹ میری اور انکی تو کوئی بھی بات سیم نہیں ہے شکل بھی نہیں ملتی میری ان سے۔ وہ اوپری ہونٹ بھینچ بھینچ کر بولتا تھا اور جملے کے اختتام میں ہونٹ باہم پیوست کر کے تھوک نگلتا تھا۔ بالکل ایسا کی طرح۔ ولید نے بے اختیار اسے گال چوم لیے۔

مجھ سے تو ملتے ہو ناں آپ۔ میرے جیسا فیس میرے جیسی آنکھیں۔ وہ پر نم آنکھوں کیساتھ اسے تک رہا تھا۔

بابا آپ انڈیا میں مجھے مس کرتے تھے؟ دانیال نے معصومیت سے سوال کیا تھا۔ ولید کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

میں تو جیا ہی یادوں کے سہارے ہوں بیٹا۔ اسکی آواز کپکپا رہی تھی۔ دانیال نے اسکی گالوں پر بہتی نمی کو اپنی ننھی ننھی پوروں سے چھوا۔

میں بھی آپکو بہت مس کرتا تھا بابا۔ آئی لو یو۔ اسنے محبت سے باپ کا گال چوما تھا۔ ولید کے دل پر رکھا ضبط کا پتھر سرک کر دور جاگرا تھا۔ وہ اسکا بیٹا تھا اسکے اور ابیہا کی محبت کی نشانی۔ اسنے اپنے جگر گوشے کو سینے میں بھینچ لیا اور آنسوؤں کو بہہ جانے دیا تھا۔ وہ ابیہا کے وجود کا حصہ تھا۔ وہ اسکی خوشبو کو سانسوں میں اتار رہا تھا۔ پدرانہ شفقت نے اسکے پورے وجود کو اپنے احاطے میں لے لیا تھا۔ وہ اپنی اولاد کو سینے سے لگائے ساری دنیا سے بیگانہ ہو گیا تھا۔



آسیہ خاتون کا بخار اب اتر گیا تھا مگر نقاہت باقی تھی۔ سو فاطمہ نے انہیں مکمل بیڈ ریسٹ کروا رکھا تھا۔ وہ گھر کے سب کام احسن طریقے سے انجام دیتی اور انکی بھی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کرتی۔ آسیہ خاتون ہر وقت اسے دعائیں دیتی جس نے آتے ہی انکی بیٹی بن کر دکھادیا تھا۔

اس روز کافی دنوں بعد آسمان ے بادل چھٹے تھے اور سورج نے دھرتی پر اپنی نرم گرم کرنوں کا عکس ڈالا تھا۔ اس چھوٹے سے گاؤں کے لوگوں نے شکر ادا کیا اور کئی دنوں سے رکا ہوا کاروبار زندگی بحال ہوا۔ حیدر تین دن سے کہیں گیا ہوا تھا منہ اندھیرے اسکی واپسی ہوئی تھی تب سے اب تک وہ اپنے کمرے

میں ہی تھا۔ اسکے آنے جانے کے اوقات عجیب تھے کبھی تو سارا سارا دن گھر پر اپنے کمرے میں گزار دیتا اور کبھی منہ اندھیرے ہی اٹھ کر چل دیتا۔ فاطمہ پہلے پہل حیران ہوتی تھی مگر اب اسکے ان معمولات کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ویسے بھی اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان تھا۔ گھر میں بھی ہوتا تو زیادہ تر اپنے موبائل میں ہی مصروف رہتا یا پھر ٹی وی کے سامنے بیٹھا نیوز چینلز دیکھتا رہتا۔ فاطمہ نے اسے ایک سنجیدہ بلکہ خطرناک حد تک سنجیدہ انسان پایا تھا۔ وہ خود سے تو اس سے مخاطب ہونے کی بھی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ شروع شروع میں اسکی موجودگی میں اک فطری سا خوف فاطمہ کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتا تھا مگر اسکی شرافت نے جلد ہی اسکے دل کو مطمئن کر دیا تھا۔ خیر بات ہو رہی تھی ایک چمکیلے دن کی۔ وہ حسین دن تھا۔ نیلے افق پر سورج کی شعاعیں بکھری پڑی تھیں۔ سماں نکھرا نکھرا سا تھا۔ فاطمہ نے گھر کی صفائی کر کے مرغیوں کو ڈربے سے باہر آنگن میں نکالا اور خود بھی چارپائی بچھا کر دھوپ سیننے لگی۔ آسیہ خاتون ابھی جاگی نہ تھیں۔ وہ ذرا کمر سیدھی کرنے کی غرض سے تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ نرم سی دھوپ جس کو تراوٹ بخش رہی تھی۔ اسی لمحے حیدر اپنی نیند پوری کر کے اپنے کمرے سے باہر نکلا اور کچے بنیرے کے پاس رک کر نیچے جھانکا۔ آنگن میں بچھی چارپائی پر وہ پلکیں موندے نیم دراز تھی۔ اسکے چہرے کی انتہائی سپید رنگت میں گلابیاں گھل رہی تھیں، گلابی لب باہم پیوست تھے۔ ٹھوڑی میں خفیف سا گڑھا۔ اور ناک جیسے

موم کی ہو۔ اسکا وجود سیاہ چادر کے حصار میں تھا۔ اسکے دودھ جیسے ہاتھوں نے چادر کے پلو مٹھی میں تھام رکھے تھے اور گداز سپید پاؤں زمین کو چھو رہے تھے۔ حیدر نے اتنا مکمل حسن کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ مرمر کا مجسمہ تھی۔۔۔ سراپا قدرت کی صناعی کا شاہکار تھی۔ حیدر اسے دیکھنے میں محو ہو گیا تھا۔ ادھر فاطمہ کو خود پر کسی کی نگاہوں کا احساس ہوا تو اس نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ اسکی سبز آنکھیں حیدر کی سنہری آنکھوں کے حصار میں قید ہوئی تھیں۔ اک لمحے کا فسوں تھا۔ سب سے پہلے فاطمہ چونکی تھی اور پھر اک لمحے کی بھی تاخیر کیے بناء اٹھ کر تقریباً بھاگتی ہوئی باورچی خانے میں ہی آکر دم لیا۔ اسکے دماغ پر جھنجھلاہٹ طاری ہو رہی تھی۔ اسنے لکڑیاں جلائیں اور چولہے پر چائے کا پانی رکھا۔ تبھی باورچی خانے کے دروازے پر آہٹ ہوئی اور حیدر نمودار ہوا۔ فاطمہ کی پیشانی پر شکنیں واضح تھیں۔

جی۔ اسکا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔

چائے۔۔ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ فاطمہ کے چہرے پر پھیلی کبیدگی نے اسے وارن کر دیا تھا۔

بن رہی ہے۔ اسنے منہ بنا کر جواب دیا۔

مجھے ایک کپ مل جائے گا؟ وہ تیس سال کا بہادر مجاہد ایک انیس بیس سالہ لڑکی کے سامنے ہکلانے لگا تھا۔

اتنی ڈھیر چائے میں اکیلی تو نہیں پی جاؤ گی۔ وہ اب کی بار سب لحاظ بالائے طاق رکھ کر برہمی سے بولی۔

اوہ۔۔۔ سوری۔۔۔ وہ کان کھجاتا پلٹ کر باورچی خانے سے چلا گیا تھا۔

کباڑیا سالہا۔ اس کے منظر سے گم ہوتے ہی فاطمہ نے زیر لب اسے لقب سے نوازا تھا۔ بہت عرصے بعد اس کے اندر کی شردہا جاگی تھی۔



بابا آپ نے کتنے سال قید میں گزارے؟ دانیال نے اس سے پوچھا۔ چھٹی کا سارا دن ولید نے اسی کیساتھ گزارا تھا۔ صبح سے شام تک مری میں گھومتے رہے پھر اسلام آباد واپس آکر وہ اسے ساتھ لیے آرمی میس چلا آیا۔ وہاں اپنے کچھ کولیگنز سے اپنے بیٹے کا تعارف کروایا۔ دانیال وہاں آکر بہت خوش ہوا تھا۔ رات کو وہ گھر پہنچے تو شکیلہ بیگم اور لیلیٰ دونوں ہی سوچکے تھے۔ دانیال اس کے ساتھ اس کے کمرے میں ہی چلا آیا تھا۔ اور اب وہ دونوں کپڑے بدل کر بستر پر نیم دراز ایک مووی دیکھ رہے تھے۔

تقریباً سات سال۔ ولید نے جواب دیا۔

سات سال۔۔۔ دانیال نے انگریزی میں دہرایا۔ وہ زیادہ تر انگریزی میں ہی بات کرتا تھا۔ بابا آپ جہاں قید تھے وہ جیل کیسا تھا۔ اسکا دھیان فلم سے ختم ہو چکا تھا سو ولید نے لیپ ٹاپ بند کر کے پرے کھسکایا اور بیڈ کے کراؤن سے ٹیک

لگالی۔

وہ جیل نہیں زندان تھا۔ زندان سمجھتے ہو۔

نہیں بابا۔ دانیال نے معصومیت سے سر نفی میں ہلایا۔

زندان وہ قید خانہ ہوتا ہے جس میں کہیں کوئی روزن نہ ہو بس گھور تاریکی سیلن اور گھٹن۔۔ وہ آنکھیں بھیچنے ماضی میں جھانک رہا تھا۔ دانیال کسی سحر زدہ کی طرح باپ کے چہرے کی جانب تک رہا تھا۔ ولید اسے سب بتاتا گیا۔ قید خانے میں خود پر بیٹے مظالم کی داستان۔ اپنا وہاں سے بھاگنا۔ پھر شردہا کی مہربانیاں۔۔ اسکی زندگی کے نشیب و فراز اسکا مسلمان ہونا۔ وہ اسے سب بتاتا گیا اور وہ انہماک سے سنتا رہا۔ کہانی کے اختتام پر اسنے بے اختیار اٹھ کر باپ کا ماتھا چوم لیا تھا۔

آپ کتنے بہادر ہیں بابا۔ آئم پراؤڈ آف یو۔ وہ اسکے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ ولید بے اختیار مسکرایا۔ وہ بہت بے تکلف سا بچہ تھا اور اسکی یہ ادا ایہا سے بالکل الٹ تھی۔

میں تو اندھیرے سے بہت ڈرتا ہوں بابا۔ وہ اسے بتا رہا تھا۔ اسکے بال سہلاتے ہوئے ولید کا ہاتھ تھا۔ اسے یاد آیا تھا جب دانیال پیدا ہونے والا تھا تب ایہا اندھیرے سے بہت ڈرتی تھی وہ اکثر رات کو ڈر کر جاگ جایا کرتی تھی۔ ولید نے ایک گہری سانس لی۔ بچے ماں باپ کی کیا کیا بات چرا لیتے ہیں۔

آپ تو بریو ہو ناں پھر اندھیرے سے کیوں ڈرتے ہو۔

پتہ نہیں بابا مجھے بس اندھیرے میں بہت ڈر لگتا ہے۔

اچھا میری جان میں آپکو کبھی اندھیرے میں رہنے ہی نہیں دوں گا۔ اسنے جھک اسکے ماتھے پر پیار کیا۔

بابا ایک بات پوچھوں۔

۔ جی میری جان پوچھو

آپ ماما سے ناراض ہیں کیا۔ اسنے ولید کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اگر وہ اس کو ساری سچائی بتا دیتا تو بھی اسکے دماغ پر اسکی ماں کا غلط امپریشن ہی پڑنا تھا اور اگر وہ لیلیٰ کو اسکی ماں تسلیم کر لیتا تو یہ اس کے اپنے لیے نہایت تکلیف دہ عمل تھا وہ دانیال کے ننھے سے ذہن کو الجھانا نہیں چاہتا تھا۔

نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں۔ اسنے دل پر بھاری پتھر رکھ کر جواب دیا۔ جب تک ابیہا مل نہیں جاتی دانیال کو اسکے متعلق بتانا سراسر بچے کے ذہن کو الجھانے کے مترادف تھا۔

پھر آپ ہمارے ساتھ ہمارے کمرے میں کیوں نہیں رہتے۔ اسکا اگلا سوال پہلے سے زیادہ جان لیوا تھا۔

اس کمرے میں رہنا ضروری ہے کیا۔

میرے سب فرینڈز کے ماما بابا ایک روم شیئر کرتے ہیں تو پھر آپ دونوں الگ الگ رومز میں کیوں رہتے ہیں۔ اسکا ننھا سا دماغ الجھا ہوا تھا۔ ولید کا دل چاہا وہ اسے بتادے کہ جس کو وہ ماں سمجھتا ہے وہ اسکی کچھ نہیں لگتی مگر وہ رک گیا تھا۔

مجھے روم شیئر کرنے کی عادت نہیں ہے بیٹا۔ اسنے رمان سے اسے بتایا تھا۔
دانیال نے سر ہلادیا۔

ٹھیک ہے بابا تو پھر میں ایک دن آپ کے پاس سویا کرونگا اور ایک دن ماما کے پاس۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
ہر روز میرے پاس کیوں نہیں۔

مجھے ماما کے بغیر نیند نہیں آتی بابا۔ وہ معصومیت سے بولا تھا۔ ولید کے دل پر ایک گھونسا پڑا۔ وہ عورت اسکے بچے پر قابض تھی۔ وہ چاہ کر بھی اسے اپنے اور اپنے بیٹے کی زندگی سے دور نہیں کر پارہا تھا۔

اور اگر میں کسی دوسرے شہر پوسٹڈ ہو جاؤں تو آپ یہاں ماما کے پاس رہو گے یا میرے ساتھ چلو گے۔ اسنے ایک آخری داؤ کھیلا تھا۔

اگر ماما ساتھ چلیں تو آپکے پاس ورنہ یہیں ماما کے پاس۔ دانیال نے بغیر سوچے جواب دے ڈالا تھا۔ اسکے لیے یہ مسئلہ بالکل کلیر تھا۔

بابا کے بغیر رہ لوگے۔ ولید کی آخری امید جاگی۔

جی بابا مجھے تو آپکے بغیر رہنے کی عادت ہے مگر میں ماما کے بغیر نہیں رہ سکتا ایک منٹ بھی۔ شانے اچکا کر اسنے بہت اطمینان سے جواب دیا تھا۔ ولید کے دل پر گھونسا پڑا۔ وہ اسکا اور ایہا کا بیٹا ان دونوں کے بغیر رہنے کا عادی تھا۔ اور جس کے بغیر وہ نہیں رہ سکتا تھا وہ اسکی کچھ نہ لگتی تھی۔ وہ عورت تھی جو ولید کو ایہا سے دور کر دینا چاہتی تھی۔ قسمت کی کیسی ستم ظریفی تھی ایہا کو بیٹے کی ماں بننے کی تمنا تھی اور اللہ نے اسے بیٹے کی ماں ہی بنایا تھا مگر وہ اسکے ساتھ نہ رہ سکی۔ وہ اپنی اولاد کے آنے کی خوشی میں کیسا سرشار تھا مگر وہ تو اسکی صورت تک نہ دیکھ پایا تھا۔۔۔ وہ ایہا ولید کا سہنا کسی اور کی زندگی کی حقیقت بن گیا تھا۔ ولید کا دل چاہا وہ زور زور سے روئے ایہا کو پکارے۔۔۔ اس سے پوچھے کہ میں تو مجبور تھا مگر تم کیوں اپنی اولاد کو کسی اور کے رحم و کرم پر چھوڑ گئیں تم نے کیوں نہ اپنے بیٹے کو محبت سے پالا۔۔۔ کونسی مجبوری نے تمہیں تمہاری جنت سے دور کر دیا۔ وہ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ سوال پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ تھی کہاں۔۔۔



فاطمہ نے چاول دم پر رکھے اور آنگن میں بچھی چارپائی پر آ بیٹھی۔ آسیہ خاتون کی طبیعت اب بالکل ٹھیک تھی اور وہ برابر والے گھر تک گئی ہوئی تھیں۔ حیدر گھر پر نہ تھا۔ وہ غائب دماغی کے عالم میں آنگن میں چہل قدمی کرتی

مرغیوں کو دیکھ رہی تھی جب یکدم بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی اور کواڑ کھول کر حیدر اندر داخل ہوا۔

دروازہ کیوں کھلا ہے۔ اسنے چھوٹے ہی پوچھا۔ اس سے اسنے سرمئی شلوار قمیض پر سبز جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں سستے سے چپل تھے اور سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔

وہ موسیٰ برابر والے گھر تک گئیں تھی تو میں بند کرنا بھول گئی۔ اسنے جواب دیا۔

آپکو احتیاط کرنی چاہیے۔ یہاں کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ بھارتی فوجی کتوں کی طرح مسلمان عورتوں کی بو سونگھتے پھرتے ہیں اور میں اماں پر بھی حیران ہوں کہ وہ آپکو گھر میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ برہمی سے بولتا دروازہ بند کر کے دو دوزینے پھلانگتا اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ فاطمہ نے منہ بنا کر اسکے انداز کی نقل اتاری اور پلٹ کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ چاولوں کو دم سے اتارا اور سالن کو پھر سے چولہے پر رکھا۔ حیدر چاول نہیں کھاتا تھا اسلیے اسکے لیے اسنے سالن بنا رکھا تھا۔

پورا کباڑیا ہے یہ تو سڑیل کہیں کا۔ وہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب تھی۔ کھانا ملے گا۔ حیدر نے باورچی خانے میں جھانکا تو وہ چونکی۔

جی سالن گرم ہو رہا ہے۔ میں بس روٹیاں ڈالتی ہوں۔ اسنے جواباً کہا تو وہ پلٹ

گیا۔ فاطمہ نے پھرتی سے دو روٹیاں پکائیں اور پلیٹ سالن نکال کر باہر لے آئی۔ وہ چار پائی پر بیٹھا ہوا تھا اسنے کھانا اسکے سامنے رکھا۔ آپ نے کھالیا۔ اسکے پلٹنے سے قبل ہی اسنے پوچھ لیا تھا۔ موسیٰ آجائیں تو انکے ساتھ ہی کھاؤنگی۔

تو مجھے کمپنی دینے کو تو ادھر بیٹھ سکتی ہیں یا نہیں۔ اسنے فرمائش کی تھی فاطمہ نے نظریں اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔ اسے ولید بے طرح یاد آیا تھا۔ وہ سر ہلا کر پلیٹی اور گلاس میں پانی لے کر واپس آئی اور اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ حیدر نے اب تک کھانا شروع نہ کیا تھا اسکے بیٹھتے ہی اسنے باواز بلند بسم اللہ پڑھی اور پہلا لقمہ توڑا۔

لیجیے۔ اسنے وہ لقمہ اپنے منہ میں ڈالنے کی بجائے اسکی جانب بڑھایا تھا۔ فاطمہ جھجک گئی۔ اسکو پھر کوئی شدت سے یاد آیا تھا۔

فاطمہ۔ حیدر کی نرم سی پکار پر وہ چونکی اور لقمہ اسکے ہاتھ سے لے کر منہ میں رکھ لیا۔ حیدر اب انہماک سے سر جھکائے کھانا کھانے میں مشغول ہو چکا تھا۔ فاطمہ نے اس ایک لقمے کے ذائقے کو محسوس کرنا چاہا۔ مگر آنسوؤں کی نمی نے ہر ذائقے کو نمکین کر دیا تھا۔ اسکی آنکھوں کی سطح دھندلانے لگی تو وہ بے اختیار اٹھ کر کمرے میں چلی آئی تھی۔



اسی روز رات کی بات تھی آسیہ خاتون اسے نماز اور قرآن کا سبق پڑھا کر سوچکی تھیں جبکہ اسے نیند نہ آرہی تھی۔ وہ چپکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی۔ آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ کھلے میں سردی کا احساس دوچند ہو رہا تھا۔ اسنے چادر اپنے گرد اچھی طرح لپیٹی اور آنگن میں ٹہلنے لگی۔ ہڈیوں میں گھستی سردی بھی اس سے اسے بھلی لگ رہی تھی۔

سوئی کیوں نہیں۔ حیدر نے اوپر سے نیچے جھانکتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔ پہلے تو وہ چونک کر اچھلی پھر گردن اٹھا کر اوپر دیکھنے لگی۔ وہ کچے بنیرے پر جھکا ہوا تھا اور عقب میں اسکے کمرے کے کھلے دروازے سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Articles | Book | Poetry | Interviews

میری مرضی۔ وہ نک چڑھی لڑکیوں کی طرح بولی۔

آدھی رات کو اس طرح تو بدروحیں ہی گھومتی ہیں۔ وہ بھی شاید مذاق کے موڈ میں تھا۔

جی ہاں میں بد روح ہوں آپ جا کر اپنے کمرے میں آرام کریں ورنہ آپکو قتل کر دوں گی۔ وہ بہت تپی ہوئی تھی۔ جانے کیوں اس انسان کی شکل دیکھ کر ہی اسے جھنجھلاہٹ ہونے لگتی تھی۔

اللہ سے ڈرو لڑکی علی الاعلان قتل کی دھمکی دے رہی ہو۔ اقدام قتل کا مقدمہ بن سکتا ہے تم پہ۔ وہ محظوظ ہو رہا تھا اسکی چڑچڑاہٹ سے۔

دیکھیں جی آپ مجھ سے آڑی ٹیڑھی باتیں مت کریں۔ جائیں جا کر اپنا کام کریں۔۔ اسنے ہاتھ ہلا کر کہا۔ حیدر زینے طے کر کے نیچے چلا آیا۔ اصل میں مجھے بھی آپکی طرح رتجگے کی بیماری ہے۔

مجھے ایسی کوئی بیماری نہیں بس آج یونہی نیند نہیں آرہی تھی۔

ہو سکتا ہے آج سے آپکو بھی یہ بیماری لاحق ہو جائے۔ وہ زینوں کے پاس ہی سینے پر بازو لپیٹے کھڑا تھا۔ چاند کی روشنی میں نہایا ہوا وہ جیسے اپالو کا مجسمہ تھا۔ کونسی بیماری۔ فاطمہ نے اسکی طرف پلٹ کر پیشانی پر بل ڈالے۔

دل کی۔ وہ ذرا سا جھکتے ہوئے دلفریب لہجے میں بولا تھا۔ فاطمہ گڑبڑا کر پلٹ گئی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

مجھے کیوں ہونے لگی دل کی بیماری۔

کیوں سے تو لڑائی ہوتی ہے۔

میں لڑائی جھگڑوں سے ڈرتی نہیں ہوں۔ وہ پلٹ پڑی۔

وہ تو آپکی شکل سے ظاہر سے۔

مطلب کیا ہے آپکا میں شکل سے لڑاکا لگتی ہوں۔ وہ مزید تپ گئی۔

ایسا تو نہیں کہا میں نے مگر میں آپکی خود شناسی کی داد دیتا ہوں۔ اسنے

مسکراہٹ لبوں میں دبا کر کہا تھا۔

آپ مجھے غصہ دلا رہے ہیں۔

اچھا۔ آپکو غصہ بھی آتا ہے۔ وہ اسے چڑا رہا تھا۔

بہت زیادہ آتا ہے۔ اتنا زیادہ کہ۔۔

کہ۔۔

کچھ نہیں میں سونے جا رہی ہوں۔

مگر آپکو تو نیند نہیں آرہی۔

آپ سے باتیں کرنے سے اچھا ہے انسان سو جائے۔ وہ تن فن کرتی پلٹی۔

ممکن ہے کبھی آپ مجھ سے باتیں کرنے کی خاطر رات کی نیند قربان کرنے کو ترجیح دیدیں۔ وہ عقب سے بہت پر یقین سے انداز میں بولا تھا فاطمہ نے گردن موڑ کر ایک تیکھی نظر اس پہ ڈالی اور پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں چلی آئی۔

آسیہ خاتون کے برابر لیٹ کر اسنے کمبل اوڑھ لیا۔

کباڑی سالار۔۔ منحوس مارا۔ وہ دل ہی دل میں اسے القابات سے نواز رہی تھی۔

موسیٰ سے اسکی شکایت کرنی پڑے گی۔ اسنے تہیہ کیا۔ مگر میں ان سے کہوں

گی کیا۔۔ مجھے کبھی تنگ نہیں کیا اس کباڑیے نے نہ کبھی غلط نظر ڈالی۔ پھر

میں موسیٰ کو کیا کہو گی یہ کہ آپکا بیٹا مجھے زہر لگتا ہے۔ وہ سوچتے سوچتے اٹکی۔

خیر۔۔ جو بھی ہے۔ اب میں اسکو اچھا سبق سکھاؤں گی۔ یہ مجھے جانتا نہیں ہے اسکو دن میں تارے نہ دکھادیئے تو میرا نام شردہا نہیں۔۔ کباڑیا کہیں کا۔ وہ کلستی ہوئی سو گئی تھی۔



ولید کو دو دن کے لیے شہر سے باہر جانا پڑا تھا وہاں سے واپسی پر روحینہ کی واپسی کی اطلاع ملی۔ وہ اگلے دن واپس جا رہی تھی۔ ولید کو اداسی محسوس ہوئی تھی۔ اس پورے گھر میں وہ واحد انسان تھی جسے ابیہا سے خدا واسطے کا بیر نہ تھا۔ جس سے وہ اپنے دل کی باتیں کر سکتا تھا۔ جاتے سے روحینہ نے اسے کہا تھا کہ بھائی آپ پلیز اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کریں۔ ابیہا اب ماضی کا قصہ بن چکی ہے۔ اس کی بات سن کر ولید کی آنکھوں میں درد ابھرا تھا۔ وہ میری بیوی ہے روحینہ میرا ماضی حال مستقبل سب اسی سے منسوب ہے۔

مگر وہ اب کہیں نہیں ہے بھیا۔ سات سال بیت چکے ہیں۔ دنیا بدل جاتی ہے ایک انسان پہ کیا موقوف۔ ابیہا جانے زندہ بھی ہوگی یا نہیں۔ آپ پلیز موو آن کریں۔

میں ابیہا کو تلاش کر کے رہوں گا۔ اس کے لہجے میں اک عزم تھا۔
ڈونٹ بی سلی بھیا۔ جذباتیت سے باہر نکل کر سوچیں۔ سراب کے پیچھے بھاگنے

کی بجائے حقیقت کو دیکھیں۔ دانی آپکا بیٹا ہے اسے آپکی ضرورت ہے۔
دانیال میرا اور ابیہا کا بیٹا ہے۔ اسنے جتایا۔

واٹ ایور۔ ابیہا اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ جب اس بچے کے ماں باپ میں
سے کوئی اسکے پاس نہیں تھا تب لیلا تھی جس نے اسے ماں کا پیار دید۔ آپ
اسکی سروسز کو زیرو مت کریں۔

تو کیا کروں اسے تمنغہ حسن کارکردگی پہناؤں۔ وہ تپ گیا۔
اسے دانیال کی ماں رہنے دیں۔ ابیہا کا سین اب ختم ہو چکا ہے۔ آپکی فیملی یہ
ہے دانیال اور لیلا۔

لیلا سے میرا کوئی نکتہ نہیں ہے۔ ولید فوراً سے اسکی بات کاٹی۔
نہیں ہے تو بنالیں۔ شادی کر لیں اس سے اور اپنی فیملی کو اپنا لیں۔ روحینہ نے
اسکے سر پر جیسے بم پھوڑا تھا۔

شٹ اپ روحی جسٹ شٹ اپ۔۔ وہ برہمی سے بولا۔

غصہ مت کریں بھیا یہی اب آپکی زندگی کی حقیقت ہے۔ اگر آپ اب تک
کسی نو عمر عاشق کی طرح ابیہا ابیہا کی رٹ لگائے رکھیں گے اور حقیقت پر غور
کرے گا۔ جو جا چکی ہے اسکی suffer نہیں کریں گے تو سب سے زیادہ آپکا بیٹا
خاطر آپ اس معصوم کو سزا نہیں دے سکتے جو بد قسمتی سے آپکی اولاد ہے۔

اسکی کیا غلطی ہے بھیا۔ اسنے آنکھ کھلتے ہی لیلیٰ کو ماں باپ دونوں کے روپ میں دیکھا۔ آپ ایسا کو تلاش کر کے لے بھی آئیں تو کیا وہ اسے اپنی ماں کی حیثیت میں قبول کر لے گا۔ کبھی بھی نہیں بلکہ ایسا ہونے سے اسکا رشتوں اور محبتوں سے اعتبار بالکل ختم ہو جائے گا۔ وہ جذباتی انداز میں بولتی چلی گئی تھی۔ لیلیٰ نے دانیال کے لیے جو کچھ کیا وہ اسکی اپنی چوائس تھی۔ اسنے سرد لہجے میں کہا۔

آپ بہت خود غرض ہیں بھیا۔ روحینہ ملامتی لہجے میں کہہ کر جانے کو پلٹ گئی تھی۔ ولید وہیں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا تھا۔



Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

ج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
آنکھ سے دور طلسمات کے در وا ہیں کئی
خواب در خواب محلات کے در وا ہیں کئی
اور مکیں کوئی نہیں ہے،

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
کوئی امید، کوئی آس مسافر صورت

کوئی غم، کوئی کسک، کوئی شک، کوئی یقین
کوئی نہیں ہے

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
تم اگر ہو، تو مرے پاس ہو یا دُور ہو تم
ہر گھڑی سایہ گرِ خاطرِ رنجور ہو تم
اور نہیں ہو تو کہیں۔۔ کوئی نہیں، کوئی نہیں ہے

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
شب کے سناٹے میں ولید حسن اپنے کمرے میں آتشدان کے پاس یادوں کی
آگ جلانے بیٹھا تھا۔ وہ کیسا حرماں نصیب تھا کہ محبت کو پا کر بھی خالی دامن
ہی رہا۔ جب اسنے ایہا سے شادی کی تھی تب کتنے ہی لوگ تھے جو ششدر
رہ گئے تھے۔

بھلا یوں کیسے دو محبت کرنے والے مل گئے۔

انکے درمیان ظالم سماج کیوں نہ آیا۔

اتنی آسانی سے محبت کسے ملا کرتی ہے بھلا۔

ہائے یہ دونوں کتنے خوش قسمت ہیں۔ سب کی اپنی اپنی باتیں تھی۔ کوئی

ریشک کرتا تو کوئی حسد

ولید کو لگتا اسکی خوشیوں کو حاسدین کی نظر لگ گئی تھی۔۔ اسکی زندگی میں کیسی آندھی چلی کے سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ وہ اب اور بیا محض آٹھ ماہ ساتھ رہ پائے تھے کہ جدائی کا پروانہ مل گیا۔ سات سال اس نے قید خانے کی تاریکی کو جس کی یادوں سے روشن کیے رکھا تھا وہ تو جانے کب کی کھو چکی تھی۔۔ وہ اسے کہاں تلاش کرتا۔۔ کیسے تلاش کرتا۔۔ وہ کتنا مجبور ہو چکا تھا۔ اسکی زندگی کا تو شیرازہ ہی بکھر گیا تھا یوں جیسے سات سال نہیں سات صدیاں بیت گئی ہوں۔ اسکا بیٹا اسکی اپنی اولاد اس سے زیادہ ایک غیر عورت کے قریب تھا اور وہ عورت ولید کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ کبھی کبھی اسکا دل چاہتا وہ دانیال کو لے کر یہاں سے بہت دور چلا جائے مگر یہ خیال اسکے پیروں کی زنجیر بن جاتا کہ اسکا بیٹا اس عورت کو اپنی ماں سمجھتا ہے وہ اسکے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔

یا اللہ! کیا کروں میں۔۔ وہ کراہا تھا۔ اتنے کشادہ کمرے میں بھی اسکا دم گٹھنے لگا تھا۔ اتنی گھٹن تو اس تنگ و تاریک قید خانے میں بھی نہ تھی جہاں اس نے سات سال گزار دیئے تھے۔ کیونکہ وہاں بیا سے ملنے کا خیال و امید خوشگوار ہوا کی مانند تھا۔ لیکن اب تو امید بھی ٹوٹنے لگی تھی۔ ولید کو زندگی سے نفرت ہونے لگی تھی۔



فاطمہ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر دنگ رہ گئی۔ ابھی کچھ منٹوں پہلے ہی تو وہ صحن میں لگے ہینڈ پمپ سے وضو کر کے ظہر کی نماز ادا کرنے گئی تھی تب تک تو مطلع بالکل صاف تھا اور اب بمشکل بیس منٹ بعد کالے بادل سارے افق کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ یہاں کے موسم کا بھی کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ پھرتی سے صحن میں بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ چارپائی کونے میں کھڑی کی۔ مرغیوں کو ڈربے میں بند کیا۔ بکریوں کو انکے احاطے میں بند کیا اور چھت پر چلی آئی جہاں آسیہ خاتون نے مرچیں سکھانے کو رکھ چھوڑی تھیں۔ ابھی وہ چھت پر پہنچی ہی تھی کہ تیز اور سرد ہوا چلنے لگی۔ وہ بے اختیار وہیں رک گئی تھی۔ اسکی نظریں دور دور تک پھیلی سرسبز چٹانوں پر پھسل رہی تھیں۔ اونچی اونچی چوٹیاں سرمئی بادلوں میں ڈھکی ہوئی تھیں۔ کیسا ساحر نظارہ تھا۔ وہ کھو گئی۔ تبھی چھت کے دوسرے کونے پر کھڑا حیدر جو موبائل کان سے لگائے کسی سے مصروف گفتگو تھا بات کرتے کرتے پلٹا اور پھر فاطمہ کو دیکھ کر بے اختیار تھم گیا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی حیدر نے اسے پہلی بار چھت پر دیکھا تھا۔

اچھا میں تمہیں کچھ دیر بعد کال کرتا ہوں۔ اسنے عجلت میں بات سمیٹ کر کال کاٹی اور پوری طرح اسکی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ ایسی پوزیشن میں کھڑی تھی کہ وہ اسکا دایاں رخ دیکھ سکتا تھا۔ اسنے سیاہ کاٹن کی پرنٹڈ شلوار قمیض پر سرخ گرم شال نماز کے انداز میں لپیٹ رکھی تھی۔ اور وہ کسی سحر زدہ کی

طرح مشرقی افق پر اڑتے بادلوں کو تک رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا اسکے وجود کو چھو رہی تھی۔ اور اسکے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

حیدر بلا ارادہ ہی سست قدموں سے چلتا اسے قریب چلا آیا۔ فاطمہ کی سبز آنکھوں میں سرمئی بادلوں کا عکس تھا۔ وہ جیسے کسی جادو کے زیر اثر اسکے پاس کھینچتا چلا آیا تھا۔ چونکا وہ تب جب فاطمہ نے یکدم گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا پھر اسے اپنے قریب دیکھ کر اسکی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئی تھیں۔ حیدر بے اختیار کھنکھارا تھا۔ وہ چلتی ہوئی اس طرف بڑھی جہاں چبوترے پر آسیہ خاتون نے مرچیں سکھانے کو رکھی تھیں۔ تیز ہوا نے انکو منتشر کر دیا تھا۔ وہ جھک کر جلدی جلدی مرچیں اکٹھا کرنے لگی۔

موسم بہت اچھا ہے۔ حیدر نے بات شروع کی۔

جی۔ وہ اسکی طرف دیکھے بغیر بولی۔

آپکو بارش پسند ہے۔

کیوں آپکو نا پسند ہے کیا۔ وہ جب جب اس سے بات کرتی جانے کیوں اسکے لہجے میں تلخی بھر آتی تھی۔

نہیں بارش کس کو نا پسند ہو سکتی ہے۔

تو پھر یہ بے تکا سوال مجھ سے پوچھنے کی وجہ۔ وہ مرچیں سمیٹ کر ٹوکری میں

ڈال چکی تھی سو سیدھی کھڑی ہو کر براہ راست اسکی طرف دیکھا۔

یونہی پوچھ لیا تھا۔ آپ ہر وقت اتنے غصے میں کیوں رہتی ہیں۔ اسنے ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ وہ گھر میں زیادہ تر اسی سیاہ گرم ٹراؤزر اور سفید سویٹر میں ملبوس ہوتا تھا۔ بال الجھے رہتے آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرتے رہتے۔ وہ بہت دلکش تھا۔ مگر لباس کے معاملے میں بالکل بے ڈھنگا۔

میں پاگل نہیں ہوں جو ہر وقت غصے میں رہوں۔ اسنے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

کم آن فاطمہ آپ کے ماتھے پر ہر وقت شکنیں پڑی رہتی ہیں مجال ہے جو کبھی میں نے آپکو خوشگوار انداز میں مسکراتے دیکھا ہو۔ ہر وقت کا غصہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ چہرے کی ساری دلکشی ہوا ہو جاتی ہے۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ لبوں میں دبائے ہوئے نرم سے لہجے میں بول رہا تھا۔ فاطمہ سر جھٹک کر نیچے جانے کے لیے زینوں کی طرف بڑھی۔

سنیے اسنے عقب سے اسے پکارا۔

اب اور برائی کرنا باقی رہ گیا ہے کیا۔ وہ پلٹ کر پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی تو وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ فاطمہ کا چہرہ غصے کے مارے لال ہو رہا تھا۔

ایک کپ چائے بنا دوگی۔ اسنے یوں دوستانہ انداز میں کہا تھا جیسے اب تک انکے درمیان بہت دوستانہ ماحول میں گفتگو ہوتی رہی ہو۔ فاطمہ نے گھور کر اسے

دیکھا پھر تن فن کرتی پلٹی اور سیڑھیاں طے کر کے نیچے چلی آئی۔ جیسے ہی اس نے آنگن میں قدم رکھا آسمان سے موٹی موٹی بوندیں برسنے لگیں۔ اس نے مرچوں کی ٹوکری باورچی خانے میں رکھی اور کمرے میں آئی۔ آسیہ خاتون حسب معمول محلے کی سیر کو نکلی ہوئی تھیں۔

چائے بنادوں۔۔ ہونہہ جیسے ملازمہ ہوں ناں۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

کباڑیا نہ ہو تو۔ بولتے بولتے یکدم اسکی نظر سامنے دھندلے سے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر پڑی۔ اسکی پیشانی پر پڑی شکنیں بڑی واضح تھیں۔ اسے حیدر کی کہی بات یاد آئی تھی۔

اس نے جلدی سے اپنے چہرے کے تاثرات ٹھیک کیے۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

میں کوئی غصے میں نہیں رہتی ہر وقت۔ یونہی وہ کباڑیا بے کار میں بولتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ پھر مسکرانے کی کوشش کی مگر بسور کر رہ گئی۔ جھنجھلا کر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ آئی۔

یہ مجھے سمجھتا کیا ہے۔ کیسے حکم دے رہا تھا چائے بنادو۔ ہونہہ نہیں بنا کر دیتی چائے کیوں بنا کر دوں میں اسکو چائے۔ وہ اضطراری انداز میں کمرے میں چکر لگاتے ہوئے باواز بلند سوچ رہی تھی۔

دیتی ہوں بنا کر۔۔ ایسی چائے بنا کر دوں گی کہ یاد کرے گا وہ کباڑیا۔ جانتا نہیں ہے وہ مجھے میرا نام بھی شردھا ہے۔

فاطمہ دروازے میں کھڑے حیدر نے تصحیح کی تھی۔ وہ بے تحاشہ پلٹی۔
وہ مسکرا رہا تھا۔ فاطمہ کی سٹی گم ہو گئی۔

میں بہت اچھی چائے بناتا ہوں آپ پیئیں گی۔ اسنے دوستانہ انداز میں پوچھا۔ وہ
جواباً کچھ نہ کہہ سکی۔

ویسے میرا نام کچھ اتنا برا بھی نہیں کہ آپ نے اپنی مرضی کا نام دے دیا
مجھے۔ شائستہ سے انداز میں اسے جتا کر وہ پلٹ گیا تھا۔ اور فاطمہ کا یہ حال کہ
کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔



آخر کب تک بھاگو گے ولید۔ تھک جاؤ گے۔ وہ تھکا ہارا گھر پہنچ کر ابھی اوپری
منزل جانے والے زینوں کی جانب بڑھا ہی تھا کہ عقب سے لیلیٰ کی ٹھہری
ہوئی پکار نے اسکے قدم جکڑ لیے۔ وہ اکتائے ہوئے انداز میں مڑا۔ وہ پیازی
رنگ کے لمبے فراک میں ہم رنگ دوپٹہ شانوں پر پھیلائے سنہرے بالوں کی
چوٹی کاندھے پر ڈالے سادہ آنکھوں میں بھر بھر کر کاجل ڈالے اک تمکنت
سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ گزرے سالوں نے اسکے حسن کو دو چند کر دیا تھا۔
اس بات کا مقصد۔ ولید نے پیشانی پر شکنیں ڈالیں۔
خیر مقصد تو تم جانتے ہو۔ وہ ڈھٹائی سے مسکرائی۔

مجھے تم سے یا تمہارے کسی بھی مقصد سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تیز لہجے میں بولا۔

مجھ سے نہ سہی دانیال سے تو دلچسپی ہے ناں تمہیں۔ اسنے جتایا۔

دانیال میرا بیٹا ہے۔ میں جب چاہوں اسے تم سے بہت دوت لے جا سکتا ہوں۔ اگر تمہیں چھوٹ دی ہے تو صرف اسلیے کہ میرا بیٹا تمہیں ماں سمجھتا ہے اور اسکی اصل ماں فی الحال لاپتہ ہے۔ جس دن ابہا مل گئی اس دن میں اپنے بیٹے کو لے کر یہاں سے چلا جاؤنگا۔ اسنے وارن کرے والے انداز میں کہا تھا۔

ابہا ملی پھر ناں۔ وہ استہزائیہ ہنسی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

مل جائے گی۔ مجھے یقین ہے۔

بھئی بہت کمال لڑکی تھی وہ سات سال بعد بھی تم اسی کے گن گاتے ہو۔ کبھی سوچتی ہوں مجھ میں ایسی چالاکی کیوں نہ آسکی۔ میں اتنی خوبصورت فارن کوالیفائیڈ ہو کر بھی ایک ولید حسن کا دل تسخیر نہ کر سکی اور وہ جاہل گنواد بد صورت ہو کر بھی تم پر قابض ہے۔ لیلیٰ کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی چھن تھی۔

اسلیے کیونکہ تمہارا مقصد ابہا کو ہرانا تھا ولید حسن کے دل میں جگہ بنانا نہیں اور لیلیٰ بی بی جو بازی کسی کو ہرانے کے لیے کھیلی جاتی ہے اسمیں مات کے

سوا کچھ نہیں ملتا۔ ایک اک لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کر کے وہ وہاں رکا نہیں تھا بلکہ زینے طے کر کے وہاں سے چلا گیا تھا۔ لیلیٰ کی نگاہوں نے دور تک اسکا پیچھا کیا تھا۔



موسم بہت خوشگوار تھا سو اسنے پکوڑے بنانے کا سوچا اور باورچی خانے میں چلی آئی۔ جھٹ پٹ پکوڑوں کا مصالحہ تیار کر لیا۔ لکڑیاں جلا کر کڑا ہی چولہے پہ رکھی اور اسمیں گھی ڈال کر بیسن گھولنے لگی۔ جتنے میں اسنے بیسن گھولا گھی اچھی طرح گرم ہو چکا تھا۔ وہ احتیاط سے پکوڑے اسمیں ڈالنے لگی۔ آسیہ خاتون بھی آج خلاف معمول گھر پہ ہی تھیں۔ اور بد قسمتی سے حیدر بھی صبح سے کہیں نہ گیا۔ تھام فاطمہ اسی کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ جانے کیوں وہ اسکو چڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ یا شاید وہ اسکی صورت سے ہی چڑتی تھی۔ مگر اسکی صورت کچھ اتنی بری تو نہ تھی۔ اسکی سوچ بہکی۔ اچھا خاصا پرکشش انسان تھا۔ بے ڈھنگے سے حلیے میں بھی دلکش لگتا تھا۔ مگر جانے کیوں فاطمہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ سوچ کی رو میں ایسی الجھی کہ پکوڑے کڑا ہی سے نکالتے نکالتے کفگیر کے دباؤ سے یکدم کڑا ہی کا توازن خراب ہوا اور گرم گرم ابلتا ہوا گھی اسکے ہاتھ پر آگرا۔ اسکی دلدوز چیخ نے سارے گھر کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ وہ تڑپ کر پیڑھی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ میں دبائے بری طرح چیخے جا رہی تھی۔ اسکی چیخیں سن کر آسیہ خاتون

اپنے کمرے سے اور حیدر اوپری منزل سے باورچی خانے کی جانب بھاگے تھے۔
ہائے میری بچی کیا ہو گیا۔ آسیہ خاتون بوکھلائی ہوئی اندر داخل ہوئیں اور پھر
اسکے سرخ ہوتے ہاتھ کو دیکھ کر انکے حواس گم ہو گئے تھے۔ فاطمہ کے دائیں
ہاتھ کی حالت نگفتہ بہ تھی اور وہ تکلیف کے مارے مسلسل روئے چلے جا رہی
تھی۔ تبھی حیدر سرعت سے اندر داخل ہوا۔

کیا ہوا۔

ہاتھ جل گیا بیچاری کا۔ آسیہ خاتون نے بتایا تو وہ اسکی جانب متوجہ ہوا جو اپنا
مضروب ہاتھ پکڑے آنسو بہا رہی تھی۔
اوہ۔ وہ آگے بڑھا۔ اور اسکا ہاتھ پکڑا جو فاطمہ نے سرعت سے واپس کھینچ لیا۔
زخم دیکھنے دو۔ اسنے ذرا سخت لہجے میں کہا اور پھر سے اسکا ہاتھ تھام کر زخم کا
معائنہ کرنے لگا۔ فاطمہ نے اب کی بار کوئی پس و پیش نہ کی تھی۔

کافی جل گیا ہے یہ تو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا پڑے گا۔ اسنے تشویشناک
لہجے میں ماں کو مخاطب کیا۔

نہیں نہیں میں ڈاکٹر کے پاس نہیں جاؤنگی۔ وہ روتے ہوئے کراہی۔

ارے کیوں نہیں جاؤنگی۔ لے جاؤ اسے ڈاکٹر کے پاس حیدر۔ آسیہ خاتون
بولیں۔ فاطمہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ حیدر کے ہمراہ کہیں جانے سے

اچھا تھا وہ درد سے مرتی رہتی۔ مگر وہ حیدر ہی کیا جو کسی کی سن لے۔ اسنے سرعت سے فاطمہ کا ہاتھ تھاما اور اسے باورچی خانے سے باہر لایا۔

میں جاوید سے بانیگ لاتا ہوں اماں۔ وہ ماں کو مخاطب کر کے سرعت سے چھوٹا سا آنگن پار کر کے گھر سے باہر نکل گیا م فاطمہ ضبط کی کڑی منزلیں طے کر رہی تھی۔ تکلیف تھی کہ کسی طور کم نہ ہو رہی تھی۔ وہ وہیں چارپائی پر بیٹھ گئی۔

میری بچی بہت جلن ہو رہی ہے کیا۔ آسیہ خاتون نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ اسنے بہتے آنسوؤں کیساتھ سر اثبات میں ہلایا۔

شہد بھی نہیں گھر میں ورنہ وہی لگادیتی۔ انہوں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ تبھی حیدر نے داخلی دروازے سے اندر جھانکا۔

آجاؤ فاطمہ۔ اسنے بلند آواز میں اسے پکارا تو اسنے مدد طلب نظروں سے آسیہ خاتون کی طرف دیکھا۔

چل میری بیٹی شاباش۔ ڈاکٹر سے مرہم پٹی کروا کر آرام مل جائے۔ انہوں نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ فاطمہ جانتی تھی اب جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں سو ناچار وہ انکے ساتھ تقریباً گھسٹتی ہوئی داخلی دروازے تک آئی۔ آسیہ خاتون نے اسکی سیاہ چادر کو اسکے سر کے گرد لپیٹ دیا۔ وہ ہاتھ کی جلن ضبط کرتی گھر سے باہر نکلی جہاں حیدر بانیگ پر بیٹھا اسکا منتظر تھا۔ وہ جھجھکتی ہوئی

بائیں ہاتھ سے چادر کا پلو تھامے اسکے پیچھے بیٹھ گئی۔ حیدر نے اسکے بیٹھتے ہی بائیں تیزی سے آگے بڑھا دی تھی۔

اففف۔۔۔ آہستہ چلائیں۔ وہ چلائی۔

کلینک کافی دور ہے واپس آتے آتے رات ہو جائے گی۔ بائیک کے شور کے باعث اسنے چیخ کر جواب دیا تھا۔ پہاڑی رستے ہر گز بھی شہری سڑکوں کی طرح ہموار نہیں ہوتے۔ قدم پر کسی کھڑے سے ملاقات ہو جاتی اور نتیجتاً ہلکی پھلکی سی فاطمہ کو لگتا وہ اب گری کہ تب۔۔

گر جاؤ گی مضبوطی سے پکڑو۔ حیدر نے ہدایت جاری کی۔
منحوس کباڑیے کیسے پکڑوں ایک ہاتھ جلا ہوا ہے دوسرے سے چادر کا پلو پکڑا ہوا ہے۔ اسنے جل بھن کر دل میں کہا اور بولی۔ میرا ہاتھ جلا ہوا ہے۔

ایک ہاتھ جلا ہوا ہے دونوں نہیں۔ کھٹ سے جواب آیا۔

بھاڑ میں جاؤ کباڑیے اللہ کرے تمہارا ہاتھ جلے تب تمہیں سمجھ آئے مجھے کتنا درد ہو رہا ہے اس وقت۔ اس نے کلس کر سوچا مگر بولی کچھ نہ تھی۔ حیدر نے بائیک کہ رفتار قدرے دھیمی کر دی تھی۔

زیادہ جلن ہو رہی ہے کیا۔ کچھ دیر بعد اسکی زبان کو پھر کھجلی ہوئی تھی۔

نہیں بہت مزہ آرہا ہے۔ وہ جل کر بولی۔ وہ ہنسنے لگا۔ فاطمہ کا غصہ تیز ہو گیا

تھا۔

تمہارا ہاتھ تو واقعی بہت زیادہ جل گیا ہے۔ بڑا آپریشن ہوگا تمہارے ہاتھ کا تو۔ اسنے سنجیدگی سے اسے بتایا تھا اور وہ سچ سمجھ بیٹھی تھی۔ میں نے آپریشن نہیں کروانا۔ وہ ڈر کر بولی۔

شاید ہاتھ ہی کاٹنا پڑ جائے۔ وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔ فاطمہ دہل گئی۔ ہاتھ کٹ جائے گا۔ پھر وہ معذور ہو جائے گی۔۔۔ وہ سوچنے لگی۔ پھر ایک جھر جھری لی۔ حیدر نے بایک ایک چھوٹے سے کلینک کے سامنے روک دی۔ جس کے باہر لگے بورڈ پر جلی حروف میں انگریزی زبان میں ڈاکٹر سجاد حسین لکھا تھا۔ چلو۔ اسنے بایک روکتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ وہ لرزتے دل کیساتھ بایک سے اتری۔ حیدر نے بایک لاک کی اور کلینک کے داخلی دروازے کی جانب قدم بڑھایا۔ وہ اسکے پیچھے تھے۔ وہ دونوں آگے پیچھے کلینک میں داخل ہوئے جہاں بڑی میز کے پیچھے ایک سنجیدہ صورت ادھیڑ عمر کشمیری بیٹھا ہوا کسی مریض کا معائنہ کر رہا تھا۔

السلام علیکم ڈاکٹر صاحب۔ حیدر نے بے تکلفانہ انداز میں باآواز بلند سلام جھاڑا تو ڈاکٹر چونک کر اسکی طرف متوجہ ہوا پھر ایک خیر مقدمی مسکراہٹ اسکے چہرے پر ابھری۔

وعلیکم السلام آئیے آئیے جناب حیدر عباس صاحب۔ آج تو اس چھوٹے سے

کلینک کے بھاگ ہی جاگ گئے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر بولا تھا حیدر نے آگے بڑھ کر ہاتھ اسکی جانب بڑھایا دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ دومنٹ بیٹھیے میں اپنے مریض کو فارغ کرلوں۔ اسنے کشمیری زبان میں حیدر سے کہا جو کہ فاطمہ کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

جلدی کیجیے گا۔ میرے ساتھ بھی مریض ہیں اور انکا ہاتھ بری طرح جل گیا ہے اسنے فاطمہ کی جانب اشارہ کیا۔ ڈاکٹر کی نظر اسکے ہاتھ تک گئیں۔

اوہ نرس نرس۔۔ اسنے منہ پھیر کر ملحقہ چھوٹے سے کمرے سے نرس کا بلایا وہ بوتل کے جب کی طرح حاضر ہوئی تھی۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

جی سر۔ انکی ڈریسنگ کرنی ہے۔ حیدر انکو ادھر لائیں میں زخم دیکھوں۔ اسکے کہنے پر حیدر نے فاطمہ کو ٹھوکا دیا۔

چلو ڈاکٹر صاحب زخم دیکھیں گے۔ اسنے آہستہ آواز میں اسے بتایا تو وہ مرے مرے قدم اٹھاتی حیدر کے پیچھے چھپتی ہوئی ڈاکٹر کے میز تک آئی۔

بیٹھو۔ حیدر نے پھر اسے ٹھوکا دیا تو وہ اسٹول پر بیٹھ گئی۔ وہ باڈی گارڈ کی طرح اسکے سر پر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اسکا ہاتھ پکڑ کر زخم کا معائنہ کرنا شروع کیا۔۔

کیسے جلا۔ اسکا مخاطب حیدر تھا۔

گرم گھی سے۔ جواب بھی حیدر کی طرف سے ہی آیا تھا فاطمہ کی تو جلن کا احساس اب اور بڑھ گیا تھا۔

بہت گہرا زخم ہے کچھ دن تک باقاعدگی سے ڈریننگ کروانی ہوگی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کشمیری زبان میں حیدر کو بتایا۔ انکو ادھر دوسرے روم میں لے جائیں نرس انکی ڈریننگ کر دیتی ہیں۔ اسنے برابر والے کمرے کی جانب اشارہ کیا تو حیدر نے سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے فاطمہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ تذبذب کے عالم میں اٹھی اور اسکے پیچھے کمرے میں آئی جہاں ایک اسٹریچر اور مختلف ریکس میں دوائیں رکھی تھیں۔

بیٹھ جاؤ۔ حیدر نے اسٹریچر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ تو گئی مگر اسکے چہرے پر پھیلی گہری سنجیدگی اسے ہولائے دے رہی تھی۔

ڈاکٹر نے کیا کہا۔ اسنے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

ہاں۔ وہ ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ زخم بہت گہرا ہے آپریشن کرنا پڑے گا ابھی فوراً۔ اس نے نہایت پکا سامنہ بنا کر اسے اطلاع پہنچائی تھی جسے سن کر اسکے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تبھی نرس کمرے میں داخل ہوئی اور ڈریننگ کا سامان اٹھا کر فاطمہ کی طرف آئی۔

میں نے آپریشن نہیں کروانا۔ وہ چیخنے لگی۔ نرس نے حیرت سے اسکی طرف

دیکھا۔

آپریشن۔۔ اسنے تعجب سے دہرایا۔

ہاں تم میرا آپریشن کرنے لگی ہو مگر میں نے آپریشن نہیں کروانا۔ وہ سر زور زور سے نفی میں ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور حیدر تو ہنسی ضبط کرنے کی خاطر اس سے رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

ارے کیا ہو گیا ہے آپکو۔ اتنی سی چوٹ پر سرجری کون کرتا ہے۔ چپ کر کے ڈریسنگ کروائیں اور مریض بھی وٹینگ پر ہیں۔ وہ تنک کر بولی اور اسکا ہاتھ پکڑ کر روئی سے زخم صاف کرنے لگی۔ فاطمہ کو لگا جیسے سوئیاں چبھنے لگی ہیں اسمیں زور سے آنکھی میچ لیں۔ اندر ہی اندر وہ حیدر پر کھول رہی تھی جس نے اسکو اتنا بے وقوف بنایا تھا۔ نرس نے ڈریسنگ کرنے میں بالکل دیر نہ لگائی تھی۔ اسکے جاتے ہی وہ حیدر کی طرف متوجہ ہوئی جو سینے پر بازو لپیٹے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے کھڑا تھا۔

آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔ مجھے بے وقوف کیوں بنایا۔ اسنے لڑاکا انداز میں پوچھا۔

بے وقوف بنایا سے کیا مطلب ہے۔ وہ ہنسا تھا۔ فاطمہ پہلے تو اسکی بات سمجھ نہ سکی اور جب سمجھی تب تک وہ کمرے سے جاچکا تھا وہ دل ہی دل میں ککستی ہوئی اسکے پیچھے آئی جہاں وہ ڈاکٹر سے مخاطب تھا۔

یہ میں ایک میڈیسن لکھ کر دے رہا ہوں اگر جلن زیادہ ہو تو ایک گولی لے لیجیے گا۔ ڈاکٹر نے نسخہ لکھتے ہوئے ہدایت دی۔ پیشینٹ کا نام۔

زوجہ حیدر عباس۔ اسکے بولنے سے قبل ہی حیدر بول پڑا تھا۔ فاطمہ اتنی ثقیل اردو نہ سمجھتی تھی اس لیے الجھن آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ڈاکٹر نے نام لکھنے سے قبل ایک بھرپور مسکراہٹ حیدر کی طرف اچھالی تھی جس میں معنی خیزی کا عنصر نمایاں تھا۔ اس نے نسخہ لکھ کر حیدر کو تھمایا۔ حیدر نے اس کی فیس ادا کی اور وہ دونوں آگے پیچھے چلتے کلینک سے باہر آئے۔ مشرقی افق سے بادل گھر گھر کر آرہے تھے۔ شام کے سایے پھیلنے جو تھے۔ ٹھنڈی تیخ ہوا بدن کو چیر رہی تھی۔

چلو۔ حیدر نے بانیک کو کک مارتے ہوئے اسے مخاطب کیا تو وہ عادتاً چادر کا پلو بانیس ہاتھ میں تھام کر اسکے پیچھے بیٹھ گئی۔ بانیک سبک خرامی سے آگے بڑھی۔ آپ نے ڈاکٹر کو میرا نام کیا لکھوایا تھا۔ یکدم یاد آنے پر اس نے پوچھا

زوجہ حیدر عباس۔

زوجہ کیا۔

زوجہ یعنی بیوی۔۔ یعنی پتی۔ کمال اطمینان سے جواب دیا گیا تھا۔ فاطمہ تو بھک سے اڑ گئی۔

ارے تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہ نام لکھوانے کی۔ کباڑیے منحوس تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ روکو موٹر سائیکل روکو۔ وہ غصے کے مارے چیخی۔ حیدر نے اسکی آہ و فغاں پر ہر گز کان نہ دھرے بلکہ کان لپیٹے بانیک چلاتا رہا۔ فاطمہ نے جھلا کر اسکے شانے پہ دایاں ہاتھ رسید کیا اور خود ہی تکلیف کے مارے بلبلا کر رہ گئی۔

غصہ کیوں کرتی ہو آؤ تمہیں بہت اعلیٰ قسم کی چاٹ کھلواتا ہوں۔ اسنے اسے پچکارا تھا

زہر کھلوا دو مجھے۔ اسنے تنک کر جواب دیا۔

اوکے چاٹ میں ڈلوا دو نگا۔ اسنے اطمینان سے جواب دے کر بانیک سڑک کنارے بنے چھوٹے سے ڈھابے کی طرف موڑ دی۔ جیسے ہی بانیک ڈھابے کے سامنے رکی اسی وقت آسمان سے پہلی بوند گری تھی۔

اوہ یہ تو آہی گئی۔ چلو اندر چل کر بیٹھیں۔ حیدر نے بانیک شیڈ کے نیچے لگاتے ہوئے اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا تھا وہ ناچار اسکے ساتھ اندر چلی آئی۔ چھوٹے سے ڈھابے میں قریب ہر میز مردوں سے آباد تھی۔ بیر ادھر سے ادھر مستعدی سے کھانا سرو کرتے نظر آرہے تھے۔ فاطمہ جھجک کر حیدر کے عقب میں ہو گئی۔ سبھی کی نظریں ان دونوں کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ تبھی ایک بندہ تیزی سے کاؤنٹر سے ہٹ کر انکی جانب آیا۔

آئیں جی لیڈیز کے لیے پردے کا انتظام ہے۔ اسنے ایک دور افتادہ میز تک انکی رہنمائی کی اور انکے بیٹھتے ہی پھرتی سے میلا سا پردہ کھینچ دیا۔ اب یہ ایک چھوٹا سا کین بن گیا تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔
کیا کھاؤ گی۔

کچھ نہیں۔ وہ منہ بنا کر بولی۔

چائے اور سمو سے منگواؤں یا چاٹ ہی کھاؤ گی۔ وہ اسکی بات پر دھیان دیئے بغیر بولا۔ فاطمہ نے سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا وہ کچھ تلخ کہنا ہی چاہتی تھی کہ پردہ ہٹا کر ایک بیرا اندر داخل ہوا۔ اور مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔
یار چنا چاٹ لے آؤ خوب مصالکے والی اور دو چائے۔ اسنے آرڈر پلیس کیا وہ اسی طرح سر جھکائے پلٹ گیا۔

اب بتاؤ تم اتنا تپ کیوں رہی تھیں۔

آپ نے میرا نام کیوں بدلا۔

بدلا تو نہیں۔

کوشش تو کی ناں بدلنے کی۔

کوشش بھی نہیں کی۔ صرف تمہاری شناخت بدلی۔

آپ مجھ بیچاری کو ستا کر کیا حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ یکدم بیچارگی سے بولی۔ سبز

آنکھوں کے کنارے بھینگے لگے تو سر جھکا کر میز کی سطح کھرچنے لگی۔

ستاتا تو نہیں ہوں تمہیں۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو اپنی لگتی ہو اسلیے اپنائیت کا اظہار کرتا ہوں۔ جانے تم کیوں خفا رہتی ہو مجھ سے۔ ملائم سے لہجے میں وہ عام سے الفاظ میں کتنی خاص بات کہہ گیا تھا۔ وہ اپنا جھکا سر اٹھانہ سکی تھی۔

دیکھو فاطمہ وہاں کلینک میں تمہیں خود سے منسوب کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ کوئی تمہارے متعلق متجسس نہ ہو۔ پھر بھی اگر تمہیں برا لگا تو۔ آئم سوری۔ نرم لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ اپنے موبائل پہ مصروف ہو گیا۔ فاطمہ کچھ نہ بولی۔ بس سر جھکائے رہی۔ کچھ دیر بعد بیرا انکا آرڈر میز پر سجا گیا۔ فاطمہ نے پلیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ چاٹ دیکھنے میں ہی بے حد لذیذ لگ رہی تھی۔ اسکے منہ میں پانی آنے لگا۔ حیدر نے چمچ بھر کر اسکی جانب بڑھایا تھا۔

میں خود کھالوں گی۔

ضد مت کرو تمہارے ہاتھ میں تکلیف ہے۔

نہیں میں خود کھالوں گی۔ وہ بضد ہوئی پھر سیدھے ہاتھ میں چچ پکڑنا چاہا پر سی کر کے رہ گئی۔ بائیں ہاتھ میں چچ پکڑا ہی تھا کہ ولید یاد آ گیا۔ اسنے اسے ایکبار ہدایت کی تھی کہ شر دھا مسلمان الٹے ہاتھ سے کھانا نہیں کھاتا۔ وہ بے اختیار رک گئی اور چچ واپس رکھ دیا۔ حیدر نے چچ اسکی جانب بڑھایا تھا اور اب کی

بار اسنے چپ چاپ اسکے ہاتھ سے کھانا شروع کر دیا تھا۔ اسکے ہاتھ سے چاٹ کھاتے ہوئے بھی فاطمہ کے چہرے کے زاویے درست نہ ہو سکے تھے۔



بابا وہ اپنے کمرے میں اندھیرا کیے بیٹھا تھا جب دانیال نے دروازہ ذرا سا وا کر کے اندر جھانکا۔ وہ اپنے خیالوں سے چونکا تھا۔

جی بیٹا آجاؤ۔ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ دانیال چلتا ہوا آرام کرسی کے پاس آرکا۔

آپ اکیلے کیوں بیٹھے ہیں بابا۔ اسنے اپنی باریک سی آواز میں پوچھا۔

بس یونہی بیٹا۔ کچھ تھک گیا تھا۔ اسنے پیشانی مسلتے ہوئے جواب دیا۔

سر میں درد ہے بابا جانی۔ وہ شاید یہی سمجھا تھا۔

تھوڑا تھوڑا۔

آپ آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھیں میں آپکا سر دباتا ہوں بابا جانی۔ اسنے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسکے سینے پہ ہاتھ دھر کر اسے آرام کرسی کی پشت سے لگایا اور خود اسکے سرہانے آن کھڑا ہوا۔ جب ماما کے سر میں درد ہوتا ہے تو میں یونہی انکا سر دباتا ہوں۔ ننھے ننھے نرم ہاتھوں سے اسکا سر دباتے ہوئے وہ اسے بتا رہا تھا۔ ولید نے آنکھیں موند لیں۔

بابا آپ ہر وقت اکیلے کیوں بیٹھے رہتے ہیں۔ اسنے کچھ دیر بعد اچانک پوچھا

تھا۔ کبھی آپ ہمارے ساتھ بیٹھتے ہی نہیں کھانا بھی ہمارے ساتھ نہیں کھاتے۔

بڑی رہتا ہوں بیٹا۔ اسنے بات بنانا چاہی۔

بابا جب آپ گھر پر بھی ہوتے ہیں تو بس اپنے کمرے میں ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ آپکا ہم سب کیساتھ ٹائم گزارنے کا دل نہیں چاہتا۔ وہ بھی اسی کا بیٹا تھا بات میں سے بات نکالنے کا ماہر۔

اتنے سالوں سب سے دور رہنے کی وجہ سے شاید ایسا ہو گیا ہوں۔ اسنے بات بنائی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

آپ وہاں بالکل اکیلے تھے بابا۔ دانیال کی ذہنی رو بہکی۔
ہاں بالکل اکیلا۔ ولید کے دل میں جیسے درد جاگا تھا۔ کرب اسکے چہرے پر
لہریں لینے لگا۔

آپ کو ڈر نہیں لگتا تھا۔ اسنے معصومیت سے پوچھا تھا۔ ولید نے طویل سانس
بھری کر آنکھیں کھولیں اور گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح
آج بھی ہڈ سر پر گرائے براؤن چمکیلے بالوں سے ڈھکا ماتھا لیے معصومیت سے
اسے تک رہا تھا۔

پتہ ہے دانیال مجھے سات سال اس اندھیرے قید خانے میں تنہائی سے خوف

نہیں آیا مگر تین ماہ میں اس کمرے کی تنہائی سے میں ڈرنے لگا ہوں۔ اس نے کرب آمیز لہجے میں جواب دیا تھا۔ سیاہ آنکھوں کے کناروں میں نمی چمکی تھی۔ دانیال نا سمجھی کے عالم میں اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ ولید نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ آئی وش بیٹا کہ میں آپکی پیدائش کے دن یہاں موجود ہوتا۔ اسے خند سے بھینچے ہوئے وہ اپنی اولاد سے اپنے دل کی بات کر رہا تھا۔

اگر آپ ہوتے تو ماما بھی خوش ہوتیں وہ ہر وقت آپکو یاد کر کے روتی تھیں۔ دانیال کے جواب نے ولید کے درد کو بڑھاوا دیا تھا۔

اگر اس روز میں یہاں ہوتا تو صدیوں کے نقصان نہ ہوتے۔ زندگی تاریک نہ ہوتی۔ میری بیا۔ تمہاری ماں ہمارے ساتھ ہوتی۔۔ وہ زبان سے کچھ نہ بولا تھا بس بہتے آنسوؤں کیساتھ سوچے گیا تھا۔ سوچوں کے علاوہ اور کسی چیز پر تو اسکا اختیار نہ تھا۔



فاطمہ کے ہاتھ کی کیا حالت ہے اب۔ صبح صبح حیدر کہیں جانے کو تیار ماں سے پوچھ رہا تھا۔

ساری رات تکلیف کے مارے بے چین رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے سوئی ہے۔ انہوں نے اسے بتایا۔

ڈاکٹر نے جلن کم کرنے کے بھی تو دوا دی تھی وہ کھلائی تھی آپ نے اسے۔

ہاں بیٹا کھلا دی تھی۔ لیکن جلنے کی تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ ہی ٹھیک ہوگی۔ انہوں جواب دیا اور کھانستے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

آپ کی کھانسی کچھ دنوں سے بڑھ گئی ہے اماں۔ چلیں آپکو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔ اسنے فکر مندی سے ماں کے کمزور سے چہرے کی طرف دیکھا۔

سردیوں میں مجھے کھانسی ہو ہی جاتی ہے بیٹا۔ اسمیں تشویش والی کونسی بات ہے۔ موسم ٹھیک ہوگا تو کھانسی بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ انہوں نے نقیہ لہجے میں جواب دیا۔

اس بار آپکی کھانسی زیادہ شدید ہے اماں۔ مجھے فکر ہوتی ہے۔ آپ میری تسلی کے لیے ڈاکٹر کے پاس چلی چلیں۔ وہ ماں کے پاس زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔
 بے کار فکریں پالتا ہے تو۔ انہوں نے محبت سے اپنی واحد قیمت متاع کو دیکھا۔

کیسے فکر نہ کروں اماں۔ اس دنیا میں میرا آپ کے سوا ہے ہی کون۔ اسنے اپنے مضبوط ہاتھوں میں ماں کا زرد کمزور چہرہ تھاما تھا۔ تبھی باہر شور سا اٹھا اور وہ دونوں چونکے۔

یہ کیسا شور ہے۔ آسیہ خاتون بڑبڑائیں۔ حیدر بھی نا سمجھی کے عالم میں آوازوں پر کان دھرے ہوئے تھے۔ باہر سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے بھگدڑ مچ گئی ہو۔ یکدم فائرنگ کی آوازیں بھی سارے میں گونجنے لگیں۔ اور فضاء میں جے رام جی کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

اوہ۔۔ بھارتی فوجی۔۔ اماں آپ اندر کمرے میں جائیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیں۔ اسنے ماں کو ہدایت دی اور خود سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چھت پر بنے اپنے کمرے سے لوڈ پستول کے آیا۔ آسیہ خاتون سب تک گوگو کی کیفیت میں وہیں کھڑی تھیں۔ باہر سے آتی آوازوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ آج پھر گھر گھر گھس کر مسلمانوں کی عزتیں تار تار کی جا رہی ہیں۔

کیوں کھڑی ہیں ادھر۔ جائیں اندر کمرے میں پلینز جائیں۔

اور تو۔

میں یہیں ہوں کہیں نہیں جاتا آپ پلینز جائیں۔ اسنے منت کرنے والے انداز میں کہا تبھی انکے گھر کے بوسیدہ سے دروازے پر ضربیں پڑنے لگیں اور آن واحد میں دروازہ چوکھٹوں سے اکھڑ کر زمین بوس ہو گیا۔ بھارتی فوجیوں کے چار جوان اندر داخل ہوئے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔

ہاں بھئی مسلوں کیا شور مچا رکھا ہے تم لوگوں نے گاؤں میں۔ آزادی چاہیے۔ دوں تم لوگوں کو آزادی۔ ان میں سے ایک جس کے شانے پر میجر کی نشانیاں تھیں کرخت آواز میں بولتا ہوا آگے بڑھا۔

ہم۔۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہمیں بخش دو۔ آسیہ خاتون گر گڑائیں۔

تو چپ کر بڑھیا۔ تو بتا مسلے۔ یہ کیا شورش ہے گاؤں میں آجکل۔ اسنے اپنی گن کی نال سے حیدر کا شانہ ہلایا۔ وہ بہادری سے اسکی آنکھوں میں دیکھ رہا

تھا۔

بول۔ ایسے ٹکڑے ٹکڑے کیا گھور رہا ہے۔ اسنے پھر اسے ٹھوکا دیا تھا۔ آسیہ خاتون سہمی نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں تمہیں جواب دہ نہیں ہوں۔ اسنے پھنکارتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
واہ بہت کھوب (خوب) میجر مسکرایا۔ بڑی گرمی ہے بڑھیا تیرے بیٹے میں تو۔
اسکو کچھ نہ کہنا یہ بچہ ہے نادان ہے۔ آسیہ خاتون رونے لگیں۔ تبھی شور کی آوازیں سب کر فاطمہ بیدار ہوئی اور کمرے کے دروازے تک آئی باہر کا منظر دیکھ کر وہ گنگ رہ گئی تھی۔

نہ میں بچہ ہوں نہ نادان۔ میں ایک باشعور مسلمان ہوں اور تم لوگوں سے آزادی ہم لے کر رہیں گے۔ حیدر نے سینے پر رکھی بندوق کی نال کی پرواہ کیے بغیر بہادری سے جواب دیا تھا۔ میجر کے ہونٹوں پر محظوظ ہونے والی مسکراہٹ ابھری۔

کیا کھیال (خیال) ہے کیپٹن دُر جن اس جوشیلے کو بیٹھک کی سیر کروائی جائے۔
اسنے پلٹ کر اپنے ماتحت سے پوچھا۔ ان میں سے ایک نے شد و مد سے سر ہلایا۔

بالکل میجر اسکو ضرورت ہے۔

بڑھیا تیرے اس جوشیلے باشعور مسلمان کو ہم لے کے جارہے ہیں۔ اسنے آسیہ خاتون کو مخاطب کیا تھا۔

نہیں نہیں۔ اسنے کیا کیا ہے۔ اسکو مت لے کر جاؤ۔ وہ گرگڑائیں۔ مگر وہ سخت دل کافر کسی کی سنتے ہی کہاں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے حیدر کے منہ پر سیاہ غلاف لپیٹ کر اسے اپنے ساتھ لے گئے آسیہ خاتون پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ فاطمہ انہیں سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہونے لگی تھی۔ دوپہر تک گھر میں محلے والوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ سب آسیہ خاتون کی دلجوئی کرنے آئے تھے۔ بھارتی فوج جس جس مسلمان کو لے جاتی تھی وہ کبھی واپس نہیں آیا کرتا تھا اسلیے حیدر پر بھی فاتحہ پڑھ دی گئی تھی۔ مگر آسیہ خاتون کو یقین نہ آتا تھا وہ اپنی ساری اولاد کھو دینے کے بعد اس واحد متاع کو کھونے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھیں۔ شام ہوتے ہوتے انہیں تیز بخار نے آن لیا تھا۔ فاطمہ نے انکو دوا دی۔ اور سلا کر کمرے سے باہر نکلی۔ اسکے اپنے ہاتھ کی تکلیف جانے شعور کے کن نہاں خانوں میں جا سوئی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ شام کے دھندلے سایے رات میں ڈھل چکے تھے۔ آسمان پر پورا چاند جگمگا رہا تھا اور ہڈیوں میں اترتی خنکی بڑا پر اسرار سا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہ رات اس بستی پر بڑی سوگوار سی اتری تھی۔ حیدر ہر دل عزیز تھا اسکا یوں لے جایا جانا سب کو غمزہ کر گیا تھا۔ اور غمزہ تو وہ بھی تھی۔ اس انسان کے لیے جو جب سامنے ہوتا تھا تو وہ جی بھر کر چڑتی تھی۔ مگر آج نہیں تھا وہ تو جیسے ہر سو

بس وہی تھا۔ وہ دکھی دل کیساتھ اٹھی اور شکستہ قدموں سے چلتی زینے طے کر کے اوپری منزل پر آئی۔ حیدر کا کمرہ بالکل اداس تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار کر بجلی جلائی۔ وہ چھوٹا سا صاف ستھرا کمرہ تھا جس میں ایک پرانے طرز کا لکڑی کا بستر ایک پرانی سی لکھنے کی میز اور ایک کرسی رکھی تھی۔ اسکے علاوہ کمرے میں ایک جانب مختلف کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں لکھنے کی میز پر رجسٹروں کا ڈھیر ترتیب سے پڑا تھا اور بہت سارے قلم بھی رکھے تھے۔ پورے کمرے پر طائرانہ سی دوڑاتے دوڑاتے وہ چونکی۔ حیدر کا موبائل فون بستر پر پڑا تھا۔ اور اس کی سکرین بار بار جل بجھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور اسے ہاتھ میں لیا۔ سکرین پر اردو کے کچھ الفاظ جگمگا رہے تھے جن سے وہ نابلد تھی۔ اسنے نا سمجھی کے عالم میں سکرین پہ ہاتھ مارا اور پھر کچھ سوچ کر فون کان سے لگایا۔

ہیلو حیدر۔ دوسری جانب سے کوئی مرد بول رہا تھا۔ ایک لمحے کو وہ گڑبڑا گئی۔ ہیلو حیدر بول کیوں نہیں رہے۔ اب کی بار مرد کی آواز میں جھنجھلاہٹ نمایاں تھی۔

جی۔۔ آپ کون۔ اسنے محتاط انداز میں بات شروع کی۔

آپ کون ہیں حیدر کدھر ہے۔

وہ گھر پر نہیں ہیں۔

گھر پر نہیں۔۔ مگر اپنا موبائل کیوں گھر چھوڑ گیا وہ ایسی لاپرواہی اسنے پہلے تو کبھی نہیں کی۔

انکو بھارتی فوج پکڑ کر لے گئی۔ فاطمہ کے لبوں سے بے اختیار پھسلا تھا۔
اوہ گاڈ کب۔۔ مرد کی آواز میں شک تھا۔

آج دوپہر کو۔

گاڈ۔۔ اچھا ٹھیک ہے شکریہ۔ اللہ حافظ۔ اسنے عجلت میں کہہ کر کال منقطع کر دی تھی۔ فاطمہ نے موبائل کی سکرین کو گھورا اور پھر اسے وہیں رکھ کر کمرے کی بتی گل کر کے باہر نکلی اور کمرے کو باہر سے کنڈی لگا کر زینے طے کر کے نیچے چلی آئی۔ اسکا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔ تنہائی کا احساس جیسے پورے گھر کو اپنے چنگل میں جکڑے ہوئے تھا۔ وہ چپ چاپ کمرے میں چلی آئی اور آسیہ خاتون کے برابر لیٹ گئی۔



ولید۔ وہ صبح ناشتہ کیے بغیر ہی گھر سے نکلنے والا تھا کہ شکیلہ بیگم کے بلانے پر رک گیا اور پھر قدم بڑے کمرے کی جانب موڑ لیے۔ وہ اسکی منتظر تھیں۔

جی ممی۔

بیٹھیے۔

میں لیٹ ہو رہا ہوں مئی۔

جانتی ہوں بہت مصروف ہیں آپ۔ مگر میں آپ کی ماں ہوں آپ کے وقت پر میرا بھی حق ہے۔ بیٹھ جائیں۔ انہوں نے اب کی بار قدرے ترش روئی سے کہا تو وہ ناچار بیٹھ گیا۔

جی کہیں اب۔

آپ نے آگے کا کیا سوچا ہے ولید۔ انہوں نے تمہید باندھے بغیر پوچھا۔
کیا سوچنا ہے آگے کا۔

آپ کی شادی کے متعلق بات کر رہی ہوں میں۔
مئی پیز مجھے کوئی شادی نہیں کرنی۔ اسنے ماتھے پر بل ڈالے۔

بکواس مت کریں ولید۔ آپ کو شادی کرنا ہوگی لیلیٰ سات سالوں سے آپ کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ انکا پارہ ہائی ہوا۔

تو اس کو میں نے نہیں کہا تھا کہ میرے انتظار میں بیٹھے۔ اور میں تو بائے چانس واپس آگیا اگر میں کبھی نہ آتا تو وہ ساری زندگی کنواری بیٹھی رہتی کیا۔ وہ تیز لہجے میں بولا۔

تب اور بات ہوتی۔ مگر اب تو آپ آگئے ہیں۔ اس نے جتنی خدمت میری اور آپ کی اولاد کی ہے اسکا صلہ اسکو ضرور ملنا چاہیے۔

معاف کیجیے گا مگر اسکی خدمت میں بھی ریا کا عنصر شامل ہے۔

بس ولید۔۔ اتنا مت گرائیں خود کو میری نظروں میں۔ اس لڑکی نے تب آپکی اولاد کو گود لیا جب اسکی سگی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی۔

ممی پلیز۔ میرا بیٹا کوئی لا وارث نہیں تھا جو اس نے انسانی ہمدردی کے طور پر اسے پال لیا۔ آپ سب تھے بیا کے گھر والے تھے پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ سب نے دانیال کو لیلیٰ کی گود میں ہی کیوں ڈالا۔ اتنا سا بھی ظرف نہیں تھا آپ لوگوں کا ایک معصوم بچے کی ذمہ داری لے سکتے اور اگر آپکو اتنا ہی گراں تھا میرا بچہ تو اسے بیا کے گھر والوں کے حوالے کر دیتے یا روحی کو دے دیتے۔ اسنے بال کی کھال اتاری۔

مجھ بڈھی میں کہاں اتنا دم تھا کہ چھوٹے سے بچے کو سنبھالتی۔ شزاء کے مزاج کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ روحی کا اپنا گھر بار تھا۔ اور رہ گئے ابیہا کے گھر والے تو وہ تو اس بچے کو دیکھنے کے روادار نہ تھے پالنا تو دور کی بات۔ انہوں نے اسکے سب اعتراضات رد کر دیے تھے۔ ولید نے سر نفی میں ہلایا۔

پھر بھی لیلیٰ کی یہ فراخدلی میری سمجھ سے باہر ہے۔

آپ نے بس لیلیٰ کو دل سے برا مان لیا ہے تو انکی اچھائی کبھی آپکو متاثر نہیں کر سکتی۔

میں اسکی اچھائی سے ضرور متاثر ہو جاتا اگر اسکی اصلیت سے واقف نہ ہوتا۔

بس ولید بس۔ بہت ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپکی شادی لیلیٰ سے ہی ہوگی اور اسی ماہ میں ہوگی۔ انہوں نے حتیٰ لہجے میں کہا تھا۔

تو پھر میرا فیصلہ بھی سن لیں مئی۔ میں مر تو سکتا ہوں مگر بیا کی جگہ کسی اور عورت کو نہیں دے سکتا۔ وہ تمللا گیا۔

وہ بدکردار عورت آپکے منہ پر تھوک کر جاچکی ہے سات سال پہلے۔

مئی۔۔۔ وہ چلایا۔

چلائیں مت۔ سچ کا سامنا کریں۔ انہوں نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ وہ جواب دیئے بغیر ہی پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے چلا گیا تھا۔



تین دن سے آسیہ خاتون بخار میں پھنک رہی تھیں اور فاطمہ انہیں سنبھالنے میں ہلکان ہو رہی تھی۔ حیدر کے جانے کا صدمہ انکو جیسے دیمک کی طرح اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر گیا تھا۔ انکی جیسے جینے کی ہمت ہی ختم ہو گئی تھی۔ تیسرے روز کے اختتام پر وہ انکے سرہانے بیٹھی انکے زرد چہرے کی جانب تک رہی تھی۔

اماں۔ اسنے پیار سے انکے گال پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

ٹھیک ہو جائیں ناں اماں۔ میرا آپ کے سوا کون ہے اس دنیا میں۔ اسکی آواز

میں نمی جھلکی تھی۔

میرا حیدر۔ وہ کراہیں۔ فاطمہ کی آنکھیں جھلک اٹھیں۔

اماں میں بھی تو آپکی بیٹی ہوں ناں۔ میری کوئی فکر نہیں آپکو۔ اسنے شکوہ کیا تھا۔

تیری ہی تو فکر ہے جو جی رہی ہوں ورنہ حیدر کے بعد میری زندگی میں رہا ہی کیا ہے بیٹی۔ وہ کراہتے ہوئے بولیں۔ فاطمہ نے جھک کر انکی پیشانی چومی۔ اماں وہ آجائیں گے آپ اللہ سے اچھی امید رکھیں۔

امیدیں دم توڑ گئیں ہیں بیٹا۔ انہوں نے کرب سے آنکھیں پھر موند لیں۔ فاطمہ نے دکھ سے انکی طرف دیکھا پھر انہیں یونہی چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ چاند بھی دھند کی اوٹ میں چھپا تھا۔ وہ اوپر جاتے زینوں پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ لیے۔ اور میں سمجھتی تھی کہ اس دنیا میں مجھ سے زیادہ دکھ کسی کو نہیں ملے۔ وہ دل ہی دل میں خود سے گویا ہوئی۔ اب یہ عورت جو اندر بستر پر پڑی اپنی آکھری (آخری) سانسیں گن رہی ہے اس انتظار میں کہ شاید اسکا بیٹا لوٹ آئے اس عورت سے زیادہ دکھی بھی کوئی ہوگا۔ یا اللہ حیدر کو واپس بھیج دے۔ اس عورت کی

آکھری (آخری) امید کو ٹوٹنے نہ دینا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیئے اللہ کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔ اور وہ شاید قبولیت کا لمحہ تھا۔ صبح کے قریب بیرونی دروازے

پر مدھم سی دستک ہوئی تو وہ چونکی اسکا پورا وجود سردی سے اکڑ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر دروازے تک آئی اور کپکپائی آواز میں دریافت کیا کون ہے

حیدر عباس۔ باہر سے بتایا گیا تھا۔ ٹھک سہ کنڈی فاطمہ کے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ وہ دروازہ دھکیل کر عجلے بھرے انداز میں اندر داخل ہوا اور دروازے کو کنڈی لگا کر اسکی طرف پلٹا۔ اسکے جسم پر وہی لباس تھا جو چار دن قبل پہن رکھا تھا اور چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔

کیسی ہو فاطمہ۔ اسنے نرم لہجے میں پوچھا تھا۔

میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔ وہ جیسے خواب کے عالم میں تھی۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews
میں ٹھیک۔ اماں کہاں ہیں۔

اندر کمرے میں۔ انکی طبیعت بہت زیادہ کھراب (خراب) ہے۔ اسنے اسے بتایا۔
اوہ کیا ہوا انہیں۔

تین دن سے بخار ہے۔ اسکے بتانے پر وہ تشویش آمیز انداز میں سر ہلاتا ہوا کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی پھر کچھ سوچ کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ اسکا ہاتھ بری طرح دکھ رہا تھا۔ اب تک وہی پٹی باندھے گھوم رہی تھی۔ اسنے بائیں ہاتھ سے بمشکل لکڑیاں جلائیں اور چائے کا پانی رکھا۔

فاطمہ۔ حیدر تبھی باورچی خانے کے دروازے پر نمودار ہوا تھا وہ چونکی۔
جی۔

تمہارا ہاتھ اب کیسا ہے۔

پتہ نہیں میں نے تو پٹی ہی نہیں کھولی۔

اوہ۔ اتنے دنوں سے پٹی نہیں اتاری۔ اچھا چھوڑو یہ سب ادھر آؤ میں تمہارا
زخم دیکھوں۔ اسنے بے تکلفی سے اسکا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا وہ چپ چاپ
اسکے ساتھ چلتی باہر آنگن میں آئی اسنے زرد بلب روشن کیا اور اسے چارپائی پر
بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود اوپری منزل پر چلا گیا۔ دو منٹ بعد اسکی واپسی فرسٹ
ایڈ باکس کیساتھ ہوئی تھی۔ اسکے سامنے بیٹھ کر اسنے نرمی سے اسکا ہاتھ تھاما اور
پٹی اتارنے لگا۔

اماں کو ڈاکٹر کے پاس لیکر چلے جائیں انکی طبیعت بالکل اچھی نہیں ہے۔ اسنے
مدھم آواز میں کہا تھا۔

صبح لے کر جاؤنگا۔ ابھی دوا دے دی ہے سو رہی ہیں وہ۔ وہ مصروف سے
انداز میں جواباً بولا۔

آپ واپس کیسے آگئے۔ اسنے بے اختیار پوچھا تھا۔

واپس چلا جاؤں۔ اسکا زخم صاف کرتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرایا تھا۔

نن۔۔۔ نہیں میں نے یہ نہیں کہا۔ میں تو بس پوچھ رہی تھی۔ اسنے وضاحب
طلب انداز میں جواب دیا۔

اچھا مجھے لگا آپکو میرا واپس آنا اچھا نہیں لگا۔

نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اماں آپکو بہت یاد کر رہی تھیں اچھا ہوا آپ لوٹ
آئے۔ اب وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ اس نے جواباً سنجیدگی سے کہا۔
اور آپ یاد نہیں کر رہی تھیں مجھے۔

میں کیوں یاد کرونگی۔ اسنے برا مانا تھا۔ حیدر اسکے زخم پر دوا لگا رہا تھا۔ فاطمہ
کو جلن سی ہونے لگی۔

مجھے لگا کہ شاید آپ نے مجھ بیچارے کو یاد کیا ہوگا۔ اسنے چہرے پر مسکینیت
طاری کر کے کہا تھا فاطمہ کچھ نہ بولی۔

اب اس کو کھلا ہی رہنے دو۔ زخم پر دوا لگا کر حیدر نے اسے ہدایت کی اور
اٹھ کر ہینڈ پمپ کے طرف بڑھ گیا۔

جلن سی ہو رہی ہے۔

برداشت کرو۔ ہاتھ دھوتے ہوئے اسنے جواب دیا تھا۔

وہ میں نے آپ کو ایک بات بتانی تھی۔

کیا بات۔ وہ واپس پلٹا۔

جس دن آپکو فوج لے کر چلی گئی تھی اس دن میں آپ کے کمرے میں گئی تھی وہاں آپکا موبیل (موبائل) پڑا تھا تو اس پر کسی سے بات ہوئی تھی میری۔ اسنے جھجھکتے ہوئے اسے بتایا۔

جانتا ہوں۔ ان فیک۔ اگر تمہاری اس سے بات نہ ہوتی اور تم اسے میری گرفتاری کے متعلق نہ بتاتی تو مجھے رہائی نصیب نہ ہوتی۔ فرسٹ ایڈ باکس بند کرتے ہوئے اسنے جواباً نرم لہجے میں کہا تھا۔ فاطمہ کچھ نہ بولی تھی۔ چلو میں چائے بناتا ہوں تم پیو گی ناں چائے۔

میں بناتی ہوں۔
نہیں تم آرام سے بیٹھو تمہارے ہاتھ کی کنڈیشن ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ وہ نرم سی مسکراہٹ اسکی جانب اچھال کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ فاطمہ گم صم سی وہیں بیٹھی رہی۔



روحی پلیز اب تم می کی وکالت مت کرو میرے سامنے۔ اسنے لیپ ٹاپ کی سکرین کو گھورا جہاں روحینہ کافی تپے ہوئے تاثرات کے ساتھ موجود تھی۔

اسمیں وکالت والی کونسی بات ہے بھیا۔ یہ تو اصول کی بات ہے۔ لیلیٰ نے سات سال بے لوث خدمت کی ہے می اور دانی کی اب اگر وہ کچھ کہتی نہیں ہے تو اسکا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم اسے بے دام غلام ہی سمجھ لیں اسکا

بھی کوئی حق بنتا ہے خوشیوں پر۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔
ہاں تو جائے جا کر کر کے شادی کسی سے بھی۔ اب میں واپس آگیا ہوں اپنے
بیٹے کے پاس۔

مجھے آپ کی خود غرضی پر افسوس ہو رہا ہے بھیا۔ آپ ایسے تو نہ تھے۔
پلیز روحی۔ میں آل ریڈی بہت ذہنی دباؤ کا شکار ہوں مجھے مزید ٹینشن مت
دو۔

آپ کے اس ذہنی دباؤ کا نام ابیہا کاظم ہے۔ وہی ہے جو جب سے ہماری
زندگیوں میں آئی سب کچھ تباہ ہو گیا۔ مئی ٹھیک کہتی ہیں وہ منحوس ہے اسکی
نحوست کے سایے ہماری زندگی کی تمام خوشیوں کو نگل گئے۔ روحینہ نے
نفرت انگیز لہجے میں کہا تھا۔

شٹ اپ۔ اسنے سخت لہجے میں کہہ کر لیپ ٹاپ کی سکرن بند کردی اور سائیڈ
ٹیبل سے گلاس اٹھا کر طیش کے عالم میں زمین پر دے مارا۔ کانچ کے ٹکڑے
چھناکے کی آواز کیساتھ ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ وہ ضبط کی کڑی منزلوں سے
گزر رہا تھا۔ زندگی نے جانے اس سے اور کتنے امتحان لینے تھے۔



اگلے روز ولید کو ایک کام کے سلسلے میں ایبٹ آباد بھیجا گیا تھا وہ چند روز بعد
واپس آیا تو پھر وہی موضوع چھڑ گیا تھا۔ وہ جتنا اس سب سے بھاگنا چاہتا تھا

رہائی اتنی ہی ناممکن نظر آرہی تھی۔ وہ مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا مگر کب تک۔۔ دانیال کے مستقبل اور اسکے معصوم ذہن کو پراگندہ نہ کرنے کی خاطر اسے یہ کڑوا گھونٹ بھرنا ہی تھا۔ مگر اسکا دل اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔



آسیہ خاتون کی صحت چند دنوں میں کچھ ایسی تیزی سے گری کہ وہ تو صدیوں کی بیمار نظر آنے لگی تھیں۔ حیدر نے شہر کے اسپتال میں انکے ٹیسٹ کروائے تھے جن جی رپورٹس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ انہیں جگر کا سرطان آخری اسٹیج پر تھا۔ ڈاکٹر ز کچھ خاص پر امید نہ تھے۔ فی الحال دواؤں کا سہارا تھا مگر کب تک۔۔ وہ دن رات درد سے تڑپتی رہتیں۔ حیدر کے پاس اتنا سرمایہ تو نہ تھا کہ وہ کینسر کا مہنگا علاج کروا سکتا۔ وہ دن رات مزدوری کرنے لگا۔

تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود محض مسلمان ہونے کی بنیاد پر اسے جاب نہ مل پاتی اب تک تو وہ مختلف رسالوں جریدوں میں کالم اور مضمون نگاری کے ذریعے کچھ کماتا رہتا تھا مگر اب اسے زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی سو اسنے دن رات محنت مزدوری کو وقف کر دیئے۔ دوسری طرف فاطمہ تمام دن آسیہ خاتون کی خدمت کرتی رہتی۔ جب جب وہ درد سے کراہتی تو فاطمہ کا دل تڑپ اٹھتا۔ انکے درد کا تدارک جو دوا تھی وہ اتنی مہنگی تھی کہ حیدر ک دن رات کی محنت کے بعد جتنا کماتا وہ اسی میں خرچ ہو جاتا۔ فاقوں کی نوبت بھی آن پہنچتی

مگر وہ دونوں خود تو فاقہ کر لیتے مگر آسیہ خاتون کو تکلیف میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ حیدر جاب کے لیے بھی کوشش کر رہا تھا مگر جانے کیوں کہیں بھی بات ہی نہ بن پاتی۔ اسی طرح تین ماہ بیت گئے۔ آسیہ خاتون ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھیں۔ حیدر نے انکو سرکاری اسپتال میں داخل کروانے کی تجویز دی مگر وہ کسی طور نہ مانتی تھیں۔ ایک روز شام کے وقت انکی درد میں کچھ کمی واقع ہوئی تو انہوں نے فاطمہ کو حیدر کو بلانے کو کہا۔ وہ جھٹ سے اسے بلا لائی تھی۔ انہوں نے فاطمہ کو کچھ دیر باہر جانے کا کہا وہ اپنے بیٹے سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ چپ چاہ کمرے سے چلی گئی۔ حیدر ماں کے پاس آ بیٹھا۔

حیدر میری زندگی کا کچھ پتہ نہیں بیٹا۔ وہ کراہتے ہوئے بولیں۔

اماں پلیز ایسا نہ کہیں۔ وہ تڑپ اٹھا۔

میرے بعد فاطمہ اکیلی رہ جائے گی بیٹا۔ وہ تمہارے ساتھ اس گھر میں بغیر کسی رشتے کے نہیں رہ سکتی دنیا اسے جینے نہیں دے گی۔ وہ اسکی بات پر دھیان دیئے بغیر بولیں۔ وہ کچھ نہ بولا بس ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنی قریب المرگ ماں کا چہرہ دیکھتا رہا۔

میری مرنے سے پہلے یہی خواہش ہے بیٹا کہ تم فاطمہ سے نکاح کر لو۔ اسے اپنا لو تاکہ اس دکھاری کو بھی اپنی چھت نصیب ہو جائے وہ اس دنیا میں بے آسرا

نہ رہے بیٹا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ تھام کر جیسے منت کی تھی۔

اماں وہ مجھے پسند نہیں کرتی یہ اس پر ظلم ہوگا کہ اسے ایک باپسندیدہ انسان کے ساتھ باندھ دیا جائے۔

وہ نا سمجھ ہے بیٹا۔ تم سمجھدار ہو مجھے یقین ہے تم اسکو خوش رکھو گے۔
اماں مگر۔۔

میری آخری سمجھ کر اس سے نکاح کر لو بیٹا۔ وہ مجھے اپنی بیٹی کی طرح عزیز ہے بیٹا موت کے منہ میں جاتے ہوئے بھی مجھے اسکا خیال کھائے جا رہا ہے۔
میری مشکل آسان کر دو میرے بچے تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔ انکی آنکھوں کے کناروں پر نمی جھلکی تھی۔ حیدر نے جھک کر ماں کی پیشانی چوم لی۔
جو آپکا حکم اماں میری جان بھی آپکے لیے حاضر ہے۔ وہ نم آنکھوں سے بولا تھا۔

اسے میرے پاس بھیجو اور تم قاضی کو بلوا لاؤ۔ برابر والوں کے گھر بھی نیوتا دے دو۔ یہ نیک کام آج شام کو ہی ہو جانا چاہیے۔ وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کو تیار تھیں۔ حیدر سر ہلا کر اٹھا اور ر کمرے سے باہر نکلا۔ فاطمہ آنگن میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔

تمہیں اماں بلا رہی ہیں۔ اسنے اسے بتایا وہ چونکی اور پھر اٹھ کر کمرے میں چلی

آئی جہاں آسیہ خاتون اب تکیوں کے سہارے نیم دراز تھیں۔
جی اماں۔

پیٹا وہ کونے میں جو کالا صندوق پڑا ہے وہ کھولنا ذرا۔ انہوں نے کمرے کے
دائیں کونے کہ طرف اشارہ کیا فاطمہ نے چپ چاپ تعمیل کی۔ اس صندوق
میں کچھ زرق برق کپڑے اور ایک زیور کا ڈبہ رکھا تھا۔

یہ جو زیور کا ڈبہ اور سرخ جوڑا ہے اسے نکال لاؤ۔ انکی ہدایت پر اسنے عمل
کیا اور مطلوبہ چیزیں نکال کر بستر پر لا کے رکھیں۔

اب ادھر میرے پاس بیٹھو۔ انہوں نے اپنے برابر اشارہ کیا۔ وہ انکے پاس بیٹھ
گئی۔
Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

میری بچی تم مجھے بہت پیاری ہو بالکل اپنی زبیدی کی طرح۔ انہوں نے پیار سے
کہا تھا۔

مجھے بھی آپ بالکل اپنی ماما جیسی لگتی ہیں اگر میری ماما ہوتیں تو بالکل آپ
جیسی ہوتیں۔

میں تمہاری ماں ہی ہوں بیٹا۔ اور تم نے تو سگی اولاد سے بڑھ کر خدمت کی
ہے میری۔ ہمیشہ خوش رہو۔

اماں آپ اب جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔

بیٹا اب تو زندگی کے آخری دن شروع ہو گئے ہیں۔

ایسے مت کہیں۔ وہ تڑپ اٹھی۔

جانتی ہو یہ جوڑا اور زیور میں نے اپنے حیدر کی دلہن کے لیے بنائے تھے۔
انہوں نے اسکی بات پر کان دھرے بغیر زیور کا ڈبہ کھولا۔ ایک ہلکا سا سونے
کا سیٹ جگمگا رہا تھا۔ فاطمہ نے عدم توجہی سے اسکی طرف دیکھا۔

تم پر کتنا حجبے گا یہ۔ انہوں نے نازک سا ٹیکہ اسے ماتھے پر سجایا تھا۔ فاطمہ
گڑبڑا گئی۔

میں نے ایک فیصلہ کیا ہے بیٹا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interview
کیسا فیصلہ۔

تمہاری اور حیدر کی شادی کا فیصلہ۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی اعتراض
نہیں ہوگا۔ انہوں نے جیسے اسکی سماعتوں پہ بم گرایا تھا۔

مم۔۔۔ مگر اماں۔۔۔ میں کیسے۔۔۔

کیا مطلب تم کیسے۔

میں کیسے حیدر سے شادی کر سکتی ہوں۔ آپ جانتی ہیں میرا بلادکار ہوا تھا میں
انکے لائق نہیں ہوں اماں۔ وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

میرا بیٹا کم ظرف نہیں ہے کہ تم پر بیتے ظلم کو بنیاد بنا کر تمہیں رد کر دے۔

تم بے فکر رہو۔

مم۔۔ مگر آپ نے انکو بتادیا کیا۔

ہاں تم بس بے فکر رہو۔ اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ حیدر قاضی صاحب کو لیکر آتا ہی ہوگا۔

ابھی۔۔۔۔

ہاں ابھی۔ چلو شاباش جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ انہوں نے پیار سے کہا تھا وہ الجھے ہوئے ذہن کیساتھ اٹھ کر تیار ہو گئی۔ پھر کب قاضی صاحب اور گواہان آئے اور نکاح کی رسم ادا کی گئی کب محلے کی عورتیں آکر حیدر کا کمرہ سجا گئیں اور اسے کمرے میں پہنچا گئیں۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکی تھی۔ اسکی تو جیسے حسیات ہی مجنم ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ سن سی اسکے کمرے میں سچی سجائی مسہری پر بیٹھی تھی۔ گزشتہ چند ہی گھنٹوں نے اسکی زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ وہ لاوارث فاطمہ سے زوجہ حیدر عباس بن گئی تھی۔ مگر اسکے دل میں کوئی جذبہ بیدار نہ ہوا تھا۔ وہ گم صم تھی۔۔ یوں جیسے کسی روبوٹ کو سجا کر جملہ عروسی میں بٹھا دیا گیا ہو۔ رات بھیگ رہی تھی جب اچانک دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تھا۔ فاطمہ نے خالی خالی آنکھوں سے اسکی طرف دیکھا۔ سیاہ شلوار قمیض پر سیاہ ہی سویٹر پہنے بال سلیقے سے جمائے وہ بلاشبہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اسکی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہی خیر مقدمی مسکراہٹ جو اسکے

چہرے کا خاصا تھی۔ فاطمہ کے جذبات سرد ہی رہے۔ وہ چلتا ہوا عین اسکے سامنے آن بیٹھا۔

کیسی ہیں زوجہ حیدر عباس۔ شرارتی سے لہجے میں پوچھا گیا تھا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ مجھے افسوس ہے کہ اتنے خاص دن پر میرے پاس تمہیں دینے کے لیے سوائے خلوص و محبت کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسے چند لمحوں بعد سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ فاطمہ نے اسکی طرف دیکھا۔ وہ قریب سے دیکھنے میں اور بھی زیادہ دلکش تھا۔

اور عزت۔۔ اسکے لبوں سے بے اختیار ہی پھسلا تھا۔
عزت تو میری اور تمہاری سا عجبی ہے فاطمہ۔ اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسنے گرمجوشی سے کہا تھا۔ جانتی ہو میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اب سے نہیں تب سے جب میں نے تمہیں پہلی بار اپنے گھر میں دیکھا تھا۔ تمہاری سبز آنکھوں نے مجھے پاگل کر ڈالا فاطمہ اور تمہاری گالوں کے یہ بھنور۔۔ ان میں ڈوب کر تو ابھرنا ممکن ہی نہیں۔ اسنے شہادت کی انگلی سے اسکا گال چھوا تھا۔ اک عجیب سا احساس فاطمہ کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔
آ۔۔ آپ۔۔ وہ ہکلائی۔

ہاں کہوں ناں۔ وہ بہت مسرور تھا۔

آپ نے اماں کے مجبور کرنے پر مجھ سے شادی کی ہے ناں۔

پگی۔۔ اگر اماں نہ بھی کہتیں تو بھی مجھے ان سے یہ بات کرنا ہی تھی ہاں میں صرف یہ چاہتا تھا کہ پہلے تمہاری مرضی معلوم ہو جائے مگر تم تو ہمیشہ مرچیں چبائے رہتی تھی۔ وہ مسکرایا تھا۔ فاطمہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ اسے سب سچ بتادینا چاہتی تھی۔

تم بہت خوبصورت ہو فاطمہ۔ بالکل پریوں جیسی۔ وہ جانے اسکے حسن کے لیے کیا کہا تشبیہات تلاش کر کے لایا تھا۔ مگر اسکا ذہن تو صرف الجھا ہوا تھا۔ قبل اسکے کہ وہ جذبات کی رو میں بہک جاتا اسنے اسکے ہاتھوں کے گرفت سے اپنے ہاتھ چھڑوائے۔

مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔ اسکا لہجہ اتنا سنجیدہ تھا کہ وہ چونک گیا۔
 Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews
 کیا بتانا ہے۔

اپنی زندگی کی سچائی۔

کیسی سچائی فاطمہ سب کچھ تو جانتا ہوں میں۔

نہیں آپ سب نہیں جانتے۔ کچھ ایسا ہے جو شاید آپ واقعی نہیں جانتے۔ وہ بہت مضبوط لہجے میں بول رہی تھی۔

کیسا سچ۔۔ دیکھو اگر تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم ماضی میں کسی کو پسند کرتی تھی تو یہ میرے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ مجھے تمہاری ماضی سے کوئی سروکار

نہیں۔ اسنے جیسے بات ہی ختم کر دی تھی۔

نہیں اس سے بھی بڑی بات ہے۔

کھل کر بولو فاطمہ اسنے بھی سنجیدگی اختیار کر لی۔

میں جب ہندہ تھی تب میری سگائی ایک ہندو گھرانے میں ہو چکی تھی اور ویواہ بھی ہونے والا تھا۔ مگر پھر ادھارک میری زندگی میں آگیا اور سب بدل گیا۔ اسنے تمہید باندھی۔

اوہ تو تم اپنے منگیترا کو پسند کرتی تھی۔

نہیں۔۔۔
NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews
تو پھر۔

پھر۔۔۔ یہ کہ۔۔۔ میرے منگیترا نے میرا بلاد کار کیا تھا۔ اسنے آنکھیں بند کر کے تیزی سے اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ دہرا دیا تھا۔ حیدر بے اختیار اس سے کچھ دور ہٹا۔ اسے ادھارک سے نفرت تھی وہ سمجھتا تھا میرے اسکے ساتھ ناجائز سمبندھ ہیں اسنے اپنی بہن کی شادی میں میرے ساتھ بدتمیزی کی مگر تب میں وہاں سے بھاگ آئی مگر ایک روز اس نے مجھے کھیتوں میں روک لیا اور۔۔۔ اسکی آواز حلق میں گھٹ گئی تھی وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ حیدر کی آنکھوں میں ترحم تھا۔ وہ کچھ دیر چپ

چاپ بیٹھا اسے ہچکیاں لیتے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ آسمان پر آخری تاریخوں کا زرد رو چاند بہت اداس دکھائی دیتا تھا۔ سردی کی شدت اب کچھ کم ہو چلی تھی۔ اسنے دو چار گہری گہری سانسیں لیں پھر گھڑے سے پانی گلاس میں انڈیل کر واپس اندر چلا آیا وہ اسی طرح رو رہی تھی۔ وہ اسکے پاس چلا آیا۔

فاطمہ۔ اسنے اسکے سر پر ہاتھ رکھا۔ اسنے روتے روتے سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔ اس سے اسکی سبز آنکھوں میں کتنا درس تھا۔

لو پانی پی لی۔ اسنے گلاس اسے تھمتے ہوئے نرم لہجے میں کہا اور اسکے برابر بیٹھ گیا۔ فاطمہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے بمشکل پانی حلق سے اتارا۔ اس دوران حیدر بالکل چپ رہا تھا۔

میں نے اماں کو کہا تھا آپکو سچ بتادیں انہوں نے کہا انہوں نے بتادیا ہے۔ شاید انہوں نے آپکو اسلیے نہیں بتایا کہ آپ انکار کر دیتے۔ مگر میں جھوٹ بول کر زندگی کی نئی شروعات نہیں کر سکتی۔ وہ تیز تیز بول رہی تھی۔

اگر اماں مجھے یہ سب بتا بھی دیتیں تو بھی میرا فیصلہ فی بدلتا فاطمہ۔ وہ جب بولا تو اسکا لہجہ بالکل ہموار تھا۔ اسنے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔

م۔۔ مگر کیوں۔۔ میں آپ کے لائق نہیں ہوں میرا شریر (جسم) گندہ ہے۔

نہیں فاطمہ تم بالکل پاک ہو۔ تمہارے ساتھ جو ہوا وہ ایک بھیانک خواب تھا

اسے بھول جاؤ۔ وہ تمہارا ماضی تھا اگر تم مجھے یہ بتاتیں کہ ماضی میں تم نے اپنی مرضی سے کسی مرد کیساتھ ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے تو میں پھر بھی تمہیں ہی اپناتا کیونکہ تب تم ہدایت پر نہیں تھی۔ اور دور جاہلیت کے گناہ تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ تم نے تو کوئی گناہ کیا ہی نہیں تم تو مظلوم ہو۔ وہ کیسے نرم لہجے میں اسکی روح کے زخموں پر پھاہے رکھ رہا تھا۔ فاطمہ کی آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبانے لگیں۔

میرے لیے اہم بات یہ ہے فاطمہ کہ تم مسلمان ہو باحیا ہو میری محبت ہو بس۔ اسکی بات کے اختتام پر فاطمہ کے ضبط کے بندھن چھوٹ گئے تھے۔ وہ اسکے سینے سے لگ کر رونے لگی تھی۔ ہاں وہ اسکا اپنا تھا۔۔۔ سب سے زیادہ اپنا۔۔۔ اللہ نے اسکو کیا خوب انعام دیا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی آغوش میں اپنی زندگی کے ہر دکھ کا ماتم کر لینا چاہتی تھی کہ آج کے بعد اسے کبھی نہ رونا تھا۔



سلمیٰ کا پلاسٹر اتار دیا گیا تھا۔ وہ اب ٹھیک تھی سو کچھ دنوں بعد وہ سب اسلام آباد لوٹ آئے۔ موسم اب کافی کھل چکا تھا۔ سردی میں اب بہار کی چاشنی گھلنے لگی تھی ہر سو رنگ برنگ پھول کھل رہے تھے۔ سلمیٰ اسلام آباد واپس آکر پھر سے ڈسٹرب ہو گئی تھی۔ ایک روز اسکا دل بہت شدت سے گھبرا رہا تھا۔ رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ مسز اسلم اپنے کمرے میں تھیں اور

زین سو چکا تھا۔ وہ یونہی اٹھی اور گھر سے باہر نکل آئی۔ چوکیدار اس وقت موجود نہ تھا ورنہ وہ اسے باہر نہ جانے دیتا۔ وہ خالی الذہنی کے عالم میں سنان گلیوں میں چلتی جا رہی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ اسے کس سمت جانا ہے مگر اسکے قدم ایک جانب اٹھ رہے تھے۔ وہ جیسے ایک رو میں بہہ رہی تھی۔ اسکے قدموں کے نیچے ہموار گلیاں تھیں۔ دوپٹہ شانے پر ڈھلکا ہوا تھا بال بکھرے تھے۔ وہ سرتاپا بربادی کی داستان تھی۔۔ چلتے چلتے وہ ایک گلی سے دوسری دوسری سے تیسری میں چلی آئی تھی۔ اور پھر اسکے قدم بے اختیار تھمے۔۔ گلی میں دور ایک گھر جگمگا رہا تھا۔ اسنے بغور اس جگمگاہٹ کو گھورا پھر اسی اور چلی۔۔ گلی میں کچھ چہل پہل تھی۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ یوں جیسے وہاں کوئی فنکشن ہو رہا تھا۔ وہ آنکھوں کی ساکت پتلیوں سے اس گھر کو نظر کے احاطے میں لیے ہوئے اسی کی سمت بڑھ رہی تھی۔ اس گھر کے سامنے پہنچ کر وہ یکدم رک گئی تھی۔۔ ٹھہر گئی تھی۔ یوں جیسے کسی بھٹکے ہوئے مسافر کو اچانک منزل مل جائے مگر سفر کی تکان نے اسکی آنکھوں دھندلا اور ذہن کو اتنا پراگندہ کر دیا ہو کہ وہ اپنے سامنے کھڑی اپنی منزل کو پہچاننے میں بھی دقت محسوس کرے۔ وہ بھی کسی ایسے ہی مسافر کی طرح چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دلہن کی طرح سب سے ان در و دیوار کو تک رہی تھی۔۔ وہ بالکل ساکت کھڑی تھی یہاں تک کہ اسکی آنکھوں کی پتلیاں تک ساکت تھیں۔ دفعتاً وہ چونکی اور اسکے لب ہلے تھے۔۔ اسکا دماغ ایک نقطے پر رک گیا تھا۔۔ اسنے

یکدم آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور زور سے چلائی۔۔

ولید۔۔۔۔



وہ تین روز بعد لاہور سے لوٹا تھا اور گھر پہنچتے ہی اسکے دماغ کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ سارا گھر دلہن کی طرح سجا تھا۔ یوں جیسے کسی کی شادی کا فنکشن ہو رہا ہو۔۔۔ مگر کس کی شادی۔۔ وہ ٹھٹکا پھر جلدی سے اندر کی طرف بڑھا۔ بڑے کمرے میں کچھ خاندان کے لوگ جمع تھے وہ سب معنی خیز مسکراہٹ کیساتھ اسکی جانب متوجہ ہوئے تھے۔

لو جی دلہے میاں بھی آگئے۔ علیشا شوخی سے بولی تھی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

کون دلہا۔ وہ الجھا۔

تم اور کون۔ اب اتنے معصوم مت بنو جیسے تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تمہاری اور لیلیٰ کی شادی ہو رہی ہے۔ اسکے انکشاف نے ایک ثانیے کو تو اسے سن کر دیا تھا اگلے ہی لمحے وہ طیش کے عالم میں ماں کو پکارتا ہوا انکے کمرے میں آیا جہاں وہ دلہن بنی لیلیٰ کیساتھ موجود تھیں۔ دانیال بھی وہیں تھا۔

ممی۔۔۔ یہ کیا تماشہ ہے۔ وہ دھاڑا۔

آہستہ بولو۔

کیوں آہستہ بولوں۔ آپ میری زندگی کا تماشہ لگادیں اور میں آہستہ بولوں۔
تماشہ آپ خود لگا رہے ہیں ولید۔ وہ دبی زبان میں بولیں۔ دانیال حیران سا
باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بابا دیکھیں ماما کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔ اسنے باپ کو متوجہ کرنا چاہا تھا۔ ولید
نے ایک نفرت انگیز نظر سرخ میکسی میں جدید اسٹائل کی دلہن بنی لیلیٰ پر
ڈالی۔

یہ تمہاری ماں نہیں ہے دانیال۔ یہ ایک جھوٹی مکار عورت ہے۔ اسکا ضبط آج
جواب دے گیا تھا وہ اس جھوٹ کو نبھاتے نبھاتے تھک گیا تھا۔
ولید۔۔۔ شکلیہ بیگم چلا اٹھیں۔ لیلیٰ کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات ابھرے
تھے۔ ولید چند قدم اٹھاتا آگے بڑھا اور دانیال کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا۔
میری بات غور سے سنو دانیال یہ تمہاری ماما نہیں ہے تمہاری ماما کا نام ابیہا ہے
اور وہ کہیں گم ہو چکی ہیں۔ یہ عورت صرف ایک جھوٹی اور دھوکے باز ہے۔
دانیال کو شانوں سے تھام کر اسنے اس معصوم کو اسکی زندگی کی تلخ حقیقت
سے روشناس کروایا تھا دانیال نے گردن موڑ کر لیلیٰ کی طرف دیکھا وہ مدھم
سا مسکرائی تھی۔

آپ جھوٹ بول رہے ہیں بابا۔ میری ماما یہی ہیں۔ آپ میرے بابا نہیں۔ اس
نے یکدم خود کو ولید کی گرفت سے چھڑوایا اور بھاگ کر لیلیٰ سے لپٹ گیا۔

لیلیٰ نے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے چیخ کرتی نگاہوں سے ولید کی طرف
دیکھا۔

یو پیچ۔۔

بابا آپ میری ماما کو

abuse

مت کریں جائیں آپ۔ آپ واپس ہی نہ آتے۔ دانیال اسکا بیٹا۔ اس کے سامنے
ایک غیر عورت کی وکالت کر رہا تھا۔ ولید نے ایک زخمی نظر لیلیٰ پر ڈالی۔
اس نے اسکا سب کچھ چھین لیا تھا۔

یہ یاد رکھو لیلیٰ بی بی کہ تم سے شادی میں پھر بھی نہ کرونگا۔ میں جارہا ہوں
ممی اور اب کبھی لوٹ کر نہ آؤنگا۔ وہ سرد لہجے میں کہہ کر کمرے سے نکل
گیا تھا شکیلہ بیگم اور لیلیٰ نے اک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اسے روکو لیلیٰ میرے بیٹے کو نہ جانے دو۔

میں کیسے روکوں خالہ خود ہی آجائے گا دانیال کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ وہ
اطمینان سے بولی۔ شکیلہ بیگم بے چینی سے کمرے سے باہر نکل گئیں لیلیٰ نے
شانوں کو جنبش دی پھر کچھ سوچ کر خود بھی انکے پیچھے باہر نکلی دانیال اسکی
گود میں ہی تھا۔



ولید طیش کے عالم میں داخلی دروازہ کھول کر برآمدے میں آیا تھا تبھی اپنے نام کی زوردار پکار نے اس کے قدم جکڑے تھے۔۔ وہ پکار کیسی جانی پہچانی تھی۔۔ جیسے جیسے۔۔ اسکی ابیہا نے اسے پکارا تھا۔ وہ بے اختیار روش طے کر کے گیٹ کے قریب پہنچا۔ ایک لڑکی چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے چیخ رہی تھی۔

کون۔۔ وہ خواب کے عالم میں بولا۔ لڑکی نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔۔ اور ولید کو لگا جیسے اس کے ارد گرد گونجتی آوازیں تھم گئی۔۔

وہ اس کے سامنے تھی یوں کہ وہ اسے پہچان بھی نہیں پا رہا تھا۔۔ کمزور لاغر مدقوق۔۔ صدیوں کی بیمار ہو جیسے۔۔ اسکی آنکھوں میں ویرانی کے ڈیرے تھے۔۔ ہونٹ خشک اور چہرے کی رنگت میں زردیاں گھل چکی تھیں۔

خوبصورت بال جو کبھی گھٹنوں کو چھوتے تھے کہ جن کی خوشبو اسے مدہوش کر دیا کرتی تھی۔۔ اب کمر سے کچھ اوپر تک آتے تھے اور انکی ساری خوبصورتی جیسے کسی نے نچوڑ لی تھی۔۔ وہ کیسی اجنبی نظروں سے اس کو تک رہی تھی۔۔ ولید کو لگا اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔۔ وہ اسکی بیا نہیں ہو سکتی تھی۔۔

مگر یہ نہ تو غلط فہمی تھی نہ ہی کوئی خواب۔۔ وہ اس کے سامنے تھی اور وہ سات سال بعد اسے تک رہا تھا۔ اس کے دل کو جیسے دھکا لگا تھا وہ بے قراری سے آگے بڑھا اور اس لاغر وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔۔

بیا میری جان۔۔ وہ بس اتنا ہی کہہ پایا تھا۔



بادل چھٹ چکے تھے۔ نیلگوں آسمان دھلا دھلا سا تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں دھرتی کو منور کر رہی تھیں۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر کہیں کہیں پھوٹی ننھی ننھی کوئلیاں بہار کا پیام دے رہی تھیں اور ہوا میں گھلی میٹھی میٹھی سی چاشنی ماحول کو معطر کر رہی تھی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں وہ دن عام دنوں کی طرح طلوع ہوا تھا۔ صبح سویرے لوگ اپنے اپنے کاموں کے لیے نکلتے دکھائی دیتے اور کچے مکانوں کے باورچی خانوں سے اٹھتے دھویں میں دیسی گھی کے تازہ پراٹھوں کی مہک مدغم ہو کر فضاء میں بکھر رہی تھی۔ وہ ایک معمول کا دن تھا مگر فاطمہ اور حیدر کی زندگی میں تو جیسے دائمی بہار رت ٹھہر گئی تھی۔ شبِ عروس سے اگلی صبح ویسے بھی دلفریب اور ساحر ہوتی ہے۔ اور ان دونوں کے لیے تو یہ سحر کچھ زیادہ ہی خاص تھی۔ فاطمہ نے حیدر کی صورت میں ایسا ساتھی پایا تھا جس کی چاہ کسی بھی لڑکی کو ہو سکتی ہے اور حیدر نے فاطمہ کی صورت میں ایک ایسی صابر اور نیک بیوی پائی تھی جس کی وہ بس آرزو ہی کر سکتا تھا۔

نماز فجر اپنے شوہر کے پیچھے ادا کر کے فاطمہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو سوائے کلمہ شکر کے لبوں سے اور کچھ ادا نہ ہو سکا تھا۔ بعد نماز وہ دونوں ماں کے پاس نیچے چلے آئے۔ آسیہ خاتون بیدار ہو چکی تھیں۔ ان دونوں کو ساتھ

دیکھا تو انکے زرد چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ سفید شلوار قمیض میں نکھرا نکھرا سا حیدر اور اسکے پہلو میں کھڑی گلابی کرتے پاجامے میں کھلے بالوں اور ہلکے سے بناؤ سنگھار کیساتھ دوپٹہ شانوں پر پھیلائے مہکی مہکی سی فاطمہ۔۔ ایک مکمل جوڑی۔ انہوں نے تو دل ہی دل میں دونوں کی بلائیں لے ڈالی تھیں۔ وہ تینوں وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ برابر والی خالہ ناشتے کے لوازمات سے سچی طشت اٹھائے چلی آئیں۔

ارے خالہ یہ کیا۔۔ فاطمہ بولی۔

ناشتہ ہے بیٹا۔

خالہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ وہ شرمندہ ہوئی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

بیٹا تمہاری ساس بیمار ہیں تو کیا ہوا میں تو ہوں ناں نئی نویلی دلہن کے ناز اٹھانے کو۔ انہوں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

لیکن خالہ ناشتہ تو میں بنانے ہی لگی تھی۔ اسے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ تبھی حیدر بھی آنگن میں نکل آیا۔

السلام علیکم خالہ۔

وعلیکم السلام جیتے رہو خوش رہو۔ خالہ نے نہال ہو کر کہا۔

یہ کیا لے آئیں خالہ۔

ناشتہ ہے بیٹا۔ اب نئی نویلی دلہن ہانڈی چولہا کرتی اچھی تو نہیں لگتی اسلیے میں نے سوچا کہ اپنے بچوں کے لیے ناشتہ میں خود بنا لے جاؤں۔

بہت بہت شکریہ خالہ۔ آپ کتنی اچھی ہیں۔ اسنے دل سے شکریہ ادا کیا تھا۔ خالہ مسکرا دیں۔ ناشتہ کافی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا اسکے بعد خالہ تو اپنے گھر سدھار گئیں اور آسیہ خاتون دوا لے کر لیٹ گئیں۔ حیدر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ فاطمہ آنگن میں نکل آئی۔ ہر طرف گرد اڑ رہی تھی۔ اسنے بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں لپیٹا اور دوپٹہ سر پر باندھ کر جھاڑو سنبھال لی۔ جھاڑو لگنے کی آواز سن کر حیدر نے اوپر سے نیچے جھانکا۔

یہ کن کاموں میں لگ گئی تم۔ اسنے اوپر سے ہی آواز دے کر پوچھا تھا۔ فاطمہ نے گردن اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔

صفائی کر رہی ہوں۔

وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم کیوں کر رہی ہو یہ سب کام۔

گندا گھر اچھا نہیں لگتا۔ اسنے جواباً کہہ کر پھر سے جھاڑو سنبھال لی۔ حیدر سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے چلا آیا۔

ادھر لاؤ میں کرتا ہوں۔ اس نے جھاڑو اس کے ہاتھ سے لینا چاہی مگر فاطمہ نے یکدم ہاتھ پیچھے کر لیا۔

مرد گھر کا کام نہیں کرتے جی۔ نظریں جھکا کر جھجھکتے ہوئے بولی تھی۔ وہ مسکرایا۔

گھر کا کام کرنے سے مرد کی شان میں کمی نہیں ہو جاتی جی۔ وہ اسی کے انداز میں بولا تو وہ بے اختیار مسکرا دی۔

کتنی پیاری لگتی ہو ہنستے ہوئے۔ اسنے دونوں ہاتھوں سے نرمی سے اس کے دونوں گال تھپتھپائے تھے۔ فاطمہ کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھرنے لگے۔

یہ سب تم چھوڑو شام کو ہمارا ولیمہ ہے تم اسکی تیاری کرو۔ یہ کام برابر والی رقیہ کر دے گی۔ اسنے بلاآخر جھاڑو اس کے ہاتھ سے لے لی تھی۔

وہ تو شام کو ہے ابھی سے کیا تیاری کروں۔
ارے بھئی لڑکیوں کی تیاری تو کسی کی شادی میں ختم ہونے پر نہیں آتی یہ تو تمہاری اپنی شادی ہے۔ وہ مسکرایا۔

مجھے گہنوں کپڑوں کا اتنا شوق نہیں ہے۔

تمہیں ان سب کی ضرورت بھی تو نہیں ہے۔ ایسے ہی اتنی حسین ہو۔ وہ سنجیدہ ہوا تھا۔ وہ نظریں جھکا گئی۔

تم شرما رہی ہوں فاطمہ۔ وہ حیرت سے بولا پھر ہنسنے لگا۔ وہ سچ مچ شرما کر گلال ہو رہی تھی۔

یقین نہیں آرہا مجھے کہ یہ وہی لڑکی ہے جو ہر وقت شمشیر برہنہ بنی رہتی تھی۔ وہ اب اسے چھیڑ رہا تھا۔

کیا بنی رہتی تھی۔۔ اسنے نا سمجھی کے عالم میں اسکی طرف دیکھا۔
شمشیر برہنہ یعنی ننگی تلوار تیز دھار والی جو ایک ہی وار میں سر قلم کر دے۔
میں نے آپکو کبھی کچھ نہیں کہا۔ آپ یونہی۔۔

سفید جھوٹ۔ اس دن چھت پر مجھے کس نے ڈانٹا تھا۔ اور اس دن رات کو یہاں اسی جگہ کھڑے ہو کر کس نے مجھے کھری کھری سنائی تھیں اور مجھے کباڑیا کون کہتا تھا۔ وہ ایک اک کر کے اسکے ستم گنوا رہا تھا۔
اچھا ناں وہ پرانی بات ہے تب میں آپکو جانتی نہیں تھی۔
اچھا اور اب جانتی ہو۔ وہ اسکی جانب جھکا تھا۔ فاطمہ نے نظریں اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔ اسکی سبز آنکھوں میں سکون کا ڈیرہ تھا۔
جی۔۔ وہ مدھم سا بولی تھی۔

تو پھر تم نے مجھے کیسا پایا۔

بہت اچھا۔۔ سب سے اچھا۔ اس نے سچے دل سے کہا تھا۔ حیدر نے اسکے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسکی آنکھوں میں جھانکا۔

تم میرے ساتھ خوش ہو ناں فاطمہ۔ اسکا سوال سنجیدگی لیے ہوا تھا۔

میں بہت مطمئن ہوں۔ اسکا چہرہ اسکے لہجے کی سچائیوں کا گواہ تھا۔ وہ کھل کر مسکرایا۔

اچھا چلو یہ دوپٹہ کھولو سر سے پکی جمعدارنی لگ رہی ہو۔ وہ یکدم ٹون بدل کر شرارت آمیز لہجے میں بولا تو وہ ہنس دی۔ دوپٹے کی بندش کھول کر اسے گلے میں ڈالا۔

اب ٹھیک۔

اونہوں۔ اسنے نفی میں سرہلایا اور دوپٹے کا پلو اسکے سر پر اوڑھا دیا۔ اب ٹھیک ہے۔ وہ مسکرایا تھا۔ وہ سرشار سی سر جھکا گئی۔



سارے مجمع پر جیسے سکوت طاری ہو گیا تھا۔ برآمدے میں کھڑی شکیلہ بیگم لیلیٰ اور بقیہ خاندان والوں کو جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر ساکت کر ڈالا تھا۔ لیلیٰ کی گود میں حیران حیران نظروں سے اس منظر کو تکتا دانیال بھی اس جادو کا شکار لگ رہا تھا۔

تم کہاں چلی گئی تھی بیا میں نے تمہیں کتنا تلاش کیا کتنا کھوجا تمہیں۔ تم ایسی تو نہ تھی۔ اتنی بے درد۔ اتنی سفاک۔ تمہیں اک بار بھی میرا خیال نہ آیا تم نے ایکبار بھی نہ سوچا کہ میں تمہارے بغیر کیسے زندہ رہ سکوں گا۔ وہ اسے سینے سے بھینچے رو رہا تھا۔ بلک رہا تھا۔ ابہا کے وجود میں حرکت سی ہوئی اور

اسنے پوری قوت سے خود کو ولید کی گرفت سے آزاد کروایا۔
 آپ کون۔۔ وہ جب بولی تو اسکے لہجے میں کیسی بے گانگی کیسی اجنبیت تھی۔
 ولید سرتاپا کانپ گیا۔

بیا میں۔۔ اسکے لب پھڑپھڑائے۔۔ آواز حلق میں گھٹ سی گئی۔ وہ الجھن آمیز
 انداز میں اسکی جانب تک رہی تھی۔

یہ میں کدھر آگئی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی یوں جیسے کسی خواب
 کے عالم میں یہاں چلی آئی تھی۔

بیا میں تمہارا ولید۔۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اسنے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے
 تھام کر جھنجھوڑا۔ ایسا عجیب سی نظروں سے اسے تکتے لگی۔
 ولید۔۔ اسکے لبوں سے سرسراہٹ کے انداز میں آواز نکلی تھی۔

ہاں ولید۔۔ تمہارا شوہر۔۔

ولید۔۔ اب کی بار وہ قدرے زور دے کر بولی تھی۔ پھر کسی خواب کے عالم
 میں اسنے شہادت کی انگلی سے ولید کے چہرے کو چھوا۔ اسکے لمس میں کیسی
 مٹھاس تھی۔۔ ولید کو لگا جیسے سات سال بعد اسکی روح پر کسی نے مرہم رکھا
 ہو۔۔ وہ کسی سحر زدہ کی طرح اسکے چہرے کو تک رہی تھی۔۔ جیسے پہچاننے کی
 کوشش کر رہی ہو تبھی اس فسوں کو کسی کی کرخت پکار نے لمحے بھر میں توڑ

دیا۔

او میڈم جی آپ ادھر کیا کر رہی ہو۔ حلے سے چوکیدار نظر آتا وہ دراز قد ادھیڑ عمر انسان کھلے گیٹ سے سیدھا اندر چلا آیا تھا۔ ولید سمیت سبھی چونکے تھے۔ ابیہا نے پلٹ کر اسکی طرف دیکھا۔

چلو بی بی گھر چلو۔ بیگم صاحبہ سخت پریشان ہو رہی ہیں۔ چوکیدار نے ابیہا کو مخاطب کیا تھا۔

کون ہو تم۔ ولید نے کرخنگی سے پوچھا۔

میں بنگلہ نمبر چھپاسی کا چوکیدار ہوں یہ ہماری بی بی ہیں انکو بھولنے کا مرض ہے اسلیے اکثر ادھر ادھر نکل جاتی ہیں۔ اسنے جلدی سے وضاحت پیش کی۔

تمہاری بی بی۔۔ ولید نے تعجب سے دہرایا۔ یہ میری بیوی ہے سمجھے تم۔

او بھائی پاگل سمجھ رکھا ہے کیا۔ یہ ہماری بی بی ہے چلیں بی بی بڑی بیگم صاحبہ پریشان ہوتی ہوگی۔ چوکیدار نے اکھڑے اکھڑے انداز میں کہہ کر بت بنی کھڑی ابیہا کو پکارا۔ وہ چونک کر اسکی طرف متوجہ ہوئی۔

شٹ اپ تم میری بیوی پر یوں حق نہیں جما سکتے۔ ابیہا چلو تم میرے ساتھ ہم آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ اسنے ابیہا کا بازو تھاما وہ ہونقوں کی طرح اسکا منہ تاکنے لگی۔

او بھائی کیوں پرانی عورتوں کو ہاتھ لگاتا ہے کچھ شرم کرو شکل سے تو شریف آدمی لگتے ہو تم۔ چوکیدار کی غیرت جاگی۔

یہ میری بیوی ہے کوئی پرانی عورت نہیں ہے سمجھے تم۔ ولید نے بگڑے تیوروں کیساتھ ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ تبھی برآمدے میں کھڑے تماشاویوں کے ہجوم میں سے سکندر نکل کر انکی طرف چلا آیا۔

ولید میرے خیال میں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے یہ ابیہا نہیں اسکی کوئی ہمشکل ہے۔ ولید کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسنے نرم لہجے میں کہا تھا۔

پلیز بھائی میں احمق نہیں ہوں یہ ابیہا ہی ہے اس نے مجھے آواز دے کر پکارا تھا۔ میں جانتا ہوں یہ ابیہا ہی ہے۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔ اس دوران چوکیدار اکتاہٹ بھرے انداز میں ان دونوں کو تکتا رہا تھا جبکہ ابیہا بالکل گم صم سی کھڑی تھی۔

او بی بی چلو بھی کب تک ادھر کھڑے ہو کر دوسروں کے جھگڑے نمٹانے ہیں۔ چلو بڑی بیگم صاحب انتظار رہی ہیں۔ بلاخر اسنے اکتا کر ابیہا کو مخاطب کیا تھا۔ وہ ایکبار پھر چونکی۔

ہاں چلو۔ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ کر چوکیدار کے پیچھے قدم بڑھائے تھے۔ برآمدے میں کھڑی لیلیٰ کے ہونٹوں پہ آسودہ سی مسکراہٹ چمکی۔

ایہا۔۔ رکو۔ میری بات سنو۔ ولید تڑپ کر اسکے پیچھے لپکا۔

او صاحب بس کردو تھوڑی شرم کرو۔ خبردار جو اب ہمارا پیچھا کیا ہماری بڑی بیگم صاحبہ بہت بڑی بیگم ہیں پولیس کو بلوا کر ایسی چھترول کروائینگے ناں تمہاری کہ اپنی اصلی بیوی کو بھی پہچاننے سے انکار کردو گے۔ چوکیدار نے پلٹ خشمگیں انداز میں اسے گھر کا تھا۔ سکندر نے بھاگ کر ولید کا بازو تھاما اور اسے ان دونوں کا پیچھا کرنے سے روکا مگر ولید اس سے اپنا بازو چھڑوا کر تیزی سے ان دونوں کا پیچھا کرنے لگا۔ ایہا حیران حیران سی مڑ مڑ کر اسکی طرف دیکھتی اور چوکیدار کی گھر کی پر پھر چلنے لگتی۔ ولید برابر انکے پیچھے ہی رہا۔ سکندر بھی بے بسی سے اسکی رفتار کا مقابلہ کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ بلا آخر وہ لوگ کوٹھی نمبر چھیاسی کے سامنے پہنچے۔ چوکیدار نے گیٹ کھول کر ایہا کو اندر جانے کا اشارہ کیا اور پلٹ کر ولید کی طرف دیکھا۔

اوائے لگتا ہے تمہیں پولیس سے چھترول کروا کے چین آئے گا۔ جاتے ہو یا بلاؤں پولیس کو۔ اس نے ولید کو دھمکانہ چاہا جواباً ولید نے تن کر اسکی آنکھوں میں دیکھ اور پھر پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔

تمیز کے دائرے میں رہ کر بات کرو تم ایک آرمی آفیسر سے مخاطب ہو۔ چوکیدار نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

پولیس کو فون کرنا ہی پڑے گا۔ اسنے پرسوج انداز میں کہا تبھی انٹر کام کی

آواز سنائی دی اور وہ گیٹ سے ملحقہ کین میں چلا گیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد اسکی واپسی ہوئی تھی۔

چلو بیگم صاحبہ تمہیں اندر بلا رہی ہیں۔ اسنے اکھڑے اکھڑے لہجے میں اسے پیغام دیا۔ اور ساتھ ہی گیٹ بھی وا کر دیا۔ ولید جواب دیے بناء ہی اندر داخل ہوا اور پلٹ کر سکندر کی جانب دیکھے بغیر رہائشی عمارت کی طرف بڑھتا چلا آیا۔ چوکیدار ابھی بھی سایے کی طرح اسکے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ اسے ساتھ لیے لاؤنج میں آیا جہاں ایک ادھیڑ عمر سوبر سی خاتون صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ولید کو آنکھیں سکیر کر ذرا غور سے دیکھا پھر چوکیدار سے مخاطب ہوئی۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

اکرم تم اب جاؤ

بیگم صاحبہ یہ بلا وجہ سلمیٰ بی بی کے سرہو رہا ہے انکے پیچھے پیچھے ادھر تک چلا آیا۔ میں نے پولیس کی دھمکی دی تو کہہ رہا ہے آرمی کا بندہ ہوں۔ چوکیدار بناء رکے تیز رفتاری سے ولید کی کارگزاریاں بیان کرتا چلا گیا۔

اسکا نام سلمیٰ نہیں ابیہا ہے۔ ولید نے پلٹ کر کہا۔ چوکیدار جھلا کر کوئی سخت بات کہنے ہی والا تھا کہ مسز اسلم نے اسے ٹوک دیا۔

اکرم تم جاؤ میں کرتی ہوں بات۔

بیگم صاحبہ یہ ایویں ہی ہماری بی بی کے پیچھے پڑ گیا ہے پولیس کے دو چھتر

پڑینگے تو بالکل سیدھا ہو جائے گا۔ وہ بگڑ کر بولا۔ ولید نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ مسز اسلم بول پڑیں۔

ٹھیک ہے میں بات کر لیتی ہوں تم جاؤ۔ انہوں نے نرم لہجے میں کہا تو چوکیدار جانے کو پلٹ گیا مگر اسکی آنکھوں سے بے اطمینانی مترشح تھی۔

آپ شاید وہی فوجی ہیں جو چار پانچ ماہ قبل سات سال بعد بھارت سے بارڈر کراس کر کے آئے تھے۔ انہوں نے اسے پہچان لیا تھا مگر اپنے اندازے کی تصدیق چاہتی تھیں۔ ولید نے سر اثبات میں ہلایا۔

جی میں وہی ہوں۔

تشریف رکھیے میں نے آپکو کافی بار خبروں میں دیکھا ہے۔ انہوں نے خیر مقدمی مسکراہٹ کیساتھ صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ ولید پر تکلف انداز میں بیٹھ گیا اس کی نظریں بے قراری سے ابیہا کو تلاش کر رہی تھیں۔

براہ کرم آپ ابیہا کو بلوادیں۔ اسنے ملتی انداز میں کہا تھا۔

کون ابیہا۔ ادھر کوئی ابیہا نہیں رہتی۔

وہ لڑکی جو ابھی گھر آئی تھی وہ کہاں ہے۔

وہ۔۔ وہ سلمیٰ ہے میرے نواسے کی گورنس۔

واٹ گورنس۔۔ ارے میڈم وہ میری بیوی ہے ابیہا۔ براہ کرم اسے بلوا دیجیے۔

آپ ثبوت لے آئیں کہ وہ آپکی بیوی ہے۔ میں یوں تو کسی انجان آدمی کیساتھ اسکو نہیں بھیج سکتی۔ وہ میری ذمہ داری ہے۔ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔

دیکھیں آپ اسے بلا دیں یقین کریں وہ میری بیوی ہے۔ آپ اسے بلائیں اور اس سے پوچھ لیں۔ اسنے اب کی بار منت کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ مسز اسلم نے پرسوچ نگاہوں سے اسے گھورا۔ وہ ایسا انسان تو نہ تھا جس کی اس بیقراری کو چھچھور پن پر محمول کیا جاسکتا۔

ابھی تو وہ زین کے پاس ہے۔ زین کے سونے کا وقت ہے اسے سلا رہی ہے۔ وہ میری بیوی ہے آپ اسے جس بے جا میں نہیں رکھ سکتیں۔ اسنے قدرے بلند آواز میں کہا۔

ایک منٹ۔ مسز اسلم نے پرسکون انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ تمہاری بیوی ہے کیونکہ وہ تو ایک لاوارث لڑکی ہے جو پچھلے سات سالوں سے ایدھی سنٹر میں رہتی تھی۔ انکے انکشاف پر ولید کی سماعتوں پر تو جیسے بم گرا تھا۔

ایدھی سنٹر میں۔۔۔ اسنے بے یقینی سے دہرایا۔

ہاں اور وہ اپنی یادداشت کھو چکی ہے۔

پھر تو۔۔ وہ مضطربانہ انداز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میری ہی بیا ہے۔۔ اسنے نام لیکر مجھے پکارا تھا۔ دیکھیں پلیز مجھے اسکے پاس لے چلیں۔ وہ مجھے پہچان لے گی۔ وہ ساری دنیا کو بھول سکتی ہے لیکن مجھے نہیں بھول سکتی پلیز مجھے اسکے پاس لے جائیں۔ وہ غم اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں گھرا ان سے جیسے منت کر رہا تھا۔ مسز اسلم سوچ میں پڑ گئیں۔



ایہا ولید کو پہچان کر بھی پہچان نہ پاتی تھی۔ وہ ولید کا نام لیتی تھی اسکا چہرہ دیکھ کر ٹھٹھک جاتی مگر وہ اپنی گزری زندگی کا ایک اک لمحہ بھول چکی تھی۔ دوسری طرف مسز اسلم بغیر ثبوت ایہا کو ولید کی بیوی تسلیم کرنے پر تیار نہ تھیں۔ ولید نے اپنے ذرائع استعمال کر کے راتوں رات اپنے اور ایہا کے نکاح نامے کی ڈپلیکیٹ کاپی نکوالی اب مسئلہ تصویر کا درپیش تھا۔ اسکی اور ایہا کی شادی کی کوئی ایک بھی تصویر اسکے پاس نہ تھی۔ اسنے روحینہ سے رابطہ کیا وہ بھی سوچ میں پڑ گئی تھی پھر کچھ دیر بعد اسے اپنی ایک پرانی ای میل آئی ڈی کا خیال آیا جو اسنے کافی سالوں سے استعمال کرنا چھوڑ دی تھی۔ اسنے وہ آئی ڈی کھول کر دیکھا تو ایہا اور ولید کی شادی کی تمام تصاویر مل گئیں روحینہ نے پہلی فرصت میں وہ تصاویر ولید کو فارورڈ کر دیں۔ اس اثناء میں ولید نے اپنے نکاح کے گواہان کو بھی گواہی پر رضامند کر لیا تھا۔ سو سارے مراحل آسانی سے طے پا گئے۔ ایدھی سنٹر سے ایہا کی کیس ہسٹری حاصل کی گئی اور وہ جس

حالت میں اسلام آباد کے ایدھی ہوم کے باہر پڑی پائی گئی تھی یہ جان کر ولید کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ ڈاکٹرز کی رپورٹ کے مطابق دوران زچگی ہی کسی شدید ذہنی جھٹکے کے باعث ایہا کے نروس سسٹم پر کافی برا اثر پڑا اور وہ اپنی زندگی کے سبھی واقعات بھول گئی۔ سوائے ولید کے نام کے اسے کچھ بھی یاد نہ تھا۔ اسکا ذہن جیسے صاف سلیٹ جیسا ہو چکا تھا جس پر کبھی کبھی ولید کے نام کا اک نقطہ ابھرتا اور ہلچل سی مچ جاتی۔۔۔ وہ ولید کیساتھ اسکے گھر چلنے پر آرام سے تیار ہو گئی تھی۔ ولید کیساتھ اسکا رویہ عجیب سا ہی تھا۔ وہ بار بار ولید کا نام بھول جاتی بار بار ولید اسکو اپنا نام بتاتا اور وہ اسے غور سے تکتے کے بعد ہلکا سا مسکرا دیتی۔ ولید کا دل خون آنسو رو رہا تھا۔ تین روز بعد وہ اسے گھر لے آیا۔ سارے گھر پر ایک سوگ کی فضاء قائم تھی۔ اسنے گاڑی پورچ میں روک کر ایہا کو نیچے اترنے کو کہا تھا اسنے چپ چاپ تعمیل کی۔ ویکم ہوم وائٹنی۔ اسکے برابر آکر رکتے ہوئے اسنے متبسم لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا ایہا نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔

اندر چلیں۔ ولید نے اسکی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ ولید نے اسکا ہاتھ تھام لیا اور اسے ساتھ لیے رہائشی عمارت کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح اسکے ساتھ چل رہی تھی۔ ولید نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ دو ہی منٹ کے وقفے کے بعد دروازہ کھلا تھا اور سامنے کھڑی لیلی کے چہرے کا رنگ ایہا کو دیکھ کر واضح تاریک پڑ گیا تھا۔

ولید۔ ابیہا کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ ولید فوراً اسکی طرف متوجہ ہوا۔
 کیا ہوا بیا۔ اسنے نرم لہجے میں پوچھا جواباً وہ کچھ نہ بولی اور بس ولید کے عقب
 میں چھپنے لگی۔ لیلیٰ ناقابل یقین نظروں سے ان دونوں کہ طرف دیکھ رہی
 تھی۔ ولید نے ابیہا کا ہاتھ تھاما اور لیلیٰ کو مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے اندر
 داخل ہوا۔ اسکا رخ اوپری منزل کو جاتے زینوں کی جانب تھا۔ جب سامنے
 والے کمرے کا دروازہ کھول کر شکلیہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔

رک جاؤ ولید۔ انہوں نے گرجدار آواز میں اسے للکارا۔ ولید رک گیا مگر پلٹا
 نہیں جبکہ ابیہا نے گردن موڑ کر انکی طرف دیکھا تھا پھر اسنے بے اختیار ہی
 ولید کا بازو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

کس کی اجازت سے اس لڑکی کو ادھر لائے ہیں آپ۔ شکلیہ بیگم نے سخت
 لہجے میں پوچھا۔

یہ میری بیوی ہے اور اسکو یہاں لانے کے لیت مجھے کسی کی اجازت کی
 ضرورت نہیں ہے۔ اسنے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر تیکھے لہجے میں کہا۔
 یہ میرا گھر ہے ولید یہاں وہی رہے گا جس کو رہنے کی اجازت میں دوں گی۔
 شکلیہ بیگم کے لہجے میں ٹھنڈک تھی۔

آپ شاید بھول رہی ہیں کہ یہ گھر ابو کے نام ہے اور باپ کے قانونی اور
 شرعی وارث انکے بچے ہی ہوتے ہیں۔ لہذا یہ گھر میرا بھی اتنا ہی ہے جتنا آپکا

ہے۔ خشک لہجے میں جواب دے کر اسنے ابیہا کی طرف دیکھ اور اوپری منزل کے زینوں پر قدم دھر دیا۔
یہ لڑکی یہاں نہیں رہ سکتی۔

ممی مجھے کسی سخت قدم پر مجبور مت کریں۔ جس حالت میں یہ مجھے واپس ملی ہے اسکی تمام تر ذمے داری آپ سب پہ عائد ہوتی ہے۔ آپ لوگوں نے اگر اس پر کوئی ظلم کیا ہے نا تو یہ یاد رکھیں کہ میں کسی کو معاف نہیں کرونگا۔ جس نے بھی میری بیوی کو آدھی رات کے وقت اس حالت میں ایدھی ہوم کے باہر پھینک دیا تھا وہ چاہے پھر کوئی بھی ہو میں اس پر رحم نہیں کھاؤنگا۔ وہ جب بولا تو اسکے لہجے میں سانپ کی سی پھپکار تھی۔ لیلیٰ ایک جانب چپ چاپ کھڑی تھی۔

یہ جھوٹی مکار ہے۔ ڈرامہ کر رہی ہے۔ شکلیہ بیگم چلائیں۔ ابیہا کی گرفت ولید کے بازو پر مزید مضبوط ہوگئی۔

بس ممی انف۔ مجھے کچھ نہیں سننا ابیہا کے خلاف چلو بیا۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور اسے ساتھ لیے زینے طے کر گیا۔ شکلیہ بیگم نے لیلیٰ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔

یہ مصیبت کہاں سے آگئی اب۔ شکلیہ بیگم بڑبڑائیں

خالہ۔۔ دانی کدھر ہے۔ لیلیٰ نے جیسے انکی بات سنی ہی نہ تھی۔

سکول گیا ہوا ہے بیٹا کیا ہو گیا ہے تمہیں صبح سے بار بار اسی کا پوچھے جارہی ہو۔ وہ جھلا گئیں۔ لیلیٰ نے سر جھٹک کر انکہ طرف دیکھا۔
میں اسے لینے جارہی ہوں۔ وہ کہتی ہوئی پلٹی۔

ابھی تو بارہ بجے ہیں دو گھنٹے انتظار کرتی رہو گی کیا۔ وہ پیچھے سے پکارتی ہی رہ گئیں مگر وہ نہ رکی تھی۔



وہ اسے ساتھ لیے اپنے کمرے میں آیا۔ وہ حیران حیران سی چاروں جانب نظریں دوڑا رہی تھی۔ ولید اسکی طرف مڑا۔

بیا! یہ ہمارا کمرہ ہے۔ یاد ہے ناں تمہیں۔ اسے نرم لہجے میں پوچھا تھا۔ ابیہا نے چونک کر اسکی طرف دیکھا یوں جیسے اسکی بات سمجھ نہ سکی ہو۔

اچھا ادھر بیٹھو۔ ولید نے اسے شانوں سے تھام کر کاؤچ پہ بٹھایا اور خود اسکے سامنے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

کچھ کھاؤ گی۔ ولید نے پوچھا۔ جواباً ابیہا نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔
پیزا آرڈر کروں۔ وہ اسے ماضی کی یادوں کی طرف لے کر جانا چاہتا تھا۔ مگر ابیہا کی آنکھوں میں سرد مہری ہی رہی۔

بیا! تمہیں یاد ہے تم مجھ سے ضد کر کے آدھی رات کو پیزا منگوایا کرتی تھی۔

اسنے اسے یاد دلانا چاہا تھا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ بے حس پتھر لی نگاہوں سے ادھر ادھر تکتی رہی۔

بیا تمہیں یاد ہے ہم روز صبح فجر کی نماز کے بعد کالونی کی سیر کو نکل جاتے تھے۔ اور واپسی پہ جو بھی کوئی اکا دکا جنرل اسٹور کھلا ملتا وہاں سے لیز لیکر کھاتے ہوئے گھر آتے تھے۔ وہ ماضی کے چمکیلے دنوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ دن جو اسکا کل سرمایہ تھے۔ مگر ابیہا تو جیسے بالکل نا آشنا تھی۔ ولید نے اسکی گود میں دھرے اسکے سرد ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے۔

کیا تمہیں کچھ بھی یاد نہیں بیا۔ وہ دکھ آمیز لہجے میں بولا تھا۔ ابیہا اب بھی چپ رہی تھی۔

تمہیں سب بھول گیا بیا۔ ہماری شادی۔۔ ہمارا گھر۔۔ ہمارا بیٹا۔ وہ ایک اک کر کے زندگی کی خوشیوں کا تذکرہ کر رہا تھا۔ وہ اب بھی چپ ہی رہی تھی۔

بیا۔۔ میری طرف دیکھو تو سہی۔ اسنے اسکے ہاتھوں کو جھٹکا دیا تھا۔ ابیہا نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔

ولید۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

ولید کی جان۔۔ ولید کی آنکھیں چھلک اٹھی تھیں۔

تم اپنا نام بھی بھول گئیں بیا۔ اسنے رندھے لہجے میں پوچھا تھا۔ ابیہا نا سمجھی کے

عالم میں اسے تک رہی تھی۔

تمہارا کیا نام ہے۔ ولید نے پوچھا۔

ولید۔۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ خواب کے عالم میں بولی تھی۔ ولید کا دل بھر آنے لگا اسنے بے اختیار اسکے برابر بیٹھتے ہوئے اسکا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔ قسمت کی کیسی ستم ظریفی تھی۔ وہ جس کو پورے پاکستان کا جغرافیہ زبانی ازبر تھا۔۔ وہ اپنا نام تک بھول چکی تھی۔۔ ہاں اسے یاد تھا بس ایک نام۔۔ وہ نام جو اسکی محبت کا نام تھا۔۔ ولید حسن کا یقین مزید پختہ ہو چلا تھا۔ اسکی بیا بے وفا ہو ہی نہیں سکتی۔۔ وہ جس کو اسکے نام کے سوا سب کچھ بھول چکا تھا۔۔ وہ بے وفا کیسے ہو سکتی تھی۔۔

NEW ERA MAGAZINE

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews



دانی۔۔ ولید نے رینگ پر ہاتھ جماتے ہوئے اسے آواز دی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد سامنے والے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ بھاگتا ہوا باہر نکلا۔

جی بابا۔ اسنے منہ اوپر اٹھا کر پوچھا۔

اوپر آؤ بیٹا آپکو کسی سے ملوانا ہے۔ ولید نے کہا تھا۔ دانیال ایکسائیٹڈ سا مسکراتا ہوا زینوں کی طرف بڑھا تبھی لیلیٰ بھی کمرے سے باہر نکلی۔

دانی چلو ہوم ورک کرلو۔ اسنے اسے پکارا تو وہ تھم گیا تھا۔

دانی آپ پہلے میری بات سن لو اسکے بعد ہوم ورک کر لینا۔ ولید نے لیلیٰ کی کو نظر انداز کیا تھا۔

اسکا ہوم ورک بہت زیادہ ہے۔ لیلیٰ نے سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔
ہوتا رہے گا بعد میں۔ ابھی ضروری امر یہ ہے کہ یہ میری بات سن لے۔
تم کو جو ضروری کام ہے اس سے میں اسکو دور ہی رکھنا چاہتی ہوں۔ لیلیٰ
سردمہری سے بولی۔ ولید زینے طے کر کے نیچے چلا آیا۔

سنو محترمہ لیلیٰ پرانی اولاد پر بہت حق جما لیا تم نے۔ اب اسکی اصل ماں آچکی
ہے سو اپنی ان مفت خدمات سے دستبردار ہو کر ہماری اولاد ہمارے حوالے
کردو۔ لیلیٰ کے عین سامنے آکر رکتے ہوئے اسنے دانت پر دانت جما کر سخت
لہجے میں اسے وارن کیا تھا۔

ہونہ ماں۔۔ جاؤ جا کر منوا لو اس سے کہ وہ اسکی ماں ہے۔ اور اگر تم نے منوا
لیا ناں ولید حسن تو وہ اس گھر میں میرا آخری دن ہوگا۔ جاؤ دانی بابا کی بات
سن لو۔ چیلنج کرنے والے انداز میں کہہ کر اسنے دانیال کو اجازت دی تھی اور
وہ اجازت پا کر پرسکون انداز میں مسکرایا تھا۔

چلیں بابا۔ اسنے ولید کا ہاتھ تھاما۔ ولید خشمگیں نگاہوں سے لیلیٰ کو گھورتے
ہوئے دانیال کو ساتھ لیے پلٹا اور وہ دونوں زینے طے کر کے اوپری منزل پر
آئے۔

بابا کس سے ملوانا ہے آپ نے مجھے۔ دانیال نے سرگوشی کی۔

شش چپ۔ بس آؤ۔ وہ اسے ساتھ لیے کمرے کے دروازے تک آیا۔

تم یہیں رکو میں پہلے اندر جاؤنگا پھر تمہیں بلاؤنگا۔ اوکے۔ اسنے مدھم آواز میں اسے ہدایت جاری کی تو دانیال نے سر ہلادیا۔ اسکے معصوم چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ ولید دروازہ کھوک کر اندر داخل ہوا۔ ابیہا آرام کرسی پر نیم دراز چھت کو گھور رہی تھی۔

ابیہا دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے۔ ولید نے بلند آواز میں کہا وہ چونک کر اسکی طرف متوجہ ہوئی۔ ولید نے اشارے سے دانیال کو اندر بلایا۔ یہ دیکھو ابیہا یہ تمہارا بیٹا دانیال اور دانیال یہ آپکی ماما ہیں۔ ولید نے انکشاف کیا تھا۔ دانیال نے پزل سا ہو کر باپ کی طرف دیکھا۔

میری ماما۔۔ وہ حیرت سے بولا۔ ابیہا کی نظریں دانیال کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ کسی ٹرانس کے عالم میں اپنی نشست سے اٹھی اور دانیال کے قریب آئی۔

جی بیٹا یہ آپکی ماما ہیں۔ لیلیٰ آپکی مدر نہیں ہے آپکی ریل مدر یہ ہیں۔ ولید نے اسے بتایا۔ ابیہا پیروں کے بل دانیال کے سامنے بیٹھی اور اسکے چہرے کو ہاتھ سے چھونا چاہا مگر وہ بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔

یہ میری ماما نہیں ہیں۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ ہیجانی کیفیت میں بولا۔

ایہا کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا۔

بیٹا میری بات کا یقین کرو یہی آپکی ماما ہیں۔ ولید بولا۔

آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ میری ماما نہیں ہیں۔۔۔ ماما۔ ماما۔ وہ بدتمیزی سے بولتا ہوا اونچی آواز میں لیلیٰ کو پکارتا ہوا کمرے سے باہر بھاگ گیا تھا۔

دانیال میری بات سنو۔ ولید اسکے پیچھے بھاگا مگر وہ تیزی سے زینے طے کر کے ماما ماما پکارتا نچلی منزل پر چلا گیا تھا۔ ولید نے زینے طے کرتے ہوئے دیکھا سامنے والے کمرے سے باہر نکلتی لیلیٰ نے دانیال کو گود میں اٹھا لیا تھا۔ وہ محبت سے اسکا ماتھا چوم رہی تھی۔

آپ میری ماما ہیں ناں۔ وہ آنٹی میری ماما نہیں ہیں ناں۔ وہ اس سے تصدیق چاہتا تھا۔

جی بیٹا میں ہی آپکی ماما ہوں وہ آنٹی آپکی ماما نہیں۔ وہ پر اطمینان انداز میں اسے بتا رہی تھی۔ ولید نے آخری زینے پر رک کر اس منظر کو سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

جاؤ آپ جاکر ہوم ورک کرو۔ لیلیٰ نے ایک بوسہ دانیال کی پیشانی پر ثبت کر کے اسے گود سے اتارا۔ وہ بھاگتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ ولید نے غیض و غضب کے عالم میں آگے بڑھ کر لیلیٰ کا بازو تھاما۔

تم کیا سمجھتی ہو اس طرح تم میرے بیٹے کو جیت لو گی۔ وہ تمہارا بیٹا بن جائے گا۔

جو میرا ہے اسکو جیتنے کی مجھے ضرورت ہی کیا ہے ولید حسن۔ دانیال کو میں نے سات سال قبل ہی جیت لیا تھا۔ اب تمہارے ہار مان لینے کا وقت آ گیا ہے۔ اسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے لیلیٰ نے ٹھنڈے لہجے میں کہا تھا۔ تم دانیال کے اصلی باپ ایسا دانیال کی اصلی ماں۔۔ تم دونوں مل کر بھی ایک لیلیٰ کو اسکی زندگی سے نکال نہیں سکتے۔ یہی قسمت کا پھیر ہے۔

تم کچھ بھی کر لو مگر کسی کی اولاد کو اس سے دور نہیں کر سکتی۔ یہ جان لو تم کہ دانیال چاہے تمہاری کتنی بھی طرفداری کر لے وہ میری اور ایسا کی اولاد ہے اور بلاخر اسے ہمارے پاس ہی واپس آنا ہے۔ ولید نے ایک جھٹکے سے اسکی بازو چھوڑ دی۔

دیکھیں گے۔ وہ استہزائیہ ہنسی۔ سنو ولید حسن وہ طمانچہ جو سات سال قبل تم نے میرے چہرے پر مارا تھا آج سات سال بعد اس طمانچے کا بدلہ تم سے میرے بیٹے نے لے لیا ہے تمہیں اور اس عورت کو ریجیکٹ کر کے جس کی وجہ سے تم نے مجھے ریجیکٹ کیا تھا۔ اسی کو جیت کہتے ہیں۔ وہ خشک لہجے میں کہہ کر پلٹ کر کمرے میں چلی گئی تھی۔ ولید نے بے بسی کے عالم میں بند دروازے کو گھورا۔ خود کو اس قدر بے دست و پا اسنے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔



بھیا پلیز آپ دانی کیساتھ یہ ظلم مت کریں۔ اسکی زندگی کیساتھ یہ کھیل مت کھیلیں۔ وہ معصوم لیلیٰ کو اپنی ماں سمجھتا ہے اب آپ ایسا کو اسکے سامنے کھڑا کر کے اسکی دماغی حالت کو تباہ مت کریں۔ رحم کریں اس معصوم بچے پر۔
روحینہ اسکے سامنے تھی۔ ولید نے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو گھورا۔

روحی یہ تم کہہ رہی ہو۔ تمہیں اندازہ بھی ہے بیا کی کنڈیشن کیا ہے۔ وہ کیسی قابل رحم حالت میں ہے۔

اپنی اس حالت کی ذمہ دار وہ خود ہے بھیا۔ بے حسی کا جو بیج اسنے سات سال قبل بویا تھا اب وہ ایک تناور درخت بن گیا ہے شاخ در شاخ پھیلی بے حسی کی ایک چین جو اب جاری ہی رہے گی۔ روحینہ نے کہا۔

وہ بے قصور ہے۔ جانے تم سب نے اسکے ساتھ کیا کیا کہ وہ اس حال کو پہنچ گئی۔

اوہ کم آن بھیا۔ نکل آئیں اس فینٹسی سے کہ آپکی ایسا بہت ہی نیک پاک ہے۔ پہلے مجھے بھی لگتا تھا کہ شاید وہ بے قصور ہو مگر اسکی یہ کنڈیشن دیکھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہی گنہگار ہے تبھی تو قدرت نے اسے یہ سزا دی۔ روحینہ نے تند لہجے میں کہا تھا۔

شٹ اپ روحی۔ ولید نے ترش روئی سے کہہ کر لیپ ٹاپ کی اسکرین بند کر دی

اور لیپ ٹاپ ایک سائیڈ پر رکھ کر اٹھ کے اضطراری انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ جیسے کسی بند گلی میں آن رکا تھا نہ آگے جانے کا راستہ نہ پیچھے پلٹنے کا امکان۔ اس قدر بے بسی تو اسے بھارتی قید میں بھی محسوس نہ کی تھی۔ ایہا کی بے گناہی کا واحد گواہ اسکا دل تھا اور دل کے پاس دلائل کہاں ہوا کرتے ہیں۔

اگلے روز وہ ایہا کو شہر کے مشہور نیورولوجسٹ کے پاس لے کر گیا۔ اسنے ایہا کے کچھ ٹیسٹ کیے اور انکی جانچ کے بعد اسکے علاج کا پیٹرن طے کیا۔ دوا کیساتھ اسنے ولید کو ہدایت دی تھی کہ وہ ایہا کو جانی پہچانی جگہوں پر لے کر جائے ان سب جگہوں پر جہاں اسنے ولید کیساتھ وقت گزارا تھا۔ یہ چیزیں اسکے ذہن کو سب کچھ یاد کرنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ ولید پہلی فرصت میں اسے لاہور لے آیا تھا۔ وہ اسے ہر اس جگہ پر لے کر گیا جہاں شادی کے بعد وہ جاتے رہے تھے۔ مگر ایہا کی حسیات پر چھائی بے حسی نہ دور ہوئی تھی۔ سات دن لاہور میں گزارنے کے بعد وہ ایہا کو لیے بے نیل و مرام لوٹ آیا تھا۔



صبح سے آسیہ خاتون کی طبیعت بہت خراب تھی۔ حیدر نے انکو ہسپتال لے جانے کا انتظام مکمل کر لیا تھا۔ دوپہر کے قریب وہ تینوں ہسپتال روانہ ہو گئے۔ جہاں آسیہ خاتون کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں منتقل کر لیا گیا۔ انکی حالت

بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر کچھ خاص پر امید نہ تھے۔ رات کے وقت انہوں نے حیدر کو اپنے پاس بلا کر اس سے چند باتیں کی اور رات کے کسی پہر چپ چاپ اس دنیا سے کوچ کر گئیں تھی۔ فاطمہ تو شاک کے عالم میں تھی۔ رنجور تو حیدر بھی بہت تھا مگر اسنے خود کو سنبھالا اور ماں کا جسد خاکی گاؤں لے آیا۔ اگلے روز انکی تدفین کردی گئی تھی۔ رات تک سب محلے والے بھی ایک اک کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ حیدر گھر آیا تو فاطمہ کو آنگن میں چارپائی پر گم صم انداز میں بیٹھے دیکھا۔ وہ اسکے پاس ہی چلا آیا اور اسکے برابر بیٹھ گیا۔

فاطمہ! تم نے کھانا کھایا۔
 نہیں۔۔ آپ نے کھایا۔
 نہیں۔

میں کچھ لاتی ہوں آپ کے لیے۔ وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ برابر والی خالہ اپنے گھر سے کھانا بنا کر رکھ گئی تھیں۔ فاطمہ نے وہی گرم کر لیا اور سالن پلیٹ میں نکال کر رومال میں لپیٹی روٹیاں لیے باہر آئی۔ کھانا حیدر کے سامنے رکھ کر پلٹ کر گلاس میں پانی بھی لے آئی۔ اور خود بھی بیٹھ گئی۔ وہ دونوں بلب کی زرد روشنی میں آمنے سامنے بیٹھے تھے انکے درمیان کھانا پڑا تھا۔ دونوں نے ہی اسے ہاتھ نہ لگایا تھا۔ کچھ لمحوں بعد فاطمہ نے ایک نوال توڑ کر

حیدر کے منہ کی جانب بڑھایا۔ حیدر نے بلا تامل اسکے ہاتھ سے نوالہ کھالیا اور ایک نوالہ توڑ کر اسکے منہ کی جانب بڑھایا۔ فاطمہ نے بھی تامل نہ کیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ سے کھانا کھاتے ہوئے بھی بالکل چپ تھے۔

چائے پیئیں گے۔ کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے فاطمہ نے اس سے پوچھا۔ حیدر نے نفی میں سر ہلادیا۔ فاطمہ برتن باورچی خانے میں رکھ واپس آکر بیٹھ گئی۔

فاطمہ۔

جی۔

تم کچھ کہو گی نہیں۔

کیا کہوں۔

کچھ بھی۔

کہنے کو کچھ نہیں حیدر۔ وہ طویل سانس لے کر بولی۔ پھر اسکے شانے پر ہاتھ رکھا۔

آپ اپنا دکھ مجھ سے کہہ لیں میں سب سنوں گی۔ اسکے لہجے میں بہت اپنائیت تھی۔ حیدر نے اسکے شانے سے سر ٹکا کر آنسوؤں کو بہہ جانے دیا تھا۔ فاطمہ کچھ نہ بولی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان آنسوؤں کا بہنا بہت ضروری تھا۔



یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے ولید۔ اس لڑکی کو گھر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ سکندر نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا تھا۔

وہ میری بیوی ہے سکندر بھائی۔ ولید نے اسے یاد دلایا۔

واٹ ایور۔ وہ ایک بدکردار عورت ہے اور اسکا اصل ٹھکانہ ایدھی ہوم ہی ہے۔ سکندر خشک لہجے میں بولا۔

وہ بدکردار نہیں ہے۔

یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔

تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بدکردار ہے۔ ولید نے ترکی بہ ترکی کہا۔
 جب وہ بھاگی تھی تب میں موجود تھا یہاں تم نہیں۔

آپ نے اپنی آنکھوں سے اسے بھاگتے دیکھا تھا۔

نہیں مگر وہ بھاگ تو گئی تھی دانی کو چھوڑ کر۔

میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ وہ بدکردار نہیں ہے۔

تم روشن ضمیر ہو۔ سکندر نے تلخ لہجے میں کہا۔

نہیں مگر میں ابیہا کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔

تم نے گھر کا سارا سکون برباد کر کے رکھا ہوا ہے۔ مئی الگ پریشان ہیں۔ لیلیٰ کو الگ سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ دانی کی دماغی حالت الگ متاثر ہو رہی ہے۔ آخر تم اس ایہا کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے دفع کردو اسکو۔ اب اس پاگل عورت سے تمہیں کیا حاصل۔ عقل کے ناخن لو۔ لیلیٰ سے شادی کرو اور خوشحال زندگی گزارو۔ سکندر نے بہت ہمدردی سے کہا تھا۔

دانیال میرا اور ایہا کا بیٹا ہے اور ہم فیملی ہیں لیلیٰ ایک اضافی عنصر ہے ہم تینوں کے درمیان۔ ولید بولا۔

دانیال میرا بیٹا ہے سمجھے تم۔ لیلیٰ یکدم تلملاتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ وہ تمہارا بیٹا ہے۔
تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ ایہا کا بیٹا ہے۔

اوہ جہالت کی باتیں مت کرو۔ ڈی این اے ٹیسٹ ایک منٹ میں تمہیں جھوٹا ثابت کر سکتا ہے۔

میں دانیال کو کسی کو نہیں دوں گی سمجھے تم۔ وہ چلائی۔

وہ میرا بیٹا ہے اسے اپنے ساتھ کہیں بھی لیکر جانے کے لیے مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

چلے جاؤ تم دفع ہو جاؤ۔ نکل جاؤ ہماری زندگی سے۔ لے جاؤ اس لمبے بالوں والی

چڑیل کو۔ جان چھوڑ دو میری اور دانی کی۔ وہ ہندیانی انداز میں چلا رہی تھی۔

چلاؤ شوق سے چلاؤ۔ ابھی تو تم کو اپنے بال بھی نوچنے ہیں۔ دیواروں سے سر بھی ٹکرا رہا ہے۔ دوسروں کی چیزوں پر اپنا حق جتانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ولید نے اطمینان سے کہا۔ تبھی شکیلہ بیگم بھی وہیں چلی آئیں۔

میں نے ساری زندگی دے دی تمہارے بیٹے کو اس گھر کو۔ لیلیٰ پھر چلائی۔

کس نے منتیں کی تھیں تمہاری۔ میں نے کہا تھا۔ یا ایہا نے کہا تھا۔

شرم کرو ولید۔ احسان فراموشی مت کرو۔ شکیلہ بیگم بول پڑیں۔

ممی پلیز۔ اس عورت نے ایہا کے حق پر ڈاکہ ڈالا ہے یہ دانیال کو اسکی حقیقی

ماں سے دور کر رہی ہے۔

حقیقی ماں سات سالوں سے کدھر تھی۔ سکندر بولا۔

مجھے کسی بات کا کوئی جواب نہیں دینا۔ میں ایہا اور دانیال کو لے کر یہاں سے

چلا جاؤنگا بس۔

تم دانیال کو لیکر نہیں جا سکتے۔ لیلیٰ بولی۔

یہ تم بتاؤ گی مجھے کہ میں اپنے بیٹے کو کہاں لے کر جاسکتا ہوں اور کہاں نہیں۔

اسنے تیکھی نظروں سے اسکی طرف دیکھا۔

بابا۔ دانیال کی سنجیدہ سی پکار پر وہ سبھی اسکی جانب متوجہ ہو گئے وہ دروازے

کے پاس کھڑا تھا۔

جی بیٹا۔

میری ماما کون ہیں۔ اسکا سوال بہت سادہ سا تھا مگر لیلیٰ سرتاپا کانپ گئی تھی۔

بیٹا آپکو بتایا تو تھا اس دن۔ ولید اسکے پاس آن رکا۔

تو پھر وہ آج تک کہاں تھی مجھے انہوں نے کیوں نہیں پالا۔ وہ اسکا بیٹا تھا۔

بات سے بات نکالنے والا۔

ہاں کیا بتاؤ گے اب اسے کہ اسکی ماں بھاگ گئی تھی۔ لیلیٰ بول اٹھی۔ ولید نے

پلٹ کر خشمگیں نظروں سے اسکی طرف دیکھا۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

شٹ اپ۔

بابا یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ دانیال نے پوچھا۔

تم میرے ساتھ آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں۔

دانی۔ لیلیٰ نے دوڑ کر دانیال کا بازو تھام لیا۔

مجھے بابا کی بات سننے دیں۔ اسنے سرد سے لہجے میں کہہ کر اپنی بازو لیلیٰ کی

گرفت سے چھڑوائی اور ولید کیساتھ کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ لیلیٰ مٹی کے

ڈھیر کی طرح زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

بتائیں بابا۔ دانیال نے کمرے سے باہر آتے ہی پوچھا تھا۔

بیٹا آپکی ماما بیمار تھیں وہ اتنے عرصے تک ہسپتال میں رہیں اب میں واپس آگیا ہوں اسلیے انہیں گھر لے آیا۔ وہ اپنی پاسٹ لائف کے متعلق سب کچھ بھول چکی ہیں۔ اسنے بچے کو بہلانا چاہا تھا اور بچہ بہل بھی گیا تھا۔

انکو کچھ بھی یاد نہیں بابا میں بھی نہیں۔ اسنے حیرت سے پوچھا تھا۔ ولید نے اسکی پیشانی چومی۔

بیٹا ہم مل کر انہیں سب کچھ یاد دلانیں گے۔

کیسے بابا۔

بیٹا انکو پیار کی توجہ کی ضرورت ہے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت انکے ساتھ گزارنا ہے۔

پھر وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔

جی بیٹا۔

ٹھیک ہے بابا۔ میں اب انکے ساتھ ٹائم گزارا کرونگا۔ اسنے معصومیت سے گردن ہلادی۔ ولید کو یک گونہ اطمینان محسوس ہوا۔ وہ دونوں اوپر والے کمرے میں آئے ابیہا اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھی۔ دانیال جھجھکتے ہوئے اسکے پاس جا کھڑا ہوا۔

ایہا دیکھو دانیال آیا ہے۔ تمہارا بیٹا۔ ولید نے ایہا کو پکارا تھا۔ اسنے گردن موڑ کر دانیال کی طرف دیکھا۔ وہ جھجھکتا ہوا اسکے پاس کھڑا تھا۔ نروس سے انداز میں مسکرایا۔ ایہا کے خشک لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔ اسنے اسکے پھولے پھولے گل سہلائے۔ دانیال نے اپنے ننھے ہاتھوں سے ماں کے چہرے کو چھوا۔ وہ لمس بڑا مانوس تھا۔ اسکی جھجک کچھ کم ہوئی۔

آپ ماما کے ساتھ باتیں کرو میں آتا ہوں۔ ولید نے اسکا سر سہلا کر کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ دانیال وہیں کھڑا رہا تھا۔ اسکا ذہن لفظ ماما پر اٹک گیا تھا۔ اسکے ذہن میں لفظ ماما سے بس ایک ہی عکس ابھرتا تھا اور وہ عکس لیلیٰ کا تھا۔ ایہا اس عکس کی جگہ فٹ نہ ہو پار ہی تھی۔ وہ معصوم سا بچہ شدت سے کنفیوز ہو چکا تھا۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interview



زندگی کا کام گزرنا ہے سو وہ گزر ہی جاتی ہے۔ چاہے اچھے لمحات ہوں یا برے۔

فاطمہ اور حیدر کی زندگی بھی آہستہ آہستہ نارمل ڈگر پر آہی گئی تھی۔ حیدر کے وہی شب و روز تھے آزادی کے لیے اسکی اور اسکے ساتھیوں کی جد و جہد پہلے سے بھی زیادہ زور پکڑ چکی تھی۔ اکثر وہ کئی کئی دنوں تک گھر نہ آتا تھا اور اس دوران فاطمہ اسکی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ وہ اب مکمل طور پر

ایک وفا شعار بیوی کے سانچے میں ڈھل چکی تھی۔ وہ ایک کشمیری مجاہد کی بیوی تھی اور اسکے حوصلے بہت بلند تھے۔



ولید تھک چکا تھا۔ ایسا کو کسی طور بھی ماضی کی باتیں یاد آکے نہ دے رہی تھیں۔ اب تو ڈاکٹرز بھی کہنے لگے تھے کہ ایسا کا ذہن لاشعوری طور پر حقیقتوں سے نظریں چرائے ہوئے ہیں۔ وہ خود ہی اب کچھ یاد نہیں کرنا چاہتی۔ دانیال اسکے ساتھ کافی مانوس ہو چکا تھا وہ بھی اسکے ساتھ مانوس ہو گئی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح خاموش نہ رہتی تھی مگر وہ کسی ایسے انسان کی طرح زندگی گزار رہی تھی جس کا نہ کوئی ماضی تھا نہ مستقبل۔ وہ بس حال میں جی رہی تھی۔ دانیال نے اگر ایسا کو تسلیم کر لیا تھا تو اسکے ساتھ ہی ساتھ وہ لیلیٰ کو بھی اپنی زندگی سے نکال نہیں پایا تھا۔ وہ لیلیٰ کو ماما کہہ کر ہی پکارتا تھا اسی کے پاس سوتا اسی کے ہاتھ سے کھانا کھاتا۔ وہ اب تک بھی ایسا کو ماں کہہ کر مخاطب نہ کر سکا تھا۔ مگر وہ اسکا خیال بہت رکھتا تھا۔

مگر ولید مطمئن نہ تھا۔ وہ ایسا کے ماضی کے متعلق جاننے کو بے تاب تھا وہ اسے ایک نارمل زندگی گزارتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اسنے ہزار جتن کر لیے تھے۔ اسے ہر اس جگہ لے کر گیا تھا جہاں جہاں ان دونوں نے کبھی بہترین وقت گزارا تھا۔ مگر وہ تو جیسے پتھر ہو چکی تھی۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔

ایک روز اچانک شکلیہ بیگم کو پھر سے غصے نے آن گھیرا انہوں نے ولید کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

اس گھٹیا لڑکی کو یہاں سے چلتا کرو ولید ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔
وہ کہیں نہیں جائیگی مئی۔

تم بھی دفع ہو جاؤ اسکو لیکر۔ وہ غصے میں اپنے مخصوص طرز تخاطب کو بھی بھول گئی تھیں۔

ٹھیک ہے چلا جاؤنگا۔

ولید کتنا دل جلاؤگے تم میرا اس بدکردار عورت کی وجہ سے۔
مئی پلیز۔

شٹ اپ جسٹ شٹ اپ۔ اب تک بھی تمہیں یقین نہیں آیا کہ وہ بدکردار ہے۔ ارے اسکی یہ حالت اسکی بدکرداری کی سزا ہے۔ اگر وہ نیک پارسا ہوتی تو اس حال میں نہ ہوتی۔ شکلیہ بیگم ہاتھ نچا کر بولی تھیں۔ ولید تمللا کر پلٹا اور زینے طے کر کے اوپری منزل پر آگیا۔ کمرے میں داخل ہوا تو ابیہا کو ایکوریم کے پاس چپ چاپ بیٹھے دیکھا۔ شفاف پانی میں تیرتی رنگ برنگ مچھلیوں کو تکتے ہوئے وہ بالکل گم سم تھی۔

ابیہا! اسنے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ کر کرسی سے اٹھایا۔ تم نے بولنا

ہے یا نہیں۔ مجھے ماضی کے متعلق کچھ بتاؤ گی یا نہیں۔ بولو۔ اسے جھنجھوڑتے ہوئے وہ اپنی فرسٹریشن نکال رہا تھا۔ وہ سہم گئی۔

بولو ایسا پلیز بولو۔ تم کیا چاہتی ہو میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں مر جاؤں میں۔ وہ چلا اٹھا۔ ایسا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔

نہیں مرنا نہیں۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

نہیں تم تو یہی چاہتی ہو ناں کہ میں مر جاؤں اسلیے اب میں مر جاؤں گا۔ ولید مر جائے گا اب۔ وہ اسے چھوڑ کر مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے میز پر پڑی پھلوں کی ٹوکری سے تیز دھار چاقو اٹھا لیا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

میں ولید کو مار دوں گا۔

نہیں ولید لو نہیں مارنا۔ ایسا سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

مار دوں گا میں۔ ولید نے چاقو اپنی کلائی پر رکھا۔

نہیں۔۔۔ وہ چیخ کر اسکے پاس آئی اور اس کا چاقو والا ہاتھ پکڑ لیا۔

چھوڑ دو مجھے۔ ولید نے اسے دور ہٹانا چاہا مگر وہ اپنے سر پر ہاتھ رکھے بری طرح چیخنے لگی تھی۔

نہیں مارنا ولید کو۔۔ ولید کو نہیں مارنا۔ ولید۔۔ ولید۔۔ وہ چیخنے چیخنے زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ جیسے گرد و پیش سے بیگانہ

ہو چکی تھی۔ ولید چاقو پھینک کر اسکے پاس اکڑوں بیٹھا۔

بیا۔ اسنے اسے پکارا تھا۔ مگر وہ سن کہاں رہی تھی۔

نہیں۔۔۔ ولید۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ اب سست پڑ رہی تھی۔۔۔ نڈھال ہو رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ بیہوش ہو کر ولید کے بازوؤں میں جھول گئی۔



ولید حسن کی بیوی بننا ایسا کاظم کے لیے خوش بختی کا لمحہ تھا۔ وہ ایسا مرد تھا جس کا ساتھ پانے کی خواہش ہر لڑکی کر سکتی ہے۔ اسے تو وہ بن مانگے ہی مل

گیا تھا۔ شادی کی رات اس کے منہ سے دلفریب الفاظ میں اظہارِ محبت سننے

کے بعد تو اسکا دل ہواؤں میں رقصاں ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اک دوجے کی

چاہت پا کر مخمور تھے۔ ولیمے کے فنکشن کے لیے ولید نے سیاہ رنگ کی تھیم

رکھی تھی۔ ایسا سیاہ لمبے ڈیزائنر فرائ میں بھاری سنہرا دوپٹہ سر پر سیٹ

کروائے بہت حسین نظر آرہی تھی۔ شہر کی سب سے مہنگی بیوٹیشن کے ماہر

ہاتھوں نے اسکے چہرے کو سنوار دیا تھا۔ اسکے کپڑوں سے لیکر جیولری تک

سب کچھ اسے ایلٹ کلاس کی بہو دکھا رہا تھا۔ ہاں دوپٹہ اسنے آج بھی سینے پر

پھیلا کر سر پر ذرا آگے کی جانب گھونگھٹ کے انداز میں سیٹ کروایا تھا جس پر

بیوٹیشن نے اسے رائج فیشن پر کافی لیکچر بھی دیا تھا۔ مگر وہ ان سنی کرتی گئی

تھی۔ سیاہ تھری پیس سوٹ میں شاندار سا ولید آج تو فرانس کے کسی وبونئر

جیسا دکھتا تھا۔ آرمی میس میں ہونے والا یہ شاندار فنکشن ہر لحاظ سے قابل رشک تھا۔ اور جب وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہال میں داخل ہوئے تو ہر نظر انکی جانب اٹھ گئی تھی۔ کچھ نظروں میں تعریف تھی تو کچھ میں حسد۔ کچھ میں تمسخر تھا تو کچھ میں نفرت۔۔ اپنی خوشی میں مست ایسا نفرت اور حسد سے بھری نظروں کو جج نہ کر پائی تھی اور اسے انسانوں کو جج کرنا آتا ہی کہاں تھا۔ ولیمے کے بعد امی ابو اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ رسم کے مطابق ولید کو بھی رات انکے ہاں ہی رکنا تھا۔ شزاء نے کافی ناک بھوں چڑھایا مگر ولید کسی کی سنتا کب تھا۔ وہ ان کیساتھ ہی چلا آیا۔ گھر آکر کچھ دیر چائے کا دور چلا پھر امی نے ایسا اور ولید کے لیے ایسا اور نیہا کا کمرہ سیٹ کر دیا وہ کمرہ ایسا اور نیہا کے جانے سے خالی ہی رہتا تھا۔ رات گئے کپڑے تبدیل کر کے وہ دونوں ریلیکس ہو کر بیٹھے تھے۔ ولید اسے اپنے موبائل میں لی گئی سب فنکشنز کی تصویریں دکھانے لگا۔ ہر تصویر پر کمنٹ کرتے ہوئے وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ خوشیاں ان پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ ہر شب بوجھل ہر سحر چمکیلی تھی۔۔ ولید جیسے اسکا دیوانہ تھا۔ وہ ہر لمحہ سایے کی طرح اسکے ساتھ ساتھ ہوتا۔ وہ جہاں جاتی ولید کی پر شوق نظریں اسکا پیچھا کرتی تھیں۔ شادی کے چند ہی دن بعد ولید کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور وہ اسے ساتھ لیے لاہور چلا آیا۔ یہاں آکر کینٹ ایریا میں ملے بڑے سے گھر میں شروع شروع میں تو ایسا بہت گھبرا جاتی تھی مگر آہستہ آہستہ وہ اس ماحول سے مانوس ہونے لگی۔ ولید گو کہ

یہاں آکر مصروف رہنے لگا تھا مگر اسکے لیے وہ پھر بھی وقت نکال ہی لیا کرتا تھا۔ شادی کے دوسرے ہی ماہ وہ پریگنٹ بھی ہو گئی۔ ان دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ابیہا کا یونیورسٹی میں مائیکریشن کروالیا گیا تو وہ پھر سے پڑھنے لگی۔ ڈرائیور اسے پک اینڈ ڈراپ دیتا تھا۔ مگر اب پڑھائی میں ابیہا کا دل نہ لگتا تھا۔ وہ سارا وقت اپنے آنے والے بچے کے حوالے سے سپنے بنتی رہتی۔ ولید نے خود سے بھی بڑھ کر اسکا خیال رکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دن میں کئی بار کال یا میسج کر کے اسکی خیریت دریافت کیا کرتا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار شکیلہ بیگم یا روحینہ کا فون بھی آجاتا کبھی ابیہا بھی انہیں فون کر لیا کرتی۔ امی ابو سے بھی اکثر بات ہو جاتی۔ سب کچھ بہت خوبصورت تھا۔ وہ جیسے ساتویں آسمان پر تھی۔ اسکی خوشیوں کے شیش محل پر پہلی لیلیٰ اور جمیلہ خالہ کی آمد سے پڑی۔ اور اسکے بعد تو پے در پے ضربوں نے بلاآخر اس شیش محل کو دھڑام سے زمین بوس کروا کے ہی دم لیا۔ شکیلہ بیگم کا بدلتا رویہ اسکی سمجھ سے باہر تھا۔ ان دنوں کی اسکی طبیعت بھی کچھ ایسی تھی کہ وہ کسی کو وقت نہ دے پاتی تھی۔ اور شکیلہ بیگم سارا دن اسے کاہلی اور نغمے پن کے طعنے دیا کرتیں۔ ابیہا چپ چاپ سب سنتی اور سہتی کہ اسکی طبع میں بدتمیزی کا عنصر نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے وہ سب لوگ واپس اسلام آباد سدھارے تھے۔ مگر کچھ ہی روز بعد روحی کی شادی کے سلسلے میں ولید نے اسے تو اسلام آباد بھیج دیا جبکہ خود اسکو کچھ دن بعد آنا تھا۔ یہاں آکر ابیہا کو احساس ہوا کہ سب کچھ کتنا بدل چکا

ہے۔ گھر کا ماحول اسکے لیے بالکل اجنبی بنا دیا گیا تھا مگر شکلیہ بیگم اسے کسی کام میں حصہ نہ لینے دیتیں اکثر اس سے اکھڑی اکھڑی رہتیں۔ ایسا انکے رویے کی جڑ سمجھنے سے قاصر تھی۔ بہر حال ولید آن پہنچا اور شادی کے فنکشنز شروع ہو گئے۔ مہندی کے روز شکلیہ بیگم اسے گروپ فوٹو سے نکل جانے کی ہدایت دی تو اسے شدت سے ہتک کا احساس ہوا تھا۔ مگر ولید اسکے لیے ڈٹ گیا تھا۔ پھر بقیہ فنکشنز میں بھی ایسا کو بار بار ہتک کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ ولید کے چاہتوں کے سہارے سب کچھ یہ سوچ کر سہہ گئی کہ چند دن کی بات ہے اسکے بعد تو اسے واپس لاہور چلے ہی جانا ہے۔ مگر اسے معلوم نہ تھا کہ قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ روحینہ کے ولیمے کے اگلے روز ہی ولید کی سیاچن پوسٹنگ کے آرڈر آگئے اور وہ اسے بہت سے دلاسے دے کر کچھ وعدوں کے جگنو تھما کر چلا گیا تھا۔ اسکے جانے کے بعد اسکی طبیعت مسلسل گرنے لگی۔ روحینہ ان دنوں اپنے شوہر کیساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لیے گئی ہوئی تھے جس کے بعد اسے یو ایس اے چلے جانا تھا۔ روحینہ کی پیدائش یو ایس اے کی تھی اس لیے اسے نیشنلٹی یا کاغذات کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ گھر میں ایسا کے لیے شہزاد کے طعنے اور شکلیہ بیگم کا بڑھتا ہوا غصہ ناقابل برداشت ہو جاتا تو وہ امی کے گھر چلی آتی۔ عامر سعودیہ جانے کی تیاریوں میں تھا اور ابو کے ایک دوست کے توسط سے اسکا جانا قریب قریب کنفرم ہی تھا۔ انہی دنوں ایک روز وہ گھر پہنچی تو نیہا کو امی ابو سے جھگڑتے دیکھا۔ وہ اپنے سسرال اور پھپھو کی زیادتیوں

کے باعث سخت تنگ تھی اور چاہتی تھی کہ ابو عامر کی بجائے اسے اور زبیر کو باہر بھیج دیں۔ ابو کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا۔ سو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ جس پر نہیہا بھڑک اٹھی تھی۔

آپ لوگوں کے پاس میرے لیے تو کبھی پیسہ ہوتا ہی نہیں۔

ایسی بات نہیں ہے بیٹا میں نے کونسا قبر میں ساتھ لیکر جانا ہے۔ تم میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو میرے پاس جتنا تھا میں تم دونوں کی شادیوں اور عامر کے ویزے کی مد میں خرچ کر چکا ہوں۔ دکان گروی رکھ کر میں نے پچھلے ماہ زبیر کا قرض اتارا تھا اب اور کیا کروں میں تم دونوں کے لیے۔ یہ گھر بیچ دوں۔ ابو کو بھی غصہ آگیا تھا۔

ایہا سے لے لیں ناں اتنا دولت مند شوہر ہے اسکا۔ اسکی بات پر ایک جانب چپ چاپ بیٹھی ایہا چونک اٹھی۔ ایہا تم دے دو ناں ہمیں باہر جانے کے پیسے۔ نہیہا نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا تھا۔

یہ کیوں دے۔ امی بھڑک اٹھیں۔

کیوں نہ دے۔ بہن ہے میر اور پھر اتنی امیر ہے آخر اسکا کیا جائے گا اگر مجھے آٹھ دس لاکھ روپیہ دے دے گی تو۔

آٹھ دس لاکھ۔۔ آپنی میرے پاس اتنا کیش نہیں ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں ولید ہر ماہ کو رقم جمع کرواتے تھے میں اسمیں سے باقاعدگی سے امی کو پیسے بھجواتی

رہی ہوں۔

امی آپ نے تو کبھی ہوا نہ لگنے دی مجھے اس بات کی کہ ایسا آپکو پیسے بھجواتی ہے نہ چمک کر بولی۔

تجھے کیوں بتاتی تو میری ماں ہے۔ امی نے بھی جواباً اسی لہجے میں کہا تھا۔ جب امی کو دیتی رہی ہو تو مجھے بھی دو۔ کیش نہیں تو کیا ہوا تھوڑا سا زیور بیچ دو۔ ولید نے تو تمہیں ڈائمنڈ کا ہی اتنا زیور دیا تھا۔ نہیہا کو ایک ایک چیز کا حساب تھا۔

آپی میرا صرف ایک ڈائمنڈ سیٹ اور یہ نیکلس میرے پاس ہیں باقی سب لا کر میں ہے۔

تو وہی ڈائمنڈ والا سیٹ دے دو مجھے اتنا ہیوی ہے وہ پیور وائٹ گولڈ والا۔ میرا کام چل جائے گا۔

وہ میں نہیں دے سکتی وہ آنٹی نے بری میں رکھا تھا اور انکو ایک ایک چیز کا حساب ہے۔ ولید نے دیا ہوتا تو اور بات تھی ولید مجھ سے ان چیزوں کا حساب نہیں لیتے جو انہوں نے مجھے دے دی ہوں۔

بالکل کوئی ضرورت نہیں۔ سسرال کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں۔ اور تو نہیہا چل جا اپنے گھر اب۔ شادی تو نے اپنی مرضی سے کی ہے ناں تو جاکر نبھا

بھی اب۔

امی یاد رکھنا اپنے سلوک۔ نیہا روہانسی ہو گئی۔

یہی مگر مجھ کے آنسو تو تب بھی بہاتی تھی جب زبیر سے شادی سے منع کرتے تھے ہم تجھے اب جا بھگت۔ امی کے لہجے میں بے مروتی تھی۔ نیہا نے ایک نفرت انگیز نگاہ ایہا پر ڈالی اور چلی گئی۔ ایہا شام کو گھر واپس آئی تو ایک اور شک اس کے لیے تیار تھا۔ وہ گھر میں داخل ہی ہوئی تو ہال کمرے سے آتی باتوں کی آواز میں کہیں کہیں اپنا نام سن کر بے اختیار اس کے قدم اس جانب بڑھ گئے۔ وہ دروازے کے قریب ہی رک گئی جانے کونسی طاقت نے اسے اندر جانے سے روک دیا تھا۔ اب آوازیں بہت واضح تھیں۔

ایہا کسی بھی صورت ولید کے لائق نہیں۔ یہ جمیلہ آنٹی کی آواز تھی۔

میں تو خود پچھتاتی ہوں۔ شکیلہ بیگم کی آواز نے تائید کی۔

آنٹی ولید ہی احمق ہے جو اس مڈل کلاس گھٹیا لڑکی کے جال میں پھنس گیا۔ یہ لیلیٰ کی آواز تھی۔ ایہا لرز کر رہ گئی۔

اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔ ہونہہ خاندان کو وارث جو دینے والی ہے۔ جمیلہ آنٹی بولیں۔

بس پھنس گئے ہم تو۔ شکیلہ بیگم نے آہ بھری۔

مجھے آپ سے ہمدردی ہے خالہ۔ اور ولید سے بھی۔ بیچارے نے دھوکے میں کیسی بد صورت جاہل سے شادی کر لی۔ لیلیٰ زہر اگل رہی تھی۔ ایہا کے لیے وہاں کھڑے رہنا محال ہو گیا تو وہ پلٹ کر شکستہ قدموں سے زینے طے کر کے اوپری منزل پر اپنے کمرے میں آگئی۔ ساری رات وہ وقفے وقفے سے روتی رہی ولید کا یاد کرتی رہی۔ وہ یہاں آتا تو اسکے ایک آنسو پر تڑپ اٹھتا۔ اس رات اسنے شدت سے اسے پکارا تھا اور دور پہاڑوں میں برف کے طوفان میں پھنسے ولید حسن کے دل کے اینٹینا نے بار بار محبت کے اس سگنل کو کیچ کیا تھا بارہا اسکا دل دھڑکا تھا۔ برف میں لڑھک کر موت کی پناہوں میں جاتے ہوئے آخری چہرہ اسکے ذہن کے پردے پر ایہا کا ہی ابھرا تھا۔

اگلے روز ایہا کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر وہ نیچے آئی تو لاؤنج میں بلند آواز میں ٹی وی چل رہا تھا اسنے اندر جھانکا تو شکیلہ بیگم لیلیٰ شزاء اور جمیلہ آنٹی موجود تھیں۔ وہ ابھی پلٹنے ہی والی تھی کہ شزاء نے چینل بدلا اور ایک نیوز چینل پر چلنے والی خبر نے ان سب کچھ ساکت کر دیا۔

سیاچن میں برف کے طوفان کے باعث چھ فوجی اہلکار لاپتہ۔ نیوز کاسٹر چیخ رہی تھی۔ ایہا نے بے اختیار دیوار کو تھاما۔ کچھ دیر بعد آرمی ہیڈ کوارٹر سے

اطلاعات موصول ہوئیں کہ ولید بھی لاپتہ فوجیوں کی فہرست میں شامل ہے۔ مگر تاحال اسکی شہادت کی خبر موصول نہیں ہوئی۔ گھر میں اک کھرام مچ گیا تھا۔ وہ سب کسی پتھر کی طرح ساکت و صامت ٹی وی کھولے بیٹھے تھے۔ ایہا

نے وہ رات مصلے پر گزاری تھی۔ ولید کہ زندگہ مانگتے ہوئے اسے وہ رات یاد آئی تھی جب اسی طرح دھماکے کی خبر سننے کے بعد اسنے ولید کی زندگی کی دعائیں مانگ کر رات گزاری تھی اور صبح کے وقت اسے پیام زندگی ملا تھا۔ مگر وہ رات بیت گئی تھی۔۔ کوئی امید بھرا پیام نہ آیا تھا۔ پھر بہت سارے دن بھی گزر گئے۔ ولید کی تلاش جاری رہی۔ انہی دنوں عامر کے جانے کی تاریخ آگئی اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی چلا۔ ابیہا کبھی امی ابو کے پاس رہتی کبھی سسرال۔ اسکے دل کو کسی طور قرار نہ تھا بس ایک دعا کا سہارا تھا۔ پھر یہ سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ جب ایک روز وہ شکیلہ بیگم کیساتھ ہی بیٹھ چائے پی رہی تھی کہ فون آیا اور ولید کہ شہادت کی تصدیق کردی گئی۔ یہ خبر سکندر نے باآواز بلند رندھی ہوئی آواز میں سب کو سنائی تھی۔ اور ابیہا کی سماعتوں نے اس خبر کو سنتے ہیں جیسے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اسکی کمر میں شدت کا درد اٹھا تھا اور وہ تکلیف سے چیختے ہوئے دہری ہوگئی تھی۔ پھر اسے کون ہسپتال لے کر گیا وہ وہاں کتنی دیر تکلیف کے مراحل سے گزری اسے سب کچھ کسی بھولے بسرے خواب کی طرح دھندلا یاد تھا۔۔ صرف ایک احساس اسکی مردہ حسیات میں زندہ تھا وہ تھا ولید کو کھودینے کا احساس۔۔ اور اس احساس کی افیت دردِ زہ پر بھی بھاری پڑ رہی تھی۔ اسکی کنڈیشن بہت پیچیدہ تھی۔ قبل از وقت ڈیلیوری اور وہ بھی ایسی صورتحال میں ڈاکٹرز کے لیے یہ کیس ایک چیلنج سے کم نہ تھا کیونکہ ابیہا ایک بے حس وجود تھی۔ بہر حال آپریشن سے بچے کی

پیدائش ممکن ہوئی تھی۔ منحنی سا انتہائی کمزور بچہ۔۔ ایسا تب بے ہوش تھی بچے کو فوراً نرسری بھیج دیا گیا۔ ہوش کی آخری بات جو اسے یاد رہی تھی وہ بس وہ ایک جملہ تھا جو سکندر کے منہ سے نکلا تھا۔ ولید شہید ہو گیا ہے۔



ایسا نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں تو آنکھوں پر چھائی دھند کے اس پار اسے جو چہرہ دکھائی دیا وہ بہت جانا پہچانا تھا۔ اسنے ایکبار زور سے آنکھیں بند کر کے کھولیں اور اب کی ولید کا چہرہ بالکل واضح تھا۔ اسنے بغور اس چہرے کو دیکھا پھر دھیرے سے اٹھ بیٹھی۔ ولید تشویش ناک نظروں سے اسکی جانب دیکھ رہا تھا اور وہ اسے سات سال بعد دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنا بدل گیا تھا۔ اسکی سرخ و سفید رنگت سنو لا چکی تھی۔ سیاہ چمکیلی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ چکے تھے اور وہ کچھ اندر کو دھنسی معلوم ہوتیں تھیں۔ داڑھی کے باوجود دائیں گال پر کسی گہری ضرب کا نشان ثبت ہو چکا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کافی کمزور ہو چکا تھا۔

ولید۔ وہ بے اختیار بولی۔ ولید اسے پاس آیا تھا وہ بے اختیار اسکے سینے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

شکر ہے آپ زندہ ہیں ولید میں تو ڈر گئی تھی۔ مگر یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔ اسکے چہرے کو چھوتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔ آنسو ایک تواتر سے

اسکا چہرہ بھگو رہے تھے۔ ولید کے دل کو کچھ ہونے لگا۔
شکر ہے آپ آگئے ولید۔ اب ہمارے بچے کی پیدائش تک آپ کہیں نہ جائیے
گا۔ بہت مان سے کہتے ہوئے اسنے بے اختیار ہی اپنے وجود کا جائزہ لیا پھر
چونک گئی۔۔

بیا میری بات سنو۔ اسنے یکدم اسکے دونوں ہاتھ تھام کر اسے اپنی جانب متوجہ
کیا۔ آٹھ سال بیت چکے ہیں آٹھ سال۔ ہمارا بیٹا سات سال کا ہے۔ میں بھارت
کی قید میں تھا ایک سال قبل واپس آیا ہوں۔ میرا اور تمہارا بیٹا آٹھ سال کا
ہو چکا ہے اور تم نے یہ سارا عرصہ ایدھی ہوم میں گزارا تھا۔ اسنے ایک ہی رو
میں سارے انکشاف کر ڈالے تھے۔ ایسا ہکا بکا رہ گئی۔

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ حیرتوں کی زد میں تھی۔ ولید اسکے سامنے بیٹھ گیا
اور دھیرے دھیرے اسے سب بتاتا گیا۔ برفانی طوفان۔ اسکا بھارت پہنچ جانا۔
ساڑھے چھ سال قید میں رہنا۔ پھر ایک دن بھاگ کر شردھا کے پاس پہنچنا۔
شردھا کی زندگی کے سبھی نشیب و فراز اور بالآخر اسکا مسلمان ہونا۔ حیدر کی
مدد سے بارڈر پار کرنا۔ اور یہاں آکر پیش آنے والے سب واقعات سب
کچھ۔ اور یہ سب سننے کے بعد ایسا کی پلکوں پر نمی اترنے لگی تھی۔

یعنی میں نے اپنی اولاد کو کھو دیا۔ وہ جب بولہ تو بس اتنا۔ اسکی آواز میں کتنے
دکھ رو رہے تھے۔

وہ ہمارا بیٹا ہے بیا اسکو ہم سے کوئی نہی چھین سکتا۔ لیلی جیسی بد فطرت عورت کو میں کبھی جیتنے نہ دوں گا۔

وہ تو جیت چکی ولید۔۔ میرا جگر چھلنی کر چکی وہ۔۔ اسنے یاس بھرے لہجے میں کہا تھا۔

نہیں بیا میر جان ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ تمہیں اپنی ماں سمجھتا ہے بہت مانوس ہے تم سے۔ تم اس سے ملو گی تو جان جاؤ گی۔ اسنے اسکا ہاتھ تھپتھپا کر اسے تسلی دینا چاہی تھی۔ مگر ابہا کے دل کا سکون رخصت ہو گیا تھا۔ اسنے آنکھیں موند کر سر بستر کی پشت سے ٹکا دیا۔ یہ قسمت کا کیسا پھیر تھا کہ اس رات کے بعد سات سال اس نے دھندلے دھندلے عکسوں کی توڑ جوڑ کرتے کسی اندھے کی طرح گزار دیئے تھے۔ ولید کی موت کا شاک اس سے اسکی

sanity

چھین کر لے گیا تھا۔ اور آج ولید کی موت کے خوف نے ہی اسکے ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اسکی سب حسیات آنِ واحد میں بیدار ہوئی تھیں اور وہ ماضی کا سراغ پا گئی تھی۔ مگر یہ سراغ بھی تو آدھا دھورا ذہن پر بہت زور دینے سے اسے ایدھی ہوم اور مسز اسلم کے گھر گزرے دن کسی بھولے خواب کی طرح یاد آتے مگر وہ لمحہ یاد نہ آتا جب وہ وہاں پہنچی تھی۔ اور اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی وہی ایک پل تھا۔



اسی دن رات کی بات تھی جب ولید دانیال کو گھر سے لے آیا تھا اور اسے ایہا کے پاس چھوڑ کچھ دیر کو کہیں چلا گیا۔ دانیال جھجھکتا ہوا سا ایک طرف کھڑا تھا۔ ایہا نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ وہ ہو بہو ولید کی شکل تھا۔ وہی آنکھیں وہی ہونٹ وہی ماتھے پر گرتے سیاہ چمکیلے بال۔۔ اسکا دل اپنی اولاد کی جانب بے طرح ہمکا تھا۔

ادھر آؤ۔ اسنے بازو وا کر کے اسے اپنے قریب بلایا۔ وہ کچھ ہچکچاتا ہوا اسکے بستر کے قریب آیا۔ ایہا نے اسکے ننھے ننھے ہاتھ تھام لیے۔ دانیال! کیسے ہو۔ اسکی آواز حلق میں گھٹ رہی تھی۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

ٹھیک ہوں۔ وہ سعادتمندی سے سر ہلا کر بولا۔

یہی سوال مجھ سے پوچھو۔ اسنے نم آنکھوں سے فرمائش کی۔ دانیال نے حسبِ عادت دونوں لب باہم پیوست کر کے تھوک نگلا تھا۔ اسکے دائیں گال میں گہرا بھنور پڑا تھا۔ ایہا کا دل اس بھنور میں ڈوب کے ابھرا۔ وہ ہو بہو ولید جیسا نہ تھا۔۔ وہ اس جیسا بھی تھا۔۔ اسکے وجود کا حصہ اسکا بیٹا۔۔

آپ کیسی ہیں۔ دانیال نے اپنی باریک سی آواز میں پوچھا۔

ٹھیک ہوں۔ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکتے ہوئے اسنے جواب دیا۔ اسکے دل میں کیسا درد ابھرا تھا۔ کیسی کسک جاگی تھی۔۔ نجانے کیسی ظالم دنیا تھی جس

نے اس سے اسکے بچے کا ساتھ چھین لیا تھا۔ وہ جس کے بچپن کے ہر لمحے کو بھرپور انجوائے کرنے کے سنے اس سے ساڑھے سات ماہ قطرہ قطرہ بُنے تھے۔۔ وہ سارے سنے اسکی آنکھوں سے جانے کون نوچ لے گیا۔ وہ کسے مورد الزام ٹھہراتی۔۔ تقدیر کا یا لوگوں۔۔ مگر کن لوگوں کو۔ اسکے پاس اپنے مجرم کا کوئی سراغ نہ تھا۔

آ۔۔ آپ۔۔ میری ریل ماما ہیں۔ چند ثانیے بعد دانیال نے جھجھکتے ہوئے پوچھا۔ ایسا نے اسکی طرف دیکھا۔ اور دھیرے سے سر اثبات میں ہلادیا۔ مگر میں تو ان کو ماما کہتا ہوں۔

جانتی ہوں آپ لیلیٰ کو ماما کہتے ہو۔ اسنے اسکی بات کاٹی۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

جی۔ دانیال نے سر ہلایا۔

مگر آپ کی ماما میں ہوں بیٹا۔ لیلیٰ نے آپکو پالا ہے۔

آپ نے کیوں نہیں پالا مجھے۔

میں بیمار تھی بیٹا۔ اسکی آنکھیں چھلکی تھیں۔

اب آپ ٹھیک ہو گئی ہیں۔

ہاں اب میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں اور اپنے بیٹے کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤنگی۔ اسکے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے وہ اسے سینے سے بھینچ کر رو پڑی

تھی۔ ماں کے سینے سے لگ کر وہ ننھا فرشتہ بھی جیسے سکون پا گیا تھا۔ کیسا سکون تھا ماما کی اس حرارت میں جو ابیہا کے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔ سات سالہ دانیال نے اس احساس کو پہلی بار جیا تھا۔ ماں کا وجود کیا ہوتا ہے یہ اسنے آج جانا تھا۔ دوسری طرف ابیہا بھی اپنی اولاد کو سینے سے لگائے سکون محسوس کر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ابیہا کاظم نے خود کو بہادر محسوس کیا تھا۔ وہ ابیہا کاظم جو دنیا سے ڈرتی تھی۔۔ اپنے حق کے لیے آواز بلند نہ کر سکتی تھی۔ وہی ابیہا کاظم اپنی اولاد کو سینے میں سمو کر دنیا سے لڑ جانے کو تیار تھی۔



ابیہا کو رات تک ہسپتال سے چھٹی مل گئی تھی۔ وہ ولید اور دانیال سیدھا گھر ہی آئے تھے۔ ولید کو آج ان سب سے دو ٹوک بات کرنا تھی۔ بڑے کمرے میں شکلیہ بیگم اور لیلیٰ انکے منتظر تھے۔ جیسے ہی وہ دانیال کی انگلی تھامے اندر داخل ہوا لیلیٰ جھپٹ کر اسکی طرف آئی۔

دانی کدھر تھے تم صبح سکول جانا ہے بیٹا اتنی دیر سے آئے ہو آپ۔ دانیال ہاتھ ولید کے ہاتھ سے چھڑوا کر اسنے اسے اپنی جانب کھینچا تھا۔ تبھی ابیہا اندر داخل ہوئی۔ سنجیدہ سے تاثرات کیساتھ اس نے ان دونوں پر ایک نظر ڈالی۔ میرا بیٹا میرے پاس تھا لیلیٰ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نرمی

سے کہتے ہوئے اسنے دانیال کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ وہ اسکی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ لیلیٰ نے پزل سی ہو کر شکلیہ بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

ایسا! انہوں نے ناقابل یقین انداز میں دہرایا۔

جی میں ایسا کاظم۔ وہ مسکرائی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ بے خوفی سے انکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں کھڑی تھی۔

میری یاد داشت ٹھیک ہو جانے پر آپکو خوشی نہیں ہوئی مئی۔ اسنے سوال داغا تھا۔ لیلیٰ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے تھے۔

اوہ ہاں میں تو بھول ہی گئی۔ آپ کیسے خوش ہو سکتی ہیں۔ آپکو تو لیلیٰ کو اپنی بہو بنانے کا ارمان تھا۔ میرے بیٹے کو لیلیٰ کی گود میں ڈال کر آپ نے کامیاب پلاننگ کر لی تھی مگر افسوس میری واپسی نے آپکے ساری پلاننگ کو برباد کر دیا۔ وہ طنزیہ کاٹ سے بھرپور لہجے میں بول رہی تھی۔

بکواس ہے یہ۔ لیلیٰ کو کیا پتہ تھا کہ ولید واپس آجائے گا اس نے تو انسانی ہمدردی کی خاطر دانیال کو پالا ہے۔ شکلیہ بیگم جلدی سے بول اٹھیں۔

ولید کا آجانا ایک معجزہ ہی سہی مگر میرے بیٹے کو لیلیٰ کی گود میں ڈالنے کے پیچھے ضرور آپکی کوئی سازش کارفرما تھی۔ اور مجھے ایدھی ہوم بھیجنے والے کون لوگ تھے یہ بات بھی اب تک پردہء راز میں ہی ہے۔ کیا آپ ان سب

باتوں کی وضاحت پیش کر سکیں گی می۔ اسنے لفظ می پر زور دے کر چبا چبا کر ایک ایک لفظ بولا تھا۔

شکیلہ بیگم کے چہرے پر یکدم وہیں پُر غرور تاثرات ابھرے جو ان کی شخصیت کا خاصا تھے۔

تم اپنے گناہوں کا ملبہ ہمارے سر مت ڈالو لڑکی۔ اپنے نوزائیدہ معصوم بچے کو چھوڑ کر اپنے آشنا کے ساتھ فرار تو تم خود ہو گئیں تھی۔ وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔

می پلیز! یہ بے بنیاد الزام لگانا چھوڑ دیجیے۔ اب ڈاکٹر کی رپورٹ یہ ثابت کر چکی ہے کہ دانیال کی پیدائش کے دوران ہی ایہا کی یادداشت متاثر ہو گئی تھی۔ ایہا کے بولنے سے قبل ہی ولید ناگواری سے بول پڑا تھا۔

ہونہہ تو ہم کیا جانے کہ اس کی یادداشت متاثر ہو گئی تھی۔ شکیلہ بیگم منہ بنا کر بولی۔

تو اور کون جانے گا می۔ اس کو ہسپتال آپ لوگ لے کر گئے تھے تو اسکی کنڈیشن کا علم بھی آپ لوگوں کو ہی ہو گا ناں۔ ولید نے ترکی بہ ترکی کہا۔

ارے مجھ پر مت چلاؤ۔ میرا اپنا صدمے سے برا حال تھا ہوش نہیں تھا مجھے کہ کیا کیا ہوتا رہا۔ شکیلہ بیگم نے فوراً پہلو بچایا تھا۔

یہ لیلیٰ اور سکندر جانتے ہوئے یہی لے کر گئے تھے اسکو ہسپتال۔ انہوں نے

لیلیٰ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

بولو لیلیٰ! ولید اس کی طرف پلٹا، وہ گڑبڑا گئی۔

سس۔۔۔۔ سکندر بھائی جانتے ہونگے یا پھر ممی۔۔۔۔ کیونکہ ہسپتال میں تو وہی دونوں تھے۔ اس میں گڑبڑا کر وضاحت پیش کی۔

ٹھیک ہے۔ سکندر بھائی کو میں ابھی بلوائے لیتا ہوں۔ اور خالہ۔۔۔ اس نے ایک لمحے کے توقف کیا۔ خالہ کدھر ہیں؟ کتنی عجیب بات ہے کہ گزشتہ ایک سال میں مجھے ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا کہ جب تم ادھر ہو تو خالہ کہاں چلی گئیں۔ وہ لیلیٰ سے ہی مخاطب تھا اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے۔ لیلیٰ نے پزل سی ہو کر سکینہ بیگم کی طرف دیکھا۔

ممی تو دانیال کی پیدائش کے دو دن بعد ہی کینیڈا واپس چلی گئیں تھیں۔ لیلیٰ نے وضاحت پیش کی۔

وہ تمہارے بغیر کسے واپس چلی گئی تھیں؟ تم لوگ میرے پیچھے سے کیا کھچڑی پکاتے رہے ہو آخر۔ وہ چڑ کر بولا۔

تم آخر یہ سب باتیں لے کر کیوں بیٹھ گئے ہو ولید۔ شکیلہ بیگم نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

یہ بہت اہم بات ہے ممی۔ ابیہا کی زندگی برباد کی ہے آپ سب نے مل کر

ہمارے بچے کو ماں کی ممتا سے محروم کیا ہے۔ اور میں اس سارے ظلم کی وجہ جانے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گا۔ سن لیں آپ۔ میں ابھی سکندر بھائی کو بلواتا ہوں۔ اب ساری بات ان کے سامنے ہی ہوگی۔ ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کر کے پلٹا اور کمرے سے نکل گیا ابیہا نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

دانی! لیلیٰ نے تڑپ کر دانیال کو پکارا۔ اس نے اجنبی سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

آپ نے میرے ماما کو گھر سے نکالا تھا دادو۔ اس نے شکیلہ بیگم کو مخاطب کیا تھا۔

نن۔۔۔ نہیں تو بیٹا، ہم ایسا کیوں کریں گے۔ ابیہا کو کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی ہے۔ انہوں نے بچے کو بہلانا چاہا۔

دانی! آپکی ماما تو میں ہوں بیٹا۔ لیلیٰ کے لہجے میں تڑپ تھی۔

آپ ماما تو نہیں ہیں میری۔ آپ نے تو صرف مجھے پالا ہے۔ میری ماں تو وہ ہیں۔ وہ بہت ذہین بچہ تھا۔ ہر بات کو اچھی طرح سمجھنے والا۔ کبھی لیلیٰ کو اس کی ذہانت پر فخر ہوتا تھا مگر آج اس کا بے اختیار جی چاہا کہ دانیال عام بچوں کی طرح ہوتا۔۔۔ بہت سی باتیں نہ سمجھنے والا۔

اگر وہ اتنی ہی ماں ہوتی تو تمہیں چھوڑ کر کیوں جاتیں۔ شکیلہ بیگم بولیں۔

وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گئیں تھی۔ ان کو کسی نے گھر سے نکال دیا تھا۔ انہوں نے مجھے خود بتایا ہے کہ بابا کے شہادت کی نیوز سن کر وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اور اس کے بعد انہیں کچھ یاد نہیں۔ دانیال نے رٹے رٹائے انداز میں جواب دیا تھا۔ لیلیٰ کے چہرے کا رنگ واضح تاریک پڑا تھا۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹا ابیہا نے آپ کو غلط بتایا ہے۔ لیلیٰ نے سنبھالا لینا چاہا مگر دانیال برا سا منہ بنا کر کمرے سے چلا گیا۔

اب کیا ہوگا خالہ۔ لیلیٰ نے کسی ڈوبتے ہوئے کی طرح شکلیہ بیگم کو پکارا تھا۔ ہونا کیا ہے۔ سکندر آئے گا دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا۔ آج تک جس بات پر ہم نے پردہ ڈالا رکھا اب وقت آگیا ہے کہ ولید کو وہ بھی بتا دی جائے۔ تم نہیہا سے رابطہ کرو اس کو کہو کہ وہ آکر گواہی دے ابیہا کی بدکرداری کی۔ شکلیہ بیگم مطمئن نظر آرہی تھی۔ بلکہ میں خود اس سے بات کرتی ہوں اور جمیلہ کو بھی لائن پر لیتی ہوں۔ اگر عدالت لگانا ہی مقصود ہے تو پھر یہ دونوں اور روجی بھی ویڈیو کال پر موجود ہوں گی۔ انہوں نے اپنے موبائل پر محفوظ رابطوں پر تیزی سے نظریں دوڑاتے ہوئے پلان مرتب کیا۔ لیلیٰ بالکل چپ چاپ ایک جانب کھڑی کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔



بڑے کمرے میں ایک عدالت سج چکی تھی۔ دائیں جانب رکھے بڑے صوفے پر شہزاد سکندر اور شکیلہ بیگم بیٹھے تھے۔ اور اس کے متوازی صوفے پر ولید اور ایہا براجمان تھے۔ گلاس ونڈوز سے پردے سرکا دیئے گئے تھے اور لان بالکل تاریک تھا، کمپاؤنڈ کی روشنیاں بھی آج جلائی نہ گئی تھیں۔ کمرے کے بچوں بیچ پڑے بڑے سے میز کی شیشے کی شفاف سطح پر تین لیپ ٹاپ ترتیب سے رکھے تھے جن میں سے ایک پر روحینہ ویڈیو کال پر موجود تھی اور دوسرے پر جمیلہ خالہ۔ جبکہ تیسرے پر نیہا سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ لیپ میز کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی لیپ ٹاپ کی کیز کے ساتھ چھپر چھاڑ کر رہی تھی۔ دانیال شہزاد اور سکندر کے بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں کھیل رہا تھا۔

NEW ERA MAGAZINE
Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

ایک سکوت سا کمرے کی فضا پر قائم تھی۔

جمیلہ خالہ آپ اور سکندر بھائی ایہا کو ہاسپٹل لے کر گئے تھے۔ سکوت کے اندھے کنویں میں آواز کا پہلا پتھر ولید نے پھینکا تھا۔ وہ سب اپنے اپنے خیالات سو چونک کر اسکی جانب متوجہ ہو گئے۔

ہاں۔ جواب جمیلہ خالہ کی طرف سے آیا تھا۔

اسکے بعد وہاں کیا ہوا تھا ولید نے سوال کیا۔

اسکے بعد یہ ہوا تھا کہ ہم کچھ دیر کو گھر آئے تھے اور تمہاری نیک پارسا بیوی

اپنے آشنا کیساتھ بھاگ گئی تھی۔ جواب سکندر کی جانب سے آیا تھا۔ اسکے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔ ابیہا نے ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سکندر بھائی۔ ابیہا حیرت سے بولی۔

بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ خالہ گواہ ہیں اس بات کی۔ بولیں خالہ۔

ہاں یہ سچ ہے۔ جمیلہ خالہ نے بھی اسکی تائید کی۔

یہ جھوٹ ہے، میں تو بے ہوش تھی مجھے تو کچھ یاد ہی نہیں۔ ابیہا کی آنکھوں میں نمی اتری۔

تمہاری بہن نے تمہارے سارے کرتوتوں سے پردہ اٹھایا تھا۔ ابھی نہیہا سے رابطہ ہوگا تو وہ خود بتائے گی۔ شکیلہ بیگم کے انکشاف پر ابیہا تو ایک لمحے کو گنگ رہ گئی تھی۔

نہیہا نے۔۔ مگر اسنے ایسا کیا کہا تھا میرے متعلق۔

اسنے ہمیں خود بتایا تھا کہ تم شادی سے قبل اپنے محلے کے ایک لڑکے صادق کو پسند کرتی تھی مگر وہ غریب تھا اسلیے تم نے ولید سے شادی کر لی تاکہ دولت حاصل کر کے اپنی مرضی کے انسان کیساتھ شادی کر سکو۔ شکیلہ بیگم کے انکشاف ابیہا کے سماعتوں پر کسی بم کی طرح گرے تھے۔

یہ جھوٹ ہے۔۔ بہتان ہے۔ ابیہا نے رندھی آواز میں کہا تھا۔ ولید نے ایک

طویل سانس بھری۔

لیلیٰ نیہا سے رابطہ کرو فوراً۔ اسنے لیلیٰ کو حکم جاری کیا تھا۔

وہ آنلائن نہیں ہے۔ لیلیٰ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

تو بلا لو آنلائن اسکو تمہارے پاس اس کا فون نمبر بھی تو ہے ناں۔ ولید کی سیاہ آنکھیں بے تاثر تھیں۔ لیلیٰ نے ایک ثانیے کو ان آنکھوں کا سامنا کیا اور پھر سر جھکا کر رہ گئی۔ ولید نے اپنی نشست سے اٹھ کر لیلیٰ کے سامنے سے لیلیٰ کو موبائل اٹھایا اور اس پر نیہا کا نمبر نکال کر کال ملائی۔

لو۔ بات کرو۔ اسنے سپیکر آن کر کے موبائل لیلیٰ کی طرف بڑھایا۔ لیلیٰ نے فون لینے کے لیے ہاتھ نہ بڑھایا تھا۔ بیل جا رہی تھی اور سب نفوس دم سادھے بیٹھے تھے۔

پکڑو۔ بات کرو اس سے۔ ولید نے سختی سے لیلیٰ کو ڈپٹا تو اسنے لرزتے ہاتھوں سے موبائل تھام لیا۔ ولید اسکے سر پر کھڑا تھا۔

ہیلو۔ چند بیلز کے بعد نیہا کی آواز سنائی دی تھی۔ ابیہا کو لگا اسکی سانس بھی تھم گئی ہے۔

ہے۔۔۔ ہیلو۔۔ نیہا میں بول رہی ہوں لیلیٰ۔ لیلیٰ کی آواز میں واضح لرزش تھی۔

آئی نو یار تمہیں کب سے تعارف کروانے کی ضرورت پڑ گئی۔ یہاں نے بے تکلفی سے جواب دیا۔

لیلیٰ نے سر اٹھا کر ولید کی طرف دیکھا۔

تت۔۔ تم کیسی ہو۔۔ وہ بمشکل بولی۔

ٹھیک ٹھاک ہوں یار۔ پچھلے ہفتے زبیر نے مجھے سونے کی چھ چوڑیاں بنوا کر دی ہیں۔ سچ میں یار میں تو ہر وقت تمہیں دعائیں دیتی ہوں میری زندگی کبھی اتنی سٹیبل نہ ہوتی اگر تم نہ ہوتی۔ یہاں متشکر انداز میں بولتی جا رہی تھی۔ ابیہا کو اپنے دل کے دھڑکنے کی دھمک سر میں محسوس ہو رہی تھی۔

ہمم۔۔۔ لیلیٰ بس اتنا ہی کہہ سکی۔ ولید نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر اس پر جلدی سے کچھ ٹائپ کر کے سکرین لیلیٰ کے سامنے کی۔ لکھا تھا اس سے پوچھو اس کو مزید پیسوں کی ضرورت تو نہیں۔ لیلیٰ نے ایک رحم طلب نظر ولید کی طرف کی اور اسکی سخت نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے سر جھکا گئی۔

کچھ بولو بھی چپ کیوں ہو۔ یہاں نے خاموشی سے تنگ آکر کہا۔

ہاں وہ۔۔۔ یہاں نے یہ پوچھا تھا کہ تمہیں۔۔۔ مزید پیسوں کی ضرورت تو نہیں۔ لیلیٰ نے رک رک کر سوال دہرایا تھا۔

نہیں یار تم نے پچھلے ماہ جو دو لاکھ بھجوائے تھے وہ اب تک ویسے ہی رکھے

ہیں۔ زبیر کا کاروبار بھی تمہاری وجہ سے ہی سیٹ ہوا ہے میں تو سوچتی ہوں کہ اگر ایہا پر الزام لگانے سے میری زندگی اتنی آسان ہو سکتی تھی تو میں یہ نیک کام بار بار بھی کرنے کو تیار ہوں۔ نیہا ہنس رہی تھی۔ سچ میں یار مجھے تو ہمیشہ سے ہی ایہا بہت زہر لگتی تھی میرے پاس کوئی وجہ نہیں بس مجھے اس کا چہرہ پسند نہیں تھا بد صورت۔۔۔ ہونہ۔ اور جب ولید نے اسکو پسند کیا تو مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ جب تم نے مجھے آفر دی کہ ایہا کے کردار پر الزام لگانے کے بدلے تم مجھے پچیس لاکھ دوگی تو مجھے یہ لگا میری دلی مراد بر آئی ہے تم نے مجھ پر دو احسان کیے۔ ایہا کے متعلق زہر اگلنے کا موقع دے کر میرا دل ہلکا ہوا اور زبیر کیساتھ دوہی آکر میری زندگی سنور گئی۔ اور وہ بد شکل منحوس سڑ رہی ہے کسی گندی نالی میں۔ اور وہ اسی لائق تھی۔ نیہا کی آواز میں ایہا کے لیے بے انتہا نفرت تھی۔ ایہا بے اختیار آگے بڑھی اور لیلیٰ کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا۔

یہ میں بول رہی ہوں تمہاری ماں جائی ایہا۔۔۔ بولو نیہا تم نے اپنے حسد و نفرت کو خود پر اتنا حاوی کیوں کیا۔ وہ دکھ سے پوچھ رہی تھی۔

ایہا۔۔۔ نیہا کی آواز میں حیرت ابھری۔

ہاں میں۔۔۔ کیوں کیا تم نے ایسا نیہا۔۔۔

مم۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔۔۔ اسکی زبان لڑکھرائی تھی۔ میں

نے تم سے پیسے مانگے تھے مگر تم نے انکار کر دیا تھا ابو نے بھی دکان بیچنے سے انکار کر دیا تھا انکو عامر کی فکر تھی۔ تم نے مجھے اپنا ڈائمن سیٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ پھپھو نے میرا جینا حرام کر رکھا تھا میں زبیر کو لیکر اس گھر سے کہیں دور چلی جانا چاہتی تھی سو مجھے جو بہتر لگا میں نے کیا۔ میری زندگی آل ریڈی بہت مشکل تھی میں نہ پیسہ تھا نہ عزت۔ زبیر بھی مجھ سے دور ہوتے جارہے تھے انکو دوہی جانے کا شوق تھا اور انکا یہ شوق پورا کر کے میں انکو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا سکتی تھی سو میں نے لیلیٰ کی آفر مان لی۔ وہ اپنے گناہ کے لیے توجیہات پیش کر رہی تھی۔

تم کیسی خود غرض ہو نہیہا تم نے ہمیشہ اپنی خوشی کو ترجیح دی اپنے آپکو اہمیت دی۔ زبیر بھائی سے شادی کرنے کے لیے تم نے پھپھو کے سامنے میرے مستقبل کا سودا کرنا چاہا تھا تب میں نے تمہیں معاف کیا تم نے ہر بار میرے پاؤں پر کلہاڑی مارنا چاہی میں نے ہر بار تمہیں معاف کیا۔ مگر اب میں تمہیں کبھی معاف نہیں کرونگی نہیہا۔ اور جب تک میں تمہیں معاف نہیں کرونگی میرا اللہ بھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ تم برباد ہو جاؤ گی۔ سن لو تم برباد ہو جاؤ گی۔ اسنے چیخ چیخ کر روتے ہوئے سیل اٹھا کر زمین پر دے مارا تھا۔

اب بولیں آپ لوگ۔ ولید نے روتی ہوئی ابیہا سے نظریں ہٹا کر اپنا رض شکیلہ بیگم کی جانب موڑا۔ روحینہ اور جمیلہ خالہ اس دوران آف لائن ہو چکی تھی۔

مم۔۔ مجھے یہ سب معلوم نہیں تھا ولید۔۔ میں۔۔ تو۔۔ میں تو بے ہوش تھی۔ جب ہوش آیا تو سکندر جمیلہ نیہا اور روحینہ کی زبانی یہی سب سنا۔ اور ایہا کے والدین نے بھی نیہا کی بات پر خاموشی اختیار کی تھی۔۔ ادھر اسی کمرے میں سب جمع ہوئے تھے نیہا نے یہ سب انکشافات کیے تھے جن کو سن کر اسکے والد اور والدہ روتے ہوئے مجھ سے ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگتے چلے گئے تھے اسکے بعد وہ پھر کبھی نہ آئے بعد کو پتہ چلا کہ وہ باہر چلے گئے ہیں۔ شکلیہ بیگم نے جلدی سے وضاحت پیش کی تھی۔

اور آپ سکندر بھائی۔ ولید نے سکندر کی جانب دیکھا۔ سکندر نے ایک طویل سانس بھری۔

مجھے یہ سب معلوم نہیں تھا مگر اب میں بہت کچھ سمجھ گیا ہوں۔ اس رات جمیلہ خالہ نے گھر سے بچے کا سامان لانے کے بہانے گھر بھیجا تھا گھر پہنچ کر میں نے لیلیٰ سے سامان لانے کو کہا تو اسنے تقریباً ایک گھنٹہ اس کام میں لگا دیا تھا اور جب میں ہسپتال واپس پہنچا تو جمیلہ خالہ مجھے روتی ہوئی ملی تھیں انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ ایہا کو لینے صادق نامی ایک شخص آیا تھا جس کے ہمراہ وہ چلی گئی۔ مجھے سچ بتاؤں تو ایہا سے یا تمہارے بچے سے کوئی دلچسپی نہ تھی دوسرا میں ان مڈل کلاس لڑکیوں سے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا سو میں نے زیادہ تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بات رفع دفع ہو گئی۔ بعد ازاں جب دانیال کو لیلیٰ نے گود لے لیا اور گھر میں روز می کو نفسیاتی

دورے پڑنے لگے تو میں اور شہزاد الگ گھر میں منتقل ہو گئے۔ اسکے بعد سے یہ دن ہے ہماری اپنی الگ زندگی ہے کسی سے کوئی لینا دینا نہیں ہمارا۔ اب جب یہ سب باتیں کھل گئی ہیں تو میں صرف مزمت ہی کر سکتا ہوں لیلیٰ کے اس رویے کی۔ سکندر نے بہت ہی ہموار لہجے میں خود کو اس سارے معاملے سے بالکل غیر متعلق ثابت کر دیا تھا۔ لیلیٰ گود میں ہاتھ دھرے بالکل کسی پتھر کی مورت کی طرح بیٹھی تھی۔

واہ سکندر بھیا واہ۔۔ کیسی خوبصورتی سے آپ نے خود کو معصوم اور بے قصور ثابت کر دیا خدا کی قسم لیلیٰ کے اس گناہ میں آپ دونوں بھی برابر کے شریک ہیں۔ اور آپ لوگ کون ہوتے ہیں کسی کو محض مڈل کلاس ہونے کی بنیاد پر گھٹیا یا بدکردار سمجھنے والے۔۔ یہ فیصلے صادر کرنے والے آپ کون ہیں۔ مجھے کیسی غلط فہمی تھی کہ ہم سب بہن بھائی ایک فیملی ہیں اک دوسرے کی محبت میں چور ہیں۔۔ صد حیف کہ میں نے اب تک کی زندگی غلط فہمی میں بتا دی۔ ہم بس تبھی تک ایک خاندان تھے جب تک ذاتی مفادات سے پرے تھے جب مفادات کی بات آئی تو سب الگ ہو گئے۔ آپ سب نے مجھے اس بھری دنیا میں تنہا کر دیا سکندر بھائی۔ میرے بعد میری بیوی میرے بچے کی حفاظت آپ سب کو کرنا تھی مگر آپ سب تو چور لٹیرے بن گئے۔۔ اور میں تم سے پوچھتا ہوں لیلیٰ۔ وہ لیلیٰ کی طرف پلٹا۔ تمہیں کیا ملا یہ سب کر کے۔۔ تم کو کیا چاہیے تھا۔۔ دولت۔۔ جائیداد۔۔ جانتا ہوں سب جانتا ہوں۔۔ تمہیں اور جمیلہ

خالہ کو آٹھ سال قبل ہماری محبت نہیں بلکہ تم لوگوں کی غربت پاکستان لے کر آئی تھی۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی تمہیں دولت چاہیے تھی کینیڈا میں پھر سے سیٹل ہونے کے لیے اور اسکے لیے ضروری تھا کہ تم ولید حسن کی بیوی بن جاتیں۔ مگر لیلیٰ تم نے کتنا غلط راستہ اختیار کیا اور میں پوچھتا ہوں تمہیں کیا ملا۔ آج تم ایک ایسے مقام پر آن رکی ہے کہ نہ جہاں زمین تمہاری ہے نہ آسمان۔ تم بے سروسامان ہو چکی ہو۔ تم نے سات سال دانیال کو ماں بن کر پالا مگر ایک لمحہ لگا اس کو اپنے اصل ماں باپ کا بننے میں۔ تم نے دولت پالی۔ تم نے محبتیں کھودیں لیلیٰ۔ وہ بولتے بولتے تھک گیا تھا۔ اسی لمحے دانیال دوڑتا ہوا اندر آیا اور روتی کارپٹ پر گھنٹوں کے گرد بازو لپیٹے زار و قطار روتی ابیہا سے لپٹ گیا۔

آئی لو یو ماما آپ نہ روئیں یہ سب لوگ گندے ہیں۔ اسنے سر پر پیار کرتے ہوئے وہ معصومیت بھرے انداز میں اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ لیلیٰ نے سر اٹھا کر اس منظر کو دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں اک تلاطم سا اٹھا تھا۔

دانی۔۔ اسنے تڑپ کر اسے پکارا تھا۔

آپ میرا نام مت لیں آپ وچ ہیں آپ نے میری ماما کو اتنا رلایا۔ آپ سب لوگ گندے ہیں صرف میری ماما اچھی ہیں۔ آئی لو یو ماما آپ نہ روئیں۔ نفرت آمیز انداز میں لیلیٰ کو جھڑک کر اسنے ابیہا کے سر کو چوما تھا۔ ابیہا نے اپنے

بیٹے کو سینے سے لگالیا تھا۔

کمرے میں موجود تمام نفوس دم سادھے اس منظر کو تک رہے رہے تھے۔
ولید آگے بڑھا اور ایہا کو شانوں سے تھام کر کارپٹ سے اٹھایا۔ ایہا کسی
ہارے ہوئے انسان کی طرح اسکے سینے سے سر ٹکا کر سسکنے لگی تھی۔ ولید نے
اسکا سر سہلایا اور دانیال کی انگلی تھامے ایہا کو بازو کے حلقے میں لیے کمرے
سے چلا گیا تھا۔

یہ تم نے کیا کیا لیلیٰ۔ چند ثانیے بعد شکلیہ بیگم بولی تھیں۔
جو بھی ہوا بہت برا ہوا۔ شزاء نے بھی افسوس کے اظہار میں سر ہلایا۔
ولید کا شادی کا فیصلہ ہی غلط تھا اپنی وے چلو شزاء بچوں کو بلاؤ گھر چلیں دیر
ہوگئی ہے۔ سکندر نے منہ بنا کر کہتے ہوئے شزاء کو آرڈر دیا تو وہ اوکے کہتی
اٹھ کر کمرے سے چلی گئی۔

تم جارہے ہو سکندر۔ اس مشکل گھڑی میں ماں کو چھوڑ کر جارہے ہو۔ شکلیہ
بیگم نے اپنی نم آنکھیں سکندر کے چہرے پر گاڑ دیں۔

پلیز ممی مجھے تو ان جھگڑوں سے دور ہی رکھیں میں شزاء اور بچے آپ سب
لوگوں سے کوئی کنسرن نہیں رکھتے۔ جو کچھ آپ لوگوں نے ولی کیساتھ کیا ہے
اسکی سزا بھی بھگتیں اب میں تو کسی کی سزا میں حصے دار نہیں بن سکتا اللہ
حافظ۔ وہ اکھڑے اکھڑے انداز میں کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے چلا

گیا تھا۔ اسکے جاتے ہی شکلیہ بیگم دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ لیلیٰ نے ایک سسکی سی لی اور اپنا سر میز پر رکھ دیا۔ رات قطرہ قطرہ بھینگنے لگی تھی۔



ولید نے مسلسل روتی ایہا کو صوفے پر بٹھایا اور خود اسکے سامنے کارپٹ پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دانیال بھی چپ چاپ سا قریب ہی کھڑا تھا۔ چپ کر جاؤ ایہا۔ رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسنے سخت لہجے میں کہا تھا۔

میں نے کسی کو کیا نقصان پہنچایا تھا ولید۔ آخر میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ بلک رہی تھی۔

پلیز جانے دو ایہا۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔

کیسے بھول جاؤں ولید۔ ان سب نے مجھ سے میری زندگی کے سات سال چھین لیے۔ میں اپنے بچے کا بچپن نہ دیکھ سکی۔ میں اسے پال نہ سکی۔ اسنے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

جس کا جتنا ظرف تھا اس نے وہی کیا ایہا۔

مجھے دکھ اس بات کا ہے ولید کہ امی ابو نے بھی میری پارسائی کی گواہی نہ

دی۔۔ وہ آرام سے مان گئے کہ میں ہی غلط ہوں۔۔ اسنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر روئی روئی آنکھوں کیساتھ کہا تھا۔ ولید کچھ نہ بولا۔ اس ساری دنیا میں آپکے سوا کسی نے مجھ پر اعتبار نہ کیا۔۔ آپ نے کیوں اعتبار کیا مجھ پر ولید۔۔ اس نے بے چارگی سے پوچھا تھا۔

کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے۔ ولید کا جواب برجستہ تھا۔ ایہا کے بہتے آنسو بے اختیار تھمتے تھے۔ یہ مکمل جواب تھا۔ اسکے بعد اسے کچھ اور سننے کی حاجت نہ تھی۔ محبت آغاز محبت ہی انت ہے اس حیاتِ جاودانی کا۔ اسنے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے شوہر کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اک روشن سحر طلوع ہونے کو تھی۔



تمام رات وہ دونوں ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی تھیں۔ ان دونوں کے چہروں پر مٹے مٹے آنسوؤں کے نشانات تھے۔ رات سے اب تک روحینہ اور نیہا کتنی ہی بار کالز کر چکی تھیں مگر ان میں سے کسی میں اتنی سکت نہ تھی کہ کال ریسیو کر سکتیں۔ رات ڈھلی دن نکل آیا۔ گلاس ونڈوز سے دھوپ چھن چھن کر اندر آنے لگی تو شکیلہ بیگم کے وجود میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اٹھ کر میکانیکی انداز میں چلتی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ انکے جانے کے بعد لیلا نے ایک طویل سانس لے کر ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ اسکا موبائل کچھ ہی فاصلے پر زمین پہ اوندھا پڑا تھا۔ میز پر رکھے لیپ ٹاپس کی بیٹریاں ختم ہو چکی تھیں۔

کمرے میں اک عجب سا سکوت تھا۔ وہ تساہل سے اٹھ کھڑی ہوئی اور گلاس ونڈو کی طرف بڑھی۔ لان پر چمکیلی دھوپ بکھری ہوئی تھی۔ ملازمہ پائپ لگائے شرپا شرپا طویل ڈرائیو وے پر پانی بہا رہی تھی۔ مالی مستعدی سے پودوں کی کانٹی چھانٹی میں مصروف تھا اسکی نظریں بھٹکتی ہوئی لان کے بیچوں بیچ جا کر ٹھہری۔ وہ ایک ایسا منظر تھا جس نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ لیلیٰ نے گلاس ونڈو پر ہاتھ جما کر ایک نظر اس منظر کو دیکھا۔ ولید گھٹنوں کے بل گھس پر بیٹھا سفید رنگ کے بلی کے بچے کو ہاتھوں پر اٹھائے اپنے پاس کھڑے دانیال سے کچھ کہہ رہا تھا اور ان کے پاس کھڑی ایسا مسلسل ہنستی جا رہی تھی۔ اور ہنس تو ولید اور دانیال بھی رہے تھے۔ بات کرتے کرتے ولید نے اچانک بلی کا بچہ ایسا کی طرف بڑھایا اور وہ ہنسی کو بریک لگا کر ڈر کے پیچھے ہٹ گئی۔ دانیال منہ پر ہاتھ رکھے ہنسنے لگا تھا۔ ولید اٹھ کر ایسا کو بار بار بلی کے بچے سے ڈرا رہا تھا اور ایسا ہنستے ہوئے اپنے بچاؤ کی خاطر ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی مگر دانیال بار بار اسکا بازو پکڑ کر اسے روک لیتا۔ کیسا مکمل منظر تھا۔ وہ تینوں اک دوسرے کیساتھ بالکل پرفیکٹ نظر آتے تھے۔ لیلیٰ نے پردہ کھینچ دیا اور پلٹ کر آزدگی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا، وہ روشنی جلانے کی جرات نہ کر سکی تھی۔ کبھی کبھی من اندر تاریکی کا ایسا بسیرا ہو جاتا ہے کہ باہر کیسا بھی منظر ہو چنداں فرق نہیں پڑتا۔ بیرونی تاریکی تو تب کھلتی ہے جب من اندر اجالا ہو اور جب من

ہی میلا ہو تو باہر چاہے چمکدار دھوپ ہی کیوں نہ پھیل جائے آنکھیں تو چندھیا جاتی ہیں دلوں کے قفل نہیں کھلتے۔

وہ راکنگ چیئر پر بیٹھ کر آگے پیچھے جھولنے لگی۔ اسکے تاریک مَن میں اک سناٹا تھا۔ باہر کی تاریکی اندر کی تاریکی سے مل کر کچھ کھوج رہی تھی۔۔ سراغ لگا رہی تھی۔۔ کسی لغزش کا سراغ۔۔ کسی گناہ کا کھوج۔۔ اور بری نیت سے بڑا گناہ اور کونسا ہو سکتا ہے۔ آدم زاد کے اندر سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ دنیا کی خامیوں اور باطن کی گندگیوں کا تعین تو فوراً کر لیتا ہے مگر اپنے مَن کی گندگی سے نظریں ملانا اس کے بس سے باہر ہوتا ہے۔۔ لاشعوری طور پر جانتا ہر کوئی ہے کہ اسکی طبع میں کیسی گندگی پینتی ہے مگر اسکو تسلیم کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

لیلیٰ جمال اصفہانی بھی سبھی جیسی اک عام سی آدم زادی تھی۔۔ تذکیہ نفس سے دور۔۔ عاقبت نا اندیش۔۔ نیت میں کھوٹ لیے بس میں کا راگ الاپنے والی ایک عام سی حوا کی بیٹی۔

اسنے راکنگ چیئر پر جھولتے ہوئے اپنی زندگی کے گزشتہ آٹھ سالوں کا حساب لگانا شروع کیا تھا۔

اسنے آنکھ کھولی تو خود کو کینیڈا کی آزاد فضا میں سانس لیتے پایا۔ اسکی ممی نے اسے مکمل آزادی سے پالا تھا وہ دن رات محنت کر کے اسکی ہر خواہش پوری

کرتی تھیں۔ مگر جو پر تعیش زندگی وہ اپنی بیٹی کو دینا چاہتی تھیں وہ یہاں ممکن نہ تھا۔ بچپن سے لیلیٰ یہ سنتے ہوئے بڑی ہوئی کہ اسے کسی امیر پاکستان سے شادی کر کے اسے کینیڈا لے کر آنا ہے تاکہ وہ دونوں ماں بیٹی ایک پر تعیش زندگی گزار سکیں۔

وہ ایک قابل طالب علم تھی سو تعلیمی میدان میں وظیفوں پر آگے کی منزلیں طے کرتی گئی۔ اکثر اسکی بات چیت اپنے خالہ کے بچوں سے بھی ہو جایا کرتی تھی۔ وہ تینو اسے پسند تھے۔ مہذب اور خوش اخلاق۔ سب سے زیادہ وہ جس کی شخصیت سے متاثر تھی وہ ولید حسن تھا۔ وہ ہولے ہولے مسکرا کر بات کرنے والا سیاہ چمکیلی آنکھوں والا انسان اسے بھاتا تھا۔ مگر وہ کبھی اس سے بہت زیادہ بات چیت نہ کر سکی تھی کیونکہ وہ بہت مصروف رہا کرتا تھا۔ انہی دنوں کینیڈا میں انکے مالی حالات بگڑنے لگے۔ اور نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ لیلیٰ نے جو فیشن ڈیزائننگ کے پراجیکٹ شروع کیے تھے انکے پیسے گھر کے کرایے اور گروسری کی مد میں ہی خرچ ہونے لگے۔ ان دونوں نے پاکستان واپس جا کر لیلیٰ اور ولید کی شادی کا منصوبہ بنایا۔ مگر اس سے پہلے ہی ولید کی شادی ہو گئی اور ان دونوں کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ مگر لیلیٰ نے ہمت نہ ہاری اور ماں کیساتھ پاکستان چلی آئی۔ ابہا سے مل کر اسے از حد مایوسی ہوئی تھی۔

وہ کیسی عام شکل و صورت والی لڑکی تھی کہ جو ولید کے تو کسی طور بھی لائق نہ تھی۔ اسنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ولید کی زندگی سے ابہا کو نکال

کر اسکی جگہ لے کر رہے گی اور ولید کو اپنے ساتھ کینیڈا لے جائیگی۔ مگر ایسا کسی صورت ممکن نہ ہو پا رہا تھا۔ ولید ابہا کا دیوانہ تھا اسے ابہا کے سوا کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔ شکیلہ بیگم کو تو اس نے آرام سے رام کر لیا تھا مگر ولید کو قابو کرنا بہت مشکل کام تھا۔ روحینہ کی شادی کے دنوں میں اس نے ولید سے واضح الفاظ میں بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر ولید کا رد عمل دیکھ کر وہ گنگ رہ گئی تھی۔ ولید نے اس کے چہرے پر طمانچہ دے مارا تھا اور اس طمانچے نے اس کے وجود میں جیسے چنگاریاں بھر دی تھیں۔ وہ انتقام کی آگ میں جل اُٹھی تھی۔ قسمت نے اس کے حق میں پلٹا کھایا تھا اور ولید سیاچن چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے اپنی پلاننگ پر از سر نو غور کرنا شروع کیا۔ اسکی ممی کا اصرار کینیڈا واپس جانے پر تھا وہ وہاں جا کر پھر سے سیٹل ہونا چاہتی تھی مگر سرمایہ نہ ہونے کے باعث ایسا ممکن ہوتا نظر نہ آرہا تھا۔ انہی دنوں ایک روز شاپنگ کے لیے جاتے ہوئے اسے سڑک کنارے نیہا دکھائی دی اس نے اسے روحینہ کی شادی میں دیکھ رکھا تھا سو فوراً پہچان گئی اور گاڑی اس کے پاس روک دی۔ اسکو ڈراپ کرنے کی آفر کی تو وہ کچھ پس و پیش کے بعد گاڑی میں آ بیٹھی۔ لیلا نے گاڑی سڑک پر دوڑادی۔

یہاں کیوں کھڑی تھی۔ اس نے اس سے پوچھا جو حسرت بھری نگاہوں سے اس پر تعیش گاڑی کا جائزہ لے رہی تھی۔

گھر جانے کے لیے وین کا انتظار کر رہی تھی۔ نیہا نے جواب دیا۔

آج تو شاید پبلک ٹرانسپورٹ کی ہڑتال ہے۔
 تبھی ایک گھنٹے سے کوئی بس دین نہیں آئی۔ نیہا نے جواب دیا۔
 ہم۔ کہاں رہتی ہو تم۔ اس نے پوچھا نیہا نے اپنا پتا بتا دیا۔ وہ کچھ پریشان نظر
 آتی تھی۔

تم کچھ پریشان ہو کیا۔ بلا آخر لیلیٰ نے پوچھ ہی لیا۔
 جی۔۔ پریشان تو بہت ہوں۔

کیا ہوا۔ لیلیٰ نے نرم لہجے میں پوچھا تو نیہا رونے لگی۔
 میری زندگی بڑی مشکل ہے۔ سگی پھپھو کے گھر بیاہی ہوں مگر ایک لمحے کو
 سکون نہیں شوہر بھی ہر وقت دھمکاتا ہے۔ ماں باپ نے بھی ہاتھ اٹھا لیا ہے۔
 جانے کیسے گزرے گی میری زندگی۔ وہ اپنی سیاہ چادر کے پلو سے آنکھیں صاف
 کرتے ہوئے رندھی آواز میں بولی۔

مگر تمہارے والدین تو بہت محبت کرتے ہیں تم سب سے۔
 انکے بس دو بچے ہیں ابیہا اور عامر۔ اسنے برا سا منہ بنایا۔ بس انہی دونوں کے
 بہتر مستقبل کے متعلق سوچتے ہیں۔ میں جاؤں جہنم میں۔
 لیکن وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ لیلیٰ کو اس تذکرے میں کچھ دیکھ دیکھسی ہو چلی
 تھی۔

بس انکو ایہا نے اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے۔ اسکو اعلیٰ تعلیم دلوائی مجھے تو ایف اے کروا کر گھر بٹھا لیا۔ اسکی شادی کے لیے بہترین سوچا اور مجھے پھپھو کے لڑکے کیساتھ باندھ دیا۔ وہ مبالغہ آرائی کی حدیں پار کر رہی تھی۔ اور حقیقت سے نا آشنا لیلیٰ بس سر ہلاتی جا رہی تھی۔

تو اب تمہارا کیا ایشو ہے۔ اس نے سرسری سا پوچھا۔

ایشو کیا ہونا ہے۔ میرے شوہر دوہی جانا چاہتے ہیں مگر ابو پیسے دے کر راضی نہیں انہوں نے سارا جمع جتھا لگا کر عامر کو باہر بھیج دیا ہے اب میں کیا کروں کچھ سمجھ نہیں آتا۔

اوہ آئی سی۔۔ لیلیٰ نے سر ہلایا۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

مجھے دیکھو میں کتنی خوبصورت یوں رل رہی ہوں اور وہ بد شکل کیسے تم لوگوں کے گھر راج کر رہی ہے۔ اسکی صورت اس قابل تھی کہ اسکو ولید جیسا شہزادہ ملتا۔ مگر اسنے اپنی چالاکیوں سے اسکو پھانس لیا۔

مگر ولید اور ایہا کی تو شادی سے قبل کبھی بات چیت بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیلیٰ نے سنی سنائی بات دہرا دی۔

ہونہہ بس کہنے کی باتیں ہیں۔ میں جانتی ہوں ناں کیسے اس نے ادائیں دکھا دکھا کر ولید کو پھنسایا تھا۔ نیہا زہر خند لہجے کیساتھ بولی۔

اچھا ایسی لگتی تو نہیں ابیہا ویسے۔

تم اسکو جانتی ہی کب ہو۔ بہت ہی تیز اور چالاک ہے وہ۔ نیہا نے برا سا منہ بنایا۔

چلو خیر تمہارا گھر آگیا۔ لیلیٰ نے گاڑی اسکی گلی کے سامنے روکتے ہوئے کہا تھا۔

اندر نہیں آؤگی۔ نیہا نے پوچھا۔

نہیں اس وقت کچھ جلدی میں ہوں پھر کبھی آؤنگی۔ بائے۔ اسنے مسکرا کر جواب دیا تھا نیہا اسکا شکریہ ادا کر کے گاڑی سے اتر گئی اور لیلیٰ شاپنگ کا ارادہ ملتوی کر کے گھر چلی آئی۔ اس روز وہ بہت دیر تک نیہا کی باتوں کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ اسنے نیہا کیساتھ دوستی بڑھانے کے متعلق سوچا اور اگلے روز اس سے ملنے اسکے گھر جا پہنچی۔ وہاں اسکا سرد مہری سے استقبال کیا گیا تھا۔ نیہا جھپٹ کر اسے اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ اس روز نیہا سے بات چیت کرنے کے بعد اسنے اندازہ لگایا کہ نیہا اس قید خانے سے نکلنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔ وہ اسے گاہے گاہے کچھ پیسے دینے لگی تاکہ وہ مکمل طور پر اسکی گرویدہ بن جائے۔ اور یہی ہوا مفاد پرست نیہا اسکی مداح ہو گئی اور اسکے ایک اشارے پر کچھ بھی کرنے کو تیار رہنے لگی۔ نیہا کی وفاداری کو آزمانے کا موقع لیلیٰ کو جلد ہی مل گیا تھا۔

لیلیٰ کی پلاننگ میں ابیہا کے بچے کو گود لینے کا پروگرام کبھی بھی شامل نہ رہا تھا وہ صرف ابیہا کو بدکردار ثابت کروا کر اسے گھر اور ولید کی زندگی سے نکلوانا چاہتی تھی مگر قسمت کی ستم ظریفی کہ ولید کی گمشدگی کی خبر آگئی۔ اس روز جمیلہ بیگم نے اسے اپنے پاس بٹھا کر اس سے تفصیلاً بات کی تھی۔

دیکھو لیلیٰ اب امتحان کا وقت ہے۔ سیاحین میں گمشدہ ہونے والے فوجی کبھی واپس نہیں آتے اب ابیہا اور اسکا بچہ شکیلہ کے رحم و کرم پر ہے اور وہ اس سے ویسے ہی بیزار ہے۔ اب تم نیہا کی وفاداری کو استعمال کرو اور ابیہا کو گھر سے نکلواؤ۔

مگر مئی وہ پریگنٹ ہے۔ اسکا بچہ ہو جانے کے بعد ہی ایسا کچھ کرنا چاہیے۔ اسے تامل تھا۔

یہی سب سے صحیح موقع ہے۔ اگر ایکبار ابیہا نے گھر کو ولی عہد دے دیا تو شکیلہ بھی اسکی اہمیت تسلیم کر لے گی اب جبکہ ولید کے واپس آنے کے چانسز بہت کم رہ گئے ہیں شکیلہ ابیہا اور اسکی اولاد میں ہی ولید کو تلاش کرے گی۔ تم اس جذباتی صورتحال کے بننے سے پہلے ہی اپنی چال چل لو۔ اور اس سکندر کی فیملی کا بھی کچھ بندوبست ہم کر لیں گے جب تک یہ خاندان یکجا ہے ہمیں ایک پائی بھی نہیں مل سکتی۔ جمیلہ کی بات سن کر وہ گوگو کی کیفیت میں آگئی تھی۔ جمیلہ اسے کچھ دیر پلان سمجھاتی رہیں۔ نیہا سے بات کی گئی اور وہ ابیہا

کے خلاف جھوٹی گواہی دینے کو تیار ہو گئی بدلے میں اس نے اپنا اور اپنے شوہر کا دو بیوی کا ویزا بمعہ چند ماہ کے اخراجات کے مانگا تھا۔ جمیلہ نے ایک کرائے کے آدمی کو ایہا کا پرانا آشنا بن کر سب کے سامنے آنے پر بھی آمادہ کر لیا تھا۔ مگر ایک بار پھر انکی تدبیر الٹی ہو گئی اور ولید کی شہادت کی خبر آ گئی۔ وہ قیامت کا لمحہ تھا ایہا اور شکیلہ بیگم ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی تھیں۔ جمیلہ بیگم اور سکندر ایہا کو ہسپتال لے گئے اور جمیلہ بیگم نے ہسپتال سے لیلیٰ کو آگاہ کیا کہ ایہا موت و زندگی کی کشمکش میں ہے۔ شکیلہ بیگم کو ڈاکٹر نے سکون آور ادویات کے زیر اثر رکھا ہوا تھا۔ جمیلہ بیگم نے لیلیٰ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ ابھی کسی کو بھی ایہا کو ہسپتال لیجانے یا ولید کی شہادت کے متعلق آگاہ نہ کیا جائے۔ وہ ایک ایک پل گن گن کر بتاتی رہی تھی۔ پھر دانیال پیدا ہوا اور جمیلہ بیگم نے اسے آگاہ کر دیا۔ وہ حاضر دماغی کا لمحہ ان دونوں ماں بیٹی نے فوراً سے پیشتر پلان تیار کیا تھا۔ سکندر کو بہانے سے گھر بھیج کر ایہا کو کرائے کے آدمیوں کے ذریعے ہسپتال کے پرائیویٹ روم سے غائب کروا کے ایدھی ہوم کے سامنے پھینکوا دیا گیا۔ لیلیٰ تب تک یہی سمجھتی تھی کہ جمیلہ بیگم کا منصوبہ اس مشکل صورتحال میں اس گھر اور ساری جائیداد پر قبضہ کرنا ہے مگر اسکو دھچکا اس وقت پہنچا جب جمیلہ نے دانیال کو اسکی گود میں ڈالا تھا۔۔۔

وہ دانیال کی پیدائش سے اگلا دن تھا جب جمیلہ بیگم نے سارے خاندان کو اکٹھا کر کے ولید کی شہادت اور ایہا کے بھاگ جانے کی خبر کو مرچ مصالحہ لگا کر

پیش کیا تھا۔ ابیہا کے گھر والوں کو بھی بلوایا گیا اور نیہا نے پلان کے مطابق ابیہا کے کردار پر تہمت لگا کر اتمام حجت کر دی۔ ابیہا کے والدین سمیت ایک ایک نفس نیہا کی گواہی پر ایمان لے آیا تھا۔ شکیلہ بیگم جو بے حد رنجور تھیں بالکل ڈھے سی گئیں۔ ابیہا کے والدین بھی روتے دھوتے چلے گئے اور ننھا دانیال جو فی الوقت ہسپتال میں انڈر آبزرویشن تھا بالکل بے آسرا ہو کر رہ گیا۔ جمیلہ بیگم کینیڈا واپس جانے کی تیاری کر چکی تھیں انہوں نے دانیال کو لیلیٰ کی گود میں دے کر اسے سمجھایا کہ وہ کچھ عرصے اس بچے کو پالے اور اس گھر میں قدم جمائے اور پھر جائیداد سمیٹ کر کینیڈا چلی آئے۔ لیلیٰ پہلے پہل اس ذمے داری کو بوجھ سمجھ کر سہ گئی۔ اسکا سارا دھیان جائیداد پر قبضہ جمانے پر تھا شکیلہ بیگم تو ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھی تھیں۔ لیلیٰ نے ہمدردی جتا کر ان سے آہستہ آہستہ انکے اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈز ہتھ لیا لیے۔ اسی دوران نیہا اور ابیہا کے ماں باپ بھی باہر چلے گئے۔ گھر میں لیلیٰ کی بڑھتی ہوئی اہمیت سے اکتا کر شزاء اور سکندر الگ گھر میں منتقل ہو گئے۔ اور یوں لیلیٰ سارے گھر پر مکمل راج کرنے لگی۔ مگر اس سب کے دوران جو ایک چیز غیر محسوس طور پر اس پہ حاوی ہو گئی تھی وہ دانیال کی محبت تھی۔ وہ ننھا سا معصوم وجود کب اسکے دل میں اتر گیا اسے پتہ بھی نہ چلا۔ وہ جانے کب اسکے اندر مامتا جگا گیا تھا وہ جان ہی نہ سکی۔ اور جب جانا تو سب کچھ سیٹل ہو جانے کے باوجود وہ واپس کینیڈا نہ جاسکی۔ جمیلہ بیگم بارہا اسے کہتی کہ وہ شکیلہ بیگم سے دولت

ہتھیا کر یہاں چلی آئی مگر وہ انکو ہر ماہ پیسے بھیج دیتی مگر خود واپس نہ جا سکی۔ وہ ننھا سا گلابی وجود جو رات بھر اسکی انگلی اپنی مٹھی میں تھام کر سوتا تھا۔ جس کی نرم گرم سانسوں سے میٹھی سی خوشبو آتی تھی وہ جو اسکو دیکھتے ہی مسکرا کر کلکاریاں مارنے لگتا تھا وہ اسے چھوڑ کر کیسے چلی جاتی۔۔ وہ جس کی ماں بننے کا ڈرامہ کرنے چلی تھی کب اسکے لیے سرتاپا مامتا بن گئی اسے خود بھی علم نہ ہو سکا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انسان کو شکست صرف اسکے اپنے جذبات اور احساسات ہی دے سکتے ہیں۔ باہری کسی طاقت میں اتنا دم نہیں ہوتا کہ وہ کسی انسان کو ہرا سکے۔ لیلی آج آٹھ سالوں بعد اس مقام پر آن رکی تھی کہ اسکو دولت جائیداد کسی چیز سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔۔ اسکی زندگی بس اس ایک لمحے میں مقید ہو گئی تھی جب دانیال نے اسے نفرت انگیز نظروں سے دیکھا تھا۔ ان گزرے برسوں میں اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ بساط یوں اٹے گی۔ ولید کی آمد اور پھر ابیہا کا ملنا۔۔ یہ سب کچھ ایسا ہوا جیسے تند و تیز موجیں ایک لمحے کے اندر اندر شہر کے شہر تباہ کر جاتی ہیں۔ وہ لیلی جمال اصفہانی۔۔ بے حد حسین۔۔ ہر لحاظ سے پرفیکٹ۔۔ جس نے زندگی میں جو چاہا وہ پایا۔۔ جس نے ہار ماننا سیکھا ہی نہ تھا۔۔ وہ ہاری بھی تو کس سے۔۔ اپنی فطرت میں گھلی مامتا سے۔۔ اس کو شہ مات ہو گئی تھی۔۔ مگر کس سے۔۔۔ اپنے آپ سے۔۔



اس بڑے سے ہال نما کمرے میں آج سب جمع تھے۔ ابیہا کے گھر والے جو آج ہی سعودی عرب سے پاکستان پہنچے تھے اور نیہا زبیر اور اپنے بچوں کے ہمراہ۔ ولید نے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے ان سب کو فی الفور پاکستان بلوا لیا تھا۔ جمیلہ بیگم نے آنے سے معذرت کر لی تھی نہ صرف آنے سے بلکہ جو کچھ ہو چکا اس سب کے لیے دلی معذرت کر کے سارا مدعا لیلیٰ اور شکیلہ بیگم پر ڈال کر بری الذمہ ہو گئی تھی۔ ولید کو ان سے غرض بھی نہ تھی۔ اس نے آج ان سب کو یہاں ابیہا کی ایماء پر جمع کیا تھا وہ ایک بار اپنے ماں باپ سے سوال کرنا چاہتی تھی کہ انہوں نے اسکو تلاش کیوں نہ کیا۔ کیوں اسکو مجرم مان لیا بغیر کسی ثبوت کے۔۔

اب جبکہ ساری حقیقت کھل چکی ہے تو میں صرف اتنا جاننا چاہتی ہوں امی کہ آپ دونوں نے میرے بچے کو غیر عورت کی گود میں کیوں ڈال دیا تھا۔ ابیہا کی آواز کمرے میں گونجی تھی۔ امی نے اپنا بڑھاپے کے اثرات سے مرجھایا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔

ہم کیا کرتے۔ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے تھے۔ بس یہاں سے جانا ہی واحد حل تھا۔ انہوں نے کمزور سے لہجے میں جواب دیا۔

میں پوچھتی ہوں آخر میرے کردار میں ایسا کونسا کھوٹ دیکھا تھا آپ سب نے کہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ایمان لے آئے نہیہا کی جھوٹی گواہی پر۔ اسنے

سب کو مخاطب کیا تھا۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

بیٹا ہم مجبور تھے۔ ابو نے اپنا دفاع کرنا چاہا۔

نہیں ابو مجبور کوئی نہیں ہوتا۔ ترجیحات کی بات ہوتی ہے۔ آپ سب نے اپنے اپنے فائدے دیکھے۔ میں تو کسی کے لیے کبھی بھی اہم نہیں تھی۔ ہمیشہ آپ لوگوں کو بوجھ لگی میں۔ میری فطرت کی اچھائی میری سادگی سے خار کھاتے رہے آپ سب۔ مجھے ولید جیسا شریک سفر ملا تو حسد کرنے لگے آپ لوگ مجھ سے۔ میں نے ساری زندگی اپنی اچھائی کے طعنے سنے۔ آپ سب نے میرے رویوں سے وہ وہ مطالب اخذ کیے جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ سسرال ملا تو وہ بھی ایسا ہی حاسد۔ کینہ پرور۔ آپ سب لوگوں نے مجھ سے صرف اختلاف پالے۔۔ بغیر کسی وجہ کے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں می آپ کو کیا ضرر پہنچایا تھا میں نے جو آپ نے لیلیٰ کے آتے ہی میرا جینا حرام کر دیا تھا۔ آپ بتائیں سکندر بھائی آپ نے میرا دفاع کیوں نہ کیا۔۔ تم بولو شزاء تم کو مجھ سے ایشو تھا۔ اور تم بتاؤ لیلیٰ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ کیا ولید تمہارے شوہر تھے جن کو میں نے چھینا یا وہ تم سے محبت کے دعوے دار تھے۔۔ جب ایسا کچھ تھا ہی نہیں تو تم نے مجھ سے اتنا حسد کیوں کیا۔۔ آپ سب کے حسد نے میری زندگی کے سات سال نگل لیے۔۔

آپ سب جو ولید سے محبت کے دعوے دار ہیں۔ مجھ سے محبت کے دعوے دار

ہیں در حقیقت صرف مفاد پرست ہیں۔ سب نے اپنا فائدہ دیکھا۔ نہیہا کو زیر سے شادی کرنا تھی تو میری شادی ایک جاہل ان پڑھ سے کروانے کی ڈیل کر لی۔ سسرال سے چھٹکارا چاہیے تھا تو میرے کردار پر تہمت لگادی۔ امی ابو کو باہر جانا تھا تو مجھ سے میری اولاد سے پیچھا چھڑوا کے نہیہا کے بتائے جھوٹ کو سچ مان کر چلتے بنے۔ لیلیٰ کو پیسہ چاہیے تھا تو ولید سے محبت کا نالک رچا لیا۔ میری اولاد مجھ سے ہتھیالی۔ شکیلہ بیگم کو کینیڈا جانے کا شوق ستایا تو کینیڈین نیشنل بھانجی کو بہو بنانے کا خواب دیکھنے لگیں۔ سکندر صاحب اور شہزاد بیگم کو ایک الگ گھر اور الگ بزنس چاہیے تھا تو مجھ پر اور میری اولاد پر لعنت بھیج کر چل دیئے۔

میں تو محبت سے زیر ہو جانے والوں میں سے تھی۔ مگر سب نے اپنا فائدہ دیکھا۔ زندگی تو فائدوں کے گرد گھومتی ہے۔ جہاں فائدہ ہی نہ ہو وہاں محبت کا کیا کام۔ انسانوں سے تھوڑی ہوتی ہے محبت۔ فائدوں سے ہوتی ہے۔ وہ متاسفانہ انداز میں بول رہی تھی۔ ولید کی سیاہ آنکھوں میں کرب کی لکیریں تھیں۔ اور شان و شوکت کے نشے میں چور یہ پورا خاندان آج اس عام خاندان کی عام شکل و صورت والی لڑکی کی باتوں کے سامنے لاجواب ہو گیا تھا۔

میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ مجھے ہی کیوں نفرتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مجھے ہی کیوں مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے شاید میں ہی بری ہوں مگر آج اپنی زندگی کے اتنے سال کھو دینے کے بعد میں نے جانا ہے کہ میں بری نہیں برے

آپ سب ہیں۔ میرا قد اس گروہ میں سب سے اونچا ہے تبھی تو مجھے باتیں سننے کو ملیں میرے ساتھ عملاً برا کیا گیا۔ جو اچھا ہوتا ہے اللہ کے قریب ہوتا ہے پتھر بھی اسی کو پڑتے ہیں۔ یہی زندگی ہے۔۔ یہی جینا ہے۔ اسنے اپنے چہرے سے آنسو پونچھے تھے۔

میں آج یہ کہتی ہوں کہ میرے دل میں کسی کے لیے کوئی جگہ نہیں میں اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرونگی ایسی زندگی جس میں کسی مفاد پرست گروہ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ چلیں ولید۔ وہ ولید کی طرف پلٹی تھی اور وہ میکا کی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دانیال دوڑ کر ولید کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ اسنے جھک کر اسے گود میں اٹھایا اور ابیہا کا ہاتھ تھاما۔ وہ تینوں کمرے سے چلے گئے تھے۔ اور بت بنے بیٹھے ان تمام نفوس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں کوئی جنبش نہ تھی۔ وہ سب آج ہار گئے تھے۔



مجھے چھوڑ کر مت جاؤ ولید۔ شکلیہ بیگم اسکے سامنے تھیں۔ ولید نے نظر اٹھا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ ملگجے سے سفید کپڑوں میں ملبوس چاندی کے تاروں جیسے بال بکھرائے جھریوں زدہ چہرے والی اسکی ماں اس شکلیہ کا سایہ بھی نہ لگتی تھی جس کی شاندار شخصیت کے سامنے مرد بھی جھجک جاتے تھے۔ اسکے دل پر جیسے گھونسا پڑا تھا۔ وہ تینوں اس وقت اپنا سامان گاڑی میں رکھوا رہے تھے۔ ابیہا دانیال کے ہمراہ داخلی دروازے سے باہر نکلی اور ان دونوں کو دیکھ

کر رک گئی۔

مجھے جانا ہے مُمی۔ وہ جب بولا تو اسکا لہجہ مدھم تھا۔

اپنی بوڑھی ماں کو کس کے سہارے چھوڑ کر جارہے ہو ولی۔ انکی سبز دھندلائی ہوئی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

سکندر بھائی ہیں شزاء بھابھی ہیں لیلیٰ ہے۔ آپ اکیلی تو نہیں۔

کوئی بھی نہیں میرا کوئی بھی نہیں۔ سکندر کہتا ہے جو آپ نے کیا اسکی سزا اکیلے بھگتیں۔ لیلیٰ بیچاری کہاں تک دیکھے مجھے اسکی بھی تو کوئی زندگی ہے۔ وہ رو پڑی تھیں۔ ابیہا کی پلکیں نم ہونے لگیں۔

مُمی آپ سکندر بھیا کو کہیں وہ ادھر آکر رہیں اب تو گھر خالی ہو گیا ہے نہ ابیہا ہے نہ ابیہا کا بچہ جس کے ہونے سے آپ لوگوں کا سٹینڈرڈ ڈاؤن ہوتا تھا۔ نا چاہتے ہوئے بھی اسکا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔

وہ سب چلے گئے ہیں ولی۔ اس عالیشان محل میں میں اور لیلیٰ تنہا رہ جائینگے۔

تو مُمی آپ کو اور لیلیٰ کو یہی سب تو چاہیے تھا یہ عالیشان محل شان و شوکت۔ یقین مانے مُمی سوسائٹی میں آپکی بہت عزت ہے۔ میں نے کسی کو حقیقت سے آگاہ نہیں کیا اور نہ کرونگا۔ ذلت و بدنامی کا جو داغ میرے اور ابیہا کے ماتھے پر لگ چکا ہے ہم اسی کیساتھ جی لیں گے اک دوسرے کے سہارے۔ اسنے

نرمی سے ماں کی گرفت سے اپنا بازو چھڑوایا تھا۔ ایہا نے گہری سانس بھر کر دانیال کی انگلی تھام کر قدم آگے بڑھائے۔ وہ شکیلہ بیگم کی رحم مانگتی نظروں کو نظر انداز کر کے پورچ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

مجھے معاف کر دو ولی مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ انہوں نے منت کی تھی۔

ممی میں کوئی نہیں ہوتا آپکو معاف کرنے والا۔ مجھے آپ سے بس ایک شکوہ ہے۔۔ میں اپنی بیوی اور بچے کو آپکے سہارے چھوڑ کر گیا تھا مگر آپ میرے آشیانے کی حفاظت نہ کر سکیں۔ اگر صرف مجھ پر منحصر ہو تو میں ساری زندگی آپکے قدموں میں گزار دوں مگر اب بات میری بیوی اور بچے کی ہے۔ ایہا کو آپ پر اعتبار نہیں ہے اور اب اسکا یہ حق ہے کہ وہ مجھ سے مطالبہ کرے کہ میں آپکو چھوڑ دوں۔ کیونکہ اس ساری صورتحال میں سب سے زیادہ

suffer

اس نے کیا ہے۔ میں اب اسے کسی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ آتم سوری۔ مجھے جانا ہوگا۔ اللہ حافظ۔ ماں کی پیشانی چوم کر اسنے جانے کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔ پورچ کی جانب جہاں اسکی محبت اور اسکی کھیتی (اولاد) اسکے منتظر تھے۔ شکیلہ بیگم کی حسرت بھری نظروں نے دور تک ان کا پیچھا کیا تھا۔



خالہ۔ وہ اپنے کمرے میں اندھیرا کیے لیٹی تھی جب لیلا اندر داخل ہوئی اور سوئچ بورڈ پر ہاتھ مار نائٹ بلب روشن کر دیا۔ وہ بمشکل اوپر ہو کر بیٹھیں۔ لیلا مناسب چال چلتی انکے سامنے آ بیٹھی۔

بولو بیٹا۔ انکے لہجے میں نقاہت تھی۔

خالہ میں واپس کینیڈا جا رہی ہوں۔ انکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

تم بھی جا رہی ہو۔ انکی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔

مجھے تو جانا ہی تھا خالہ۔ اسکا گلا رندھ رہا تھا مگر وہ ضبط کر رہی تھی۔

میں اکیلی رہ جاؤنگی اس تنہائی کے عذاب کو بھگتنے کے لیے۔

تنہائی تو ہم دونوں کا مقدر ہے خالہ چاہے ساتھ رہیں چاہے الگ الگ۔ اس نے ایک طویل سانس بھری۔

ساتھ رہیں گے تو اک دوسرے کا دکھ تو بانٹ سکیں گے۔

یہ دکھ وہ ہے جو کہہ کر بیان نہیں جا سکتا خالہ۔ اس دکھ کو کوئی نہیں بانٹ سکتا۔ اسنے نفی میں سر ہلایا تھا۔

میں تمہاری مجرم ہوں بیٹا۔

نہیں خالہ۔۔ اس دنیا میں کوئی کسی کا مجرم نہیں ہوتا۔۔ ہر نفس اپنے کیے کا

بدلہ پاتا ہے۔ ہر وہ کہ جو رنجور ہے وہ اپنے وجود کی قبر میں گڑھا ہے۔ ہر وہ کہ جو شاد ہے وہ اپنے من کے اجالے کے باعث سرشار ہے۔ کوئی کسی کا مجرم نہیں ہوتا۔ ہر انسان خود اپنی ذات کا مجرم ہوتا ہے۔ میں اپنی مجرم ہوں آپ اپنی مجرم ہیں۔ نہ میں آپکو بلیم کر سکتی ہوں نہ آپ مجھے۔ وہ بولتے بولتے تھک گئی تو چپ ہو گئی۔ شکیلہ بیگم کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ پچھتاوا بہنے لگا تھا۔

میری صبح کی فلائٹ ہے اور میں کسی سے معافی مانگ کر نہیں جا رہی۔ کیونکہ معافی کا لفظ نہ تو ابیہا کی تکلیف کم کر سکتا ہے نہ میرا پچھتاوا گھٹا سکتا ہے۔ آپ اپنا خیال رکھیے گا۔ اسنے جھک کر انکے ہاتھوں کو چوما اور اٹھ کر کمرے سے چلی گئی۔ شکیلہ بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر سر بستر کی پشت سے ٹکا دیا۔ حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے آگ لکڑیوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ شکیلہ بیگم نے اپنی زندگی بھر کی نیکیوں کو دھڑ دھڑ جلتے دیکھا تھا۔



لیلیٰ واپس جا رہی ہے۔ ابیہا کی بات سن کر ولید نے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔ وہ بستر کی پشت سے ٹیک لگائے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے ہوئی تھی۔ رات کے نو بجے کا عمل تھا دانیال لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہا تھا اور وہ ابھی گھر آیا تھا۔

تمہیں کس نے بتایا۔

آج می کا فون آیا تھا۔ انہوں نے بتایا۔ اسنے اسی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

می کا فون۔

جی۔۔

ضرور لیلیٰ کی وکالت کر رہی ہونگی۔

نہیں۔۔ بس انہوں نے ایک بات کہی۔

کیا۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

انہوں نے کہا کہ دنیا کا ہر کام فائدے کی بنیاد پر کرنے والی لیلیٰ جمال اصفہانی اپنے دل میں پینتی مامتا سے ہار کر واپس جانے کو ہے۔ اس نے من و عن انکے الفاظ دہرا دیئے تھے۔

تو تم اب کیا سوچ رہی ہو۔

سوچ رہی ہوں اگر لیلیٰ کے دل میں پینتی مامتا بے غرض نہ ہوتی تو دانیال کو کون پالتا۔ مامتا تو بے غرض ہوتی ہے ناں ولید۔ اسنے گردن موڑ کر ولید کی طرف دیکھا تھا۔ اسنے ایک گہری سانس بھری اور عین اسکے سامنے جا بیٹھا۔

تمہارا دل اتنا نرم کیوں ہے بیا۔

کیونکہ میں ان جیسی نہیں ہوں۔ آپ نے ہی تو کہا تھا جو اللہ کے قریب ہوتے ہیں انکے دل نرم ہوتے ہیں۔ وہ ہولے سے مسکرائی تھی دائیں گال میں گڑھا پڑا تھا۔

ممی سے ملنے جاتے رہا کریں۔ انکو بس آپ سے ہی امید ہے۔ ولید کا ہاتھ تھام کر اسے نرم لہجے میں کہا تھا۔

امی ابو واپس جارہے ہیں تم بھی ایک بار ان سے مل لو۔

ٹھیک ہے مل لوں گی۔ اسنے دھیرے سے سر ہلایا۔

چلو اب کھانا کھا لیں۔

آپ فریش ہو جائیں میں کھانا لگاتی ہوں۔ اسنے ولید کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی ولید نے بھی تمام سوچیں جھٹک دیں اور اٹھ کر ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔



اسلام آباد کے بین الاقوامی ہوائی اڈے کے ویٹنگ روم میں بیٹھی لیلا کے چہرے پر سنجیدگی کے ڈیرے تھے۔ سیاہ شلوار قمیض میں ملبوس دوپٹہ سینے پر پھیلائے گریبان پر سیاہ سن گلاسز اٹکائے وہ گردو نواح پر خالی خالی نظریں ڈال رہی تھی۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا وہ ہار چکی تھی مگر جانے کیوں اسکا دل منتظر تھا۔ اس ننھے سے وجود کا جس کی محبت نے اسکے دل کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ

جانتی تھی اسکی بری نیت اور لالچ نے اس سے سب کچھ چھین لیا ہے اسکے پاس سوائے دولت کے کچھ نہ بچا تھا۔ ولید نے باپ کی جائیداد میں بنتا اپنا تمام تر حصہ جیلہ بیگم کو بھجوا دیا تھا۔ وہ دونوں اب کینیڈا میں ایک خوشحال زندگی گزار سکتی تھیں۔ آٹھ سالوں کے طویل عرصے کے بعد مشن کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ مشن جو اسے آٹھ سال قبل پاکستان لیکر آیا تھا۔ مگر کوئی لیلیٰ سے پوچھتا تو وہ کہتی کہ مجھ سے ساری دولت لے لو مجھے جھونپڑی میں رہنا فاتے برداشت کرنا قبول بس مجھے میرا دانی واپس کر دو۔ مجھے وہ ننھا سا وجود واپس کر دو جس کے منہ سے نکلا ماما کا لفظ میرے دل میں ٹھنڈک بھر دیتا تھا۔

مگر وہ کس سے فریاد کرتی۔۔ یہ تو اسکی سزا تھی اور اسے اس سزا کو اب ساری عمر بھگتنا تھا۔

فلائٹ کا اعلان ہونے لگا تو اسنے اپنی آنکھوں میں اترتی نمی کو چھپانے کی خاطر سن گلاسز لگائیں اور اپنا بیگ کاندھے پر ڈالے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسکا مختصر سا سوٹ کیس اسکے پیروں کے پاس رکھا تھا۔ اسنے اسکا ہینڈل تھام کر قدم کسٹم کی جانب بڑھائے۔

ماما۔۔ ایک مانوس سی پکار پر وہ بے تحاشہ رکی تھی۔ مگر مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ سب سماعتوں کا دھوکہ بھی تو ہو سکتا تھا وہ تیز قدموں سے چلنے

لگی۔

ماما رک تو جائیں۔ اب کی بار ننھے ننھے قدموں کی چاپ بھی اسکے تعاقب میں تھی وہ بے اختیار پلٹی۔ بلیو جینز پر بلیو شرٹ پہنے سر پر پی کیپ پہنے ننھا دانیال بھاگتا ہوا اسکی جانب آرہا تھا۔ لیلیٰ کے ہاتھ سے سوٹ کیس کا ہینڈل چھوٹ گیا اور وہ بے تحاشا زمین پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ دانیال بھاگتے ہوئے اسکی بانہوں میں سما گیا تھا۔

ماما میں آپکو سی آف کرنے آیا ہوں۔ اسنے اپنا تنفس بحال کرتے ہوئے اسے بتایا تھا۔ لیلیٰ نے اسکا ماتھا چوما۔

کس کیساتھ آئے ہو دانی۔

ماما بابا کیساتھ۔ اسنے جواب دینے کیساتھ ساتھ پیچھے پلٹ کر بھی دیکھا۔ لیلیٰ نے سر اٹھایا۔ ولید اور ایہا ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آرہے تھے۔ صدا کے صاف دل۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فلائٹ کا اعلان پھر سے ہونے لگا تھا۔ اسنے پلٹ کر دیکھا۔

مجھے جانا ہے دانی۔ اس نے دانیال کی طرف دیکھا۔

ٹھیک ہے ماما آپ جائیں۔ میں کبھی کبھی آپ سے ملنے کینیڈا آجایا کرونگا ماما بابا کیساتھ۔ وہ خوش تھا۔ لیلیٰ بمشکل مسکرائی۔

تھینک یو۔ اسنے تشکر آمیز نظروں سے ایہا اور ولید کی طرف دیکھا تھا۔

تمہاری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔ ولید نے سنجیدہ آواز میں کہا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر پلٹ گئی۔ اسکو پلٹ کر نہیں دیکھنا تھا کہ وہ پتھر کی نہ ہونا چاہتی تھی۔ مگر جاتے جاتے ایک بار وہ خود کو پلٹ کر دیکھنے سے روک نہ سکی تھی۔ ایہا اور ولید ایک دوسرے کیساتھ کھڑے تھے اور دانیال ان دونوں کے پاس کھڑا اسے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ایک پرفیکٹ فیملی۔ لیلیٰ کی آنکھیں دھندلانے لگیں تو اسنے آنکھوں پر گلاسز لگالی اور جانے کو پلٹ گئی۔ اسکے قدموں میں بجلی بھر گئی تھی۔ آٹھ سال قبل پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے اسے معلوم نہ تھا کہ اسکی واپسی یوں ہوگی کہ اسکے پاس دولت کے سوا کچھ بھی نہ رہے گا۔



نیہا نے کمرے کا دروازہ کھولا تو زبیر کو سامان پیک کرتے ہوئے پایا تھا۔ وہ کچھ حیران سی ہوتی آگے بڑھی۔

آپ کہیں جارہے ہیں۔

ہاں واپس جارہا ہوں۔ اسنے اسکی طرف دیکھے بغیر جواب دیا تھا۔

اور میں اور بچے۔

پیسے بھیجتا رہوں گا۔

پیسے۔ کیا مطلب ہے آپکا۔ آپ یہاں مجھے اور بچوں کو تنہا چھوڑ کر چلے جائینگے۔ اسنے اسکے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسکا رخ اپنی جانب موڑا تھا۔

ہاں جارہا ہوں میں۔ تمہاری سزا میں شریک نہیں بن سکتا۔ غلطیاں تم نے کیں میں کیوں بھگتوں۔ اب تو وہ لیلیٰ پیسے بھی نہیں دیا کرے گی اور میری نوکری کا بہت حرج ہو گیا تم رہو اب ادھر بچے پالو اور مجھے میری زندگی جینے دو۔ اسنے بے مروتی سے کہا تھا مگر جواباً انہا کے زوردار طمانچے نے اسکے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔

احسان فراموش انسان اگر آج ہم پر یہ وقت آیا ہے تو تم بھی اسمیں برابر کے شریک ہو۔ میں نے ایسا کیسا تھ جو جو زیادتیاں کیں اسکے پس پردہ تمہاری محبت تمہارا مفاد کار فرما تھا۔ جب میں نے تم سے ڈیل کر کے ایسا کے رشتے کی بات کی تھی تب تم نے مجھے کیوں نہ شٹ اپ کال دی تھی جب لیلیٰ نے مجھے ایسا کے خلاف گواہی دینے کا کہا تھا تب تم نے کیوں نہ کہا کہ لعنت بھیج دو نیہا ویزے پر ہم فاقے کر لیں گے مگر تمہمت نہیں لگائیں گے۔ اگر بری میں ہوں ناں زبیر تو برے تم بھی ہو۔ اور اب یہ عذاب میں اکیلے نہیں بھگتوں گی تم بھی میرے ساتھ بھگتو گے۔ وہ بہتے آنسوؤں کیساتھ جارحانہ انداز میں بولتی چلی گئی تھی۔ زبیر دھیما پڑ چکا تھا۔ نیہا نے اسکے سامنے آئینہ رکھا تھا اور سچ تو یہی ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے کی گناہوں میں پشت پناہی کرتے ہیں وہ اک دوسرے کی سزا میں بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

اب سزا یہی ہے زبیر کہ ہم اسی ملک میں رہیں گے اسی گھر میں اور اپنی زندگی کو زیرو سے شروع کریں گے۔ جو کچھ پس انداز کیا ہے اس سے تم کوئی کاروبار آرام سے شروع کر سکتے ہو۔ یہاں آسان حل پیش کر دیا تھا۔ زبیر نے سر ہلادیا۔ ان کے پاس واقعی اتنا جمع جتھا تو تھا کہ وہ ایک کاروبار شروع کر سکتا۔ ان کے پاس ایک مالی طور پر اچھی زندگی گزارنے کے وسائل موجود تھے مگر آج سے جو چیز ان کے درمیان عنقاء ہو گئی تھی وہ خلوص تھا۔ خلوص جو دولت کے پہاڑ کے عیوض نہیں مل سکتا۔ خلوص جو انمول ہوتا ہے۔

کچھ لوگ ابو جہل کی فطرت رکھتے ہیں ان کے پاس رب کی جانب سے کھلی نشانیاں آ جاتی ہیں ان کے دل جان لیتے ہیں کہ سچائی کیا ہے مگر وہ اقرار نہیں کرتے اپنی ڈگر نہیں چھوڑتے۔ یہاں اور زبیر بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جو جان چکے تھے کہ انہوں نے ایسا کیسا تھ غلط کیا وہ اسکی اچھائی کو جان چکے تھے مگر اسکے سامنے اپنی غلطی تسلیم نہ کر سکتے تھے۔ اور ایسے لوگوں کیلئے اس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ساری عمر مفاد پرستی میں گزار دیں۔ محبتوں سے پرے۔ صرف فائدے نقصان کا حساب لگاتے ہوئے۔ یہی اللہ کا انصاف ہوتا ہے۔



امی ابو عامر کے پاس واپس جا رہے تھے اور ایسا انکو رخصت کرنے ہوئی اڈے پر آئی تھی۔ امی ابو نے اس سے معافی نہ مانگی تھی۔ وہ اپنی اخیر عمر اپنے بیٹے

اور بہو کے پاس سکون سے گزارنا چاہتے تھے۔ بیٹیاں بیاہ دینے کے بعد بس بیٹوں سے ہی غرض رکھنے والے ٹیپیکل ماں باپ۔۔۔

ایہا نے ان سے کوئی شکوہ نہ کیا تھا۔ اسے ان سے کوئی شکوہ تھا بھی نہیں۔ وہ اس معاشرے کے پروردہ وہی ٹیپیکل سوچ رکھنے والے بیٹوں کو بوجھ سمجھنے والے لوگ تھے۔ ان کو بس بوجھ سر سے اتارنا تھے پھر چاہے کیسے بھی اتر جاتے۔

ایہا نے انکو مسکرا کر الوداع کہا تھا اور انکے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد اسکی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ وہ جانتی تھی اس نے آج اپنے ماں باپ کو آخری بار دیکھا ہے۔ آگاہی کیسا بڑا عذاب ہے۔ یہ اس نے جان لیا تھا۔



آج بہت دنوں بعد وہ دونوں راول جھیل کی سیر کو آئے تھے۔ وہ دونوں جھیل کے قریب بنے چبوتروں میں سے ایک پر نصب سنگی بنچ پر بیٹھے تھے۔ دانیال کچھ فاصلے پر فٹ بال سے کھیل رہا تھا۔ مغربی افق پر شام کی لالی پھیل رہی تھی۔ سورج کی سلطنت پر تاریکی کا راج ہونے کو تھا۔ اس سے یہاں گہما گہمی بہت بڑھ جایا کرتی ہے۔ ہنستے مسکراتے لوگ ادھر سے ادھر پھرتے نظر آتے ہیں۔ ایہا نے گردن موڑ کر اپنے برابر بیٹھے ولید کی طرف دیکھا۔ سیاہ پینٹ شرٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح عام سے حلیے میں بھی جاذبِ توجہ نظر آ رہا

تھا۔

کیا سوچ رہے ہیں ولید۔ اسنے اسے مخاطب کیا۔

کچھ بھی نہیں۔ تم کیا سوچ رہی ہو۔ اسنے گردن موڑ کر اسکی طرف دیکھا۔

سوچ رہی ہوں کہ زندگی کتنی ناقابل فہم ہوتی ہے ناں۔

ہاں سو تو ہے۔ مگر تمہیں نہیں لگتا کپ اس ناقابل فہم زندگی کا ہی مزہ ہے۔

اگر ہم مستقبل کے متعلق سب کچھ جانتے ہوں تو بھلا کیا مزہ آئے گا جینے میں۔ وہ ہر بات کا روشن پہلو دیکھنے کا عادی تھا۔ ایسا کو ایکبار پھر اپنے ہمسفر پر فخر ہوا تھا۔

یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس نے سر ہلا کر تائید کی۔ یاد ہے ولید نکاح سے اگلے روز ہم یہیں آئے تھے۔ اسنے ماضی میں جھانکا تھا۔ ولید دانیال پر نظریں جمائے مسکرایا۔

ہاں اور تم نے ادھر رینگ سے نیچے چھلانگ لگانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اسنے بازو وا کر کے دائیں جانب اشارہ کیا۔ ایسا کی نظروں نے زاویہ تبدیل کر کے اس جانب دیکھا۔

اور آپ نے موٹر بوٹ جس طرح چلائی تھی آل موسٹ مجھے ہلاک کر دیا تھا۔ ان دونوں کے لبوں پر مدھم سی مسکان تھی۔ وہ کھلی آنکھوں سے ماضی کے

خوشگوار لمحوں میں جھانک رہے تھے۔

تم نے کتنا شور مچایا تھا۔ وہ دھیرے سے ہنسا۔

آپ نے بھی تو حد ہی کر دی تھی۔

کیا خیال ہے آج پھر ماضی کی یاد تازہ کی جائے۔ وہ یکدم اسکی جانب مڑا۔

جی نہیں۔ میری توبہ۔ ابیہا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

اوہ کم آن بیا۔ بہت مزہ آئے گا۔ دانی۔۔ دانی کم ہسیر۔ اسنے ایکسائٹڈ ہوتے

ہوئے دانیال کو آواز دی۔ وہ اسکی طرف متوجہ ہوا۔

کنگ بابا۔ وہ مسکراتا ہوا دوڑ کر اسکے پاس آگیا۔ ولید نے اسے بازوؤں کے
حلقے میں لے کر اسکے دونوں گال چومے۔

بوٹنگ کریں۔ اسنے اس سے پوچھا۔

یس بابا۔ آئی لو اٹ۔ وہ پرجوش ہوا تھا۔

لو جی دونوں باپ بیٹا ایک جیسے۔ ابیہا نے منہ بنایا۔

اما آپ بھی چلیں بوٹنگ کرتے ہیں۔ دانیال نے اسکے ساتھ لگتے ہوئے لاڈ سے
فرمائش کی تھی۔

بیٹا آپکی اما کو پانی سے بالکل ڈر نہیں لگتا یہ تو سوئمنگ کرنا چاہتی ہیں لیک

میں۔ ولید نے شرارت سے ٹکڑا لگایا۔

ایسی کوئی بات نہیں ہے چلو بوٹنگ کرتے ہیں۔ ولید کو گھورتے ہوئے وہ دانیال کا ہاتھ تھامے اٹھ کھڑی ہو گئی۔

سوچ لو وائفی اب کی بار اگر ہلاک ہو گئی تو میرا ذمہ نہ ہوگا۔ ولید نے اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے اسکے کان میں سرگوشی کی تھی۔

مجھے اپنے شوہر پر پورا بھروسہ ہے وہ مجھے کبھی ضرر نہیں پہنچے دیں گے۔ طمانیت بھرے لہجے میں جواب دے کر وہ دانیال کا ہاتھ اس جانب کچے کی طرف بڑھ گئی تھی جہاں کرائے کی کشتیاں لنگر انداز رہتی ہیں۔ ولید کے ہونٹوں پر بھر پور مسکراہٹ ابھری تھی اگلے ہی لمحے وہ بھی مسکراتا ہوا انکے پیچھے تھا۔ سورج مغرب کی آغوش میں چھپ گیا تھا۔



شکیلہ بیگم چپ چاپ ایک لان چمیر پر بیٹھی آسمان پر قطار در قطار اڑتے پرندوں کو تک رہی تھیں جب پورچ میں ایک سیاہ رنگ کی کرولا آکر رکی۔ انہوں نے دھیان نہ دیا۔ گاڑی سے ولید اتر کر انکی طرف چلا آیا تھا۔ السلام علیکم ممی! اسنے ماں کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ بے تحاشا چونکی۔ ولی۔۔ انکی آواز میں حیرت تھی۔

جی می میں آپکا ولی۔ وہ انکے پیروں کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔ انہوں نے نم آنکھوں سے اسکا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔
تم آگئے۔

جی می اور آتا جاتا رہوں گا۔ آپ بھی ہمت کریں اور آفس جانا شروع کریں۔
میں نے آپکو ہمیشہ ایک مضبوط خاتون کے روپ میں دیکھا ہے۔ یہ ہارا ہوا
روپ آپ پر بالکل سوٹ نہیں کرتا۔ انکے ہاتھ چومتے ہوئے اسنے محبت سے
کہا تھا۔

تم مستقل میرے پاس رہ جاؤ ناں۔
نہیں رہ سکتا می۔ میری اپنی بھی فیملی ہے اور پھر میرا کام۔ لیکن یہ میرا وعدہ
ہے آپ سے کہ میں آپ سے بے پرواہ کبھی نہیں ہوں گا۔ اس نے مضبوط
لہجے میں کہا تھا۔

سکندر سے کہو مجھ سے مل لے۔ انکے آنسو اب گالوں پر راستہ بنا رہے تھے۔
وہ بھی آئینگے می۔ فکر مت کریں۔ جیسے ناخنوں سے ماس جدا نہیں ہو سکتا اسی
طرح ماں سے اولاد الگ نہیں ہو سکتی۔ آپ ہم تینوں کا محور ہیں ہمیں آپ ہی
کے گرد گھومنا ہے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اسکے لہجے میں کیسی محبت تھی۔
شکیلہ بیگم کا پچھتاوا بڑھنے لگا۔ کیا بھلا ہوتا جو اگر وہ ابیہا کو دل سے تسلیم
کر لیتیں تو آج یہ تنہائیاں انکا مقدر نہ بنتیں۔ اپنے آشیانے کو آگ لگانے کے

لیے ایندھن تو لیلیٰ اور جمیلہ کو انہوں نے ہی فراہم کیا تھا۔ یہ پچھتاوا تو اب ساری عمر ہی رہنا تھا۔

کاش میں جمیلہ اور لیلیٰ کی بات نہ مانتی جب لیلیٰ نے مجھے کہا تھا کہ وہ میری بہو بننا چاہتی ہے تب میں اسکو شٹ اپ کال دیتی اور اسے کہتی کہ میری بہو بہت اچھی ہے تو سب کچھ اچھا ہی رہتا ولی۔ انسان کیسا جلد باز ہوتا ہے ناں۔ میں نے جانا ہی نہیں کہ جن سہاروں پر میں تکیہ کر رہی ہوں وہ کیسے ناپائیدار ہیں۔ انکی آنکھوں سے آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔ ولید نے اٹھ کر انکا سر اپنے ساتھ لگالیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں اور ولید کے پاس انکو دلاسا دینے کے لیے الفاظ نہ تھے۔ اور شکلیہ بیگم کو اب تا عمر رونا تھا وہ مکمل قصور وار نہ تھیں مگر انکی ذرا سی لغزش نے اس آشیانے کو تباہ کر دیا تھا تنکا تنکا بکھیر دیا تھا۔ ایکبار انہوں نے اپنی دولت اپنے مرتبے اور خاندانی وقار پر غرور کیا اور قدرت نے انکے غرور کا کیسا انجام لکھا۔ انکے اونچے خاندان کے سبھی پردوردہ ان کو چھوڑ گئے تھے۔ انکی اکلوتی بیٹی انکا بیٹا اعلیٰ خاندان سے لائی گئی بہو سب نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ انکے پاس تھا تو بس انکا یہ بیٹا جس کی تباہی کی ذمہ دار وہ خود تھیں۔ جسکی بیوی کی عزت وہ نہ کر سکی تھیں۔ شکلیہ بیگم سے زیادہ بھی بد قسمت کوئی ہو سکتا تھا اس دنیا میں کہ جنہوں نے اپنے گھمنڈ کے ہاتھوں اپنے ہنستے بستے آشیانے کو تباہ کر ڈالا تھا۔



حیدر گھر آیا تو ننھی زینب کو کچے صحن کے فرش پر بیٹھے انہماک سے مٹی کھاتے ہوئے پایا تھا۔

ارے یہ کیا ہو رہا ہے گندی بچی۔ اسنے دوڑ کر اسے گود میں اٹھایا۔ بچی مچلنے لگی۔ اسکو اپنی من پسند ایکٹیوٹی کو بریک لگنے پر غصہ آگیا تھا۔

فاطمہ۔۔ فاطمہ کہاں ہو تم وہ فاطمہ کو آوازیں دیتا ہوا باورچی خانے میں آیا تو اسے پتیلی میں چچج ہلاتے ہوئے پایا۔

تم ادھر ہو اور یہ تمہاری لاڈلی باہر مٹی سے شغل کر رہی تھی۔

میں تنگ ہوں اس لڑکی سے ذرا میری نظر ادھر ادھر ہوتی ہے اور یہ رینگتی ہوں باہر نکل جاتی ہے۔ فاطمہ نے برا سا منہ بنایا۔

تم پر ہی گئی ہے۔ گندی بچی۔ حیدر نے محبت سے بچی کا مٹی سے لتھڑا ہوا منہ چوم لیا۔ وہ جواباً خوشی سے قلقاریاں مارنے لگی تھی۔

مجھ پر نہیں آپ پر گئی ہے اماں مرحومہ بتایا کرتی تھیں کہ آپ کو بچپن میں مٹی کھانے کی عادت تھی۔ فاطمہ نے پتیلی ڈھک کر پیڑھی سے اٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔ حیدر نے پیار سے اسکا گال تھپتھپایا۔

تو جناب کونسا آپ نے مٹی نہیں کھائی ہوگی اپنے بچپن میں۔

میں بہت اچھی بچی تھی صاف ستھری۔ وہ اسکی سائیڈ سے ہو کر باورچی خانے

سے باہر نکل آئی۔ حیدر اسکے پیچھے پیچھے تھا۔

تمہیں کونسا اپنا بچپن یاد ہے۔

یاد ہے مجھے۔ فاطمہ نے ننھی زینب کو اسکی گود سے لیا اور صحن میں ایک جانب لگے پائپ کی تیز دھار کھول کر اسکا منپ دھلوانے لگی۔

ارے فاطمہ تمہیں ایک بات بتانا تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

کیا۔ اسنے پائپ کی دھار بند کر کے زینب کا منہ اپنی چادر کے پلو سے خشک کیا۔

ہم سب دوستوں نے مل کر اپنا اخبار شروع کیا ہے جو خالصتاً مسلمانوں کا اخبار ہوگا۔ اسکے ذریعے ہم کشمیر کے مسلمانوں میں شعور بیدار کریں گے کہ انکو اپنی آزادی کی جنگ کو کن خطوط پر استوار کرنا چاہیے۔

یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ لیکن وہ اخبار کس زبان میں شائع ہوگا۔

ابھی شروع شروع میں تو صرف اردو میں مگر ہماری ٹیم اس پر کام کر رہی ہے جلد ہی چند اہم علاقائی زبانوں میں بھی اسکی اشاعت کو ممکن بنایا جاسکے۔ ہم سب نے مل کر یہ سوچا ہے فاطمہ کہ ستر سالوں سے وادی کے مسلمان کسی سیٹ پلان کے فقدان کے باعث صرف جانیں قربان کر رہے ہیں آزادی تب تک ممکن نہ ہوگی جب تک ہم ایک پر اپر ایجنڈا لے کر نہ چلیں گے۔ وہ اسے

تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔ شردھا بھی اسکے پاس ہی آ بیٹھی۔

یہ بات بالکل ٹھیک کہی آپ نے۔ ادھارک کہتا تھا کسی بھی عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بہترین حکمتِ عملی کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہتا تھا کہ جنگ میں ہار جیت پلاننگ سے ہوتی ہے فاطمہ کو اکثر ولید کے اقوال دہرانے کی عادت تھی۔

ٹھیک کہتا تھا وہ بالکل۔ ویسے فاطمہ تم فیسبک پر اسکو تلاش کرو شاید مل جائے۔

ارے یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ فاطمہ کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ فیسبک تو یار آجکل سبھی استعمال کرتے ہیں تم اسکو یا اسکی بیوی کو تلاش کرو۔ نام پتہ ہے ناں اسکی بیوی کا۔ حیدر نے زینب کو اسکی گود سے لیا جو ہمک ہمک کر اسکے پاس آرہی تھی۔

جی یاد ہے ابیہا۔ فاطمہ کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ بس پھر تم ان دونوں کو تلاش کرو مجھے یقین ہے کہ مل جائینگے۔ حیدر نے زینب کو اپنی گود میں کھڑا کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔ فاطمہ نے بے خیالی میں سر ہلا دیا۔ حیدر کی تجویز اسکے دل کو لگی تھی۔



کچھ ماہ بعد۔۔

ولید کافی دنوں بعد گھر پر موجود تھا۔ دانیال کیساتھ لاؤنچ میں ہی فٹبال کھیلتے ہوئے وہ کافی فریش نظر آرہا تھا۔ ابیہا لیپ ٹاپ کھولے ایک جانب کاؤچ پر نیم دراز تھی۔ اسنے دوبارہ سے یونیورسٹی جوائن کر لی تھی اور اپنی تعلیم مکمل کر رہی تھی۔ زندگی کافی حد تک نارمل ڈگر پر آچکی تھی۔

ولید بات سنیں۔ اسنے یکدم اسے پکارا۔

جی جانِ من۔ فٹ بال کو زوردار کک لگاتے ہوئے وہ وہیں سے بولا تو دانیال کھی کھی کرنے لگا۔

یہ مجھے فیسبک پر کسی فاطمہ حیدر کا میسج آیا ہوا ہے کیا آپ ولید حسن کی وائف ہیں۔ اس نے لیپ ٹاپ کی سکرین پر نظریں جمائے ہو بتایا تھا ولید یکدم ساکت ہو گیا۔

کون کس کا نام لیا تم نے۔

فاطمہ حیدر۔ جموں کشمیر میں رہتی ہے اسنے بتایا تھا ولید فٹ بال وہیں چھوڑ کر تیر کی طرح اس کے پاس آیا اور لیپ ٹاپ اس سے لیکر وہیں زمین پر بیٹھ گیا اسکی نظریں بے قراری سے لیپ ٹاپ کی سکرین پر رینگ رہی تھیں جس پر ابیہا کی فیسبک کھلی ہوئی تھی اور فاطمہ کا میسج اسکی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ آنلائن تھی۔ اسنے جلدی سے میسج ٹائپ کیا۔

آر یو شردھا۔

جی۔ ایک لمحے کی بھی تاخیر سے جواب آگیا تھا۔ ولید کی پلکوں پر نمی سی چمکی تھی اسنے ویڈیو کال ملائی جو کہ ریسو کر لی گئی تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ اسکے سامنے تھی۔ صدا کی حسین و جمیل۔۔۔ سیاہ چادر میں لپیٹی۔۔۔ پاکیزہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے۔

ادھارک۔۔۔ وہ جب بولی تو اسکی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ابیہا بھی آگے جھک کر دیکھنے لگی۔

ہاں میں۔۔۔ شردھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ فاطمہ کے عقب سے ایک جانا پہچانا چہرا ابھرا تھا۔ ولید ایک لمحے میں پہچان گیا وہ حیدر تھا۔ پہلے سے بھی زیادہ ہینڈ سم۔۔۔

تو آخر ڈھونڈ ہی نکالا اس نے آپکو۔ وہ فریش انداز میں بولا۔ کیسے ہیں ولید صاحب۔

میں بالکل ٹھیک ہوں تم کیسے ہو۔

کرم ہے مولا کا۔ یہ آپکے ساتھ بھابھی صاحبہ ہیں۔

ہاں۔ یہ میری بیوی ابیہا ہیں۔ ولید نے تعارف کروایا تھا۔

کیسی ہیں ابیہا۔ فاطمہ جلدی سے بول اٹھی۔

میں بالکل ٹھیک آپ کیسی ہیں بہت ذکر کرتے ہیں ولید آپکا۔ ابیہا نے خوش اخلاقی سے کہا تھا۔ فاطمہ کی سبز آنکھوں میں نمی سی چمکی۔

میں تو سمجھتی تھی مجھے اب تک بھول چکے ہونگے آپ۔ وہ بمشکل مسکرا کر بولی۔

اپنے محسنوں کو بھی کوئی بھولتا ہے پگلی۔ بائے دا وے کیا میں تم دونوں کو شادی کی مبارکباد دے دوں۔ وہ یکدم شوخ ہوا تھا۔ فاطمہ اور حیدر ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ہنس پڑے۔

صرف شادی کی ہی نہیں بیٹی کی بھی مبارکباد دیجیے ولید صاحب۔ جواب حیدر نے دیا تھا۔

Novels | Afsana | Articles | Books | Poetry | Interviews

ماشاء اللہ بہت بہت مبارک ہو۔ میں تم دونوں کے لیے بہت خوش ہوں۔ فاطمہ واقعی تم جیسا ہمسفر ڈیزرو کرتی ہے۔ ولید نے سچے دل سے کہا تھام فاطمہ کے چہرے پر طمانیت بھری مسکان تھی۔

اپنی بیٹی تو دکھائیں۔ ابیہا نے پراشتیاق لہجے میں کہا تھا۔

ہاں بلاتی ہوں حیدر اسے لائیں۔ فاطمہ نے حیدر سے کہا تو وہ دو ہی منٹ بعد ایک ڈیڑھ سالہ پیاری سی بچی کو گود میں اٹھائے لے آیا تھا۔ وہ بالکل فاطمہ جیسی تھی۔

کتنی پیاری ہے ماشاء اللہ۔ کیا نام ہے۔ ابیہا کو دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

زینب عباس۔ فاطمہ نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

ماشاء اللہ اس بچی کے لیے اس سے اچھا نام اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ولید بولا۔

میں ایک کام سے آتا ہوں ولید صاحب آپ سے تو اب بات ہوتی ہی رہے گی۔ حیدر نے اجازت چاہی تھی۔

ان شاء اللہ ضرور۔ ولید مسکرایا۔

اوکے پھر اللہ حافظ۔ اللہ حافظ بھابھی۔ وہ جانے کو اٹھ کھڑا ہوا ننھی زینب اسکی گود میں تھی۔

اللہ حافظ۔ ابیہا اور ولید یک زبان ہو کر بولے تھے۔

اما یہ کون ہیں۔ دانیال بھی آدھک تھا۔

یہ وہی آنٹی ہیں جنہوں نے انڈیا میں بابا کی جان بچائی تھی۔ ابیہا نے اسے بتایا تو وہ مشتاق ہو کر لیپ ٹاپ پر جھکا۔

السلام علیکم آنٹی۔ میں دانیال ہوں اما پاپا کا بیٹا۔ آپ کیسی ہیں۔ اس نے اپنا تعارف کروایا تھا فاطمہ بے اختیار ہنس دی۔

میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹا آپ تو بہت کیوٹ ہو۔

آپ بھی بہت پیاری ہیں آنٹی۔ دانیال تعریف کرنے کے معاملے میں صدا کا کھلے دل کا مالک تھا بالکل ولید کی طرح۔

اچھا آنٹی میں نوڈلز کھا کر واپس آتا ہوں آپ جانا مت۔ اسنے اسے ہاتھ ہلا کر رخ ابیہا کی طرف موڑا۔

ماما مجھے بس ابھی نوڈلز بنا کر دیں اٹھیں جلدی۔ وہ ضد پر آگیا تھا سو ابیہا کو اٹھتے ہی بنی۔ وہ فاطمہ سے معذرت کرتی اٹھ کر دانیال کو ہمراہ کمرے سے کچن کی جانب چلی گئی تھی۔ ولید نے مسکراتے ہوئے سکرین کی جانب دیکھا۔ تم کیسی ہو شردھا۔

میرا نام فاطمہ ہے ادھارک۔ اسنے تصحیح کی تھی۔
میرا نام بھی تو ولید ہے ناں شردھا۔

مگر میرے لیے تو تم ادھارک ہی ہو۔ میری زندگی میں ہدایت کبھی نہ آتی اگر تم نہ آتے۔

تم بھی تو شردھا ہی ہو۔ وفا کی پیکر۔ وہ مسکرایا تھا۔ اور مسکرا تو وہ بھی رہی تھی۔

تم حیدر کیساتھ خوش ہو ناں۔

بہت خوش ہوں۔ حیدر نے مجھے زندگی کی ہر خوشی دی ہے۔ اسکے چہرے پر

طمأنیت کے آثار تھے۔ ولید کے دل کو یک گونہ تسلی محسوس ہوئی۔
میں تو سمجھتی تھی تم مجھے بھول بھی چکے ہو گے۔

کیسی باتیں کر رہی ہو۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تمہیں بھول جاتا۔ تم تو میری محسنہ ہو۔ یہ زندگی جو میں آج جی رہا ہوں وہ تمہاری ہی مرہون منت ہے۔

زندگی دینے والا تو اللہ ہے ادھارک۔

لیکن اس نے وسیلہ تو تمہیں بنایا تھا۔

تمہیں تو زندہ رہنا ہی تھا ادھارک۔ تمہاری بیا جو تمہارا انتظار کر رہی تھی۔
ہاں۔۔ جانتی ہو شردھا میرے جانے کے بعد بیا نے کتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔
تکلیفیں۔

ہاں۔ ولید نے سر ہلایا اور پھر اسے مختصراً سب کچھ سنا ڈالا۔ فاطمہ کی آنکھیں
نم ہو گئی تھیں۔

لوگوں نے کتنا چاہا تم دونوں کو الگ کرنا مگر محبت کی ہی جیت ہوئی آخر میں۔
اسکے لہجے میں رشک تھا۔

یہ محبت ہی تو ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے جوڑے رکھتی ہے شردھا۔ محبت
تعلق سے زیادہ نسبت کہلاتی ہے۔ وہ نسبت جو کسی سے جڑ کر نسبت بن جاتی

ہے۔ زمان و مکان , گواہی و ثبوت اور ہر طرح کے دلائل سے ماوراء ہوتی ہے۔ کائنات کا سچا ترین سچ محبت ہے اور سچائیاں قبول کی جاتی ہیں۔ انہیں منوایا اور سمجھایا نہیں جاتا۔ وہ اپنے مخصوص ساحر لہجے میں بولا تھا۔ اور کمرے میں واپس آتی ایہا کے دل نے بے اختیار لا ریب (بے شک) دہرایا تھا۔

سچ کہتے ہو ادھارک۔ فاطمہ نے اپنی آنکھیں صاف کیں تبھی اسکے عقب سے حیدر کا چہرہ ابھرا تھا۔

ارے واہ اب تک آنلاؤن ہیں آپ۔ وہ مسکراتا ہوا فاطمہ کے برابر ہی بیٹھ گیا تھا۔ ایہا آکر ولید کے برابر بیٹھ گئی۔ دو پر فیکٹ کیل۔۔

جی بس اتنے عرصے بعد بات ہوئی تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ ولید مسکرایا تھا۔

آپ لوگ کبھی پاکستان آئیے ناں۔ ایہا بولی۔

نہیں بھابھی ہم اپنے کشمیر میں ہی ٹھیک ہیں۔ ہمیں اسکو پاکستان کا حصہ بنانا ہے۔ فاطمہ نے ایک عزم سے جواب دیا تھا۔ ولید کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

حیدر نے اسے واقعی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ وہ خوشگوار ماحول میں اک دوسرے سے گپ شپ کرنے لگے۔ وقت کا پہیہ چل رہا تھا۔ اور وقت کا کام تو چلتے جانا ہی ہے۔ زمان و مکاں سے بالا ہر تفریق سے پرے جو جذبہ انسانوں کو قریب لاتا ہے وہ محبت ہی تو ہے۔ وہ محبت جو ولید نے ایہا سے کی تھی

ایہا نے ولید سے کی تھی۔ حیدر نے فاطمہ اور فاطمہ نے حیدر سے کی تھی۔ اور وہ محبت جو ادھارک نے شردھا اور شردھا نے ادھارک سے کی تھی کہ محبت کے تو کئی رنگ کئی چہرے ہیں۔۔

اسکو کسی ایک صورت تک محدود کر دینا ممکن ہی نہیں۔ یہ تو ایسا عالمگیر جذبہ ہے کہ جو کئی علاقوں اور کئی زمانوں پر محیط بچھڑ جانے کے تجربے کو مختصر کر کے سب کو اک دوسرے سے قریب لے آتا ہے۔

محبت جو اک ایسا دریا ہے کہ جس کا ٹھاٹھیں مارتا پانی کسی رم جھم کا محتاج نہیں۔ اس بحر کو تو صدا موجیں ہی مارتے رہنا ہے۔۔ کیونکہ یہ محبت کے آب سے بنا ہے۔۔ محبت جو تخلیق کی روح ہے اور لاریب اسکے سوا کسی کو ثبات نہیں۔

Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews



♥ ختم شدہ ♥

ہماری ویب میں شائع ہونے والے ناولز کے تمام جملہ و حقوق بمعہ مصنفہ کے نام محفوظ ہیں۔
 ہمیں اپنی ویب نیو ایر میگزین (New Era Magazine) کیلئے لکھاریوں کی
 ضرورت ہے۔ اگر آپ ہماری ویب پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل، شاعری، پوسٹ
 کروانا چاہیں تو اردو میں ٹائپ کر کے مندرجہ ذیل ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں بھیج سکتے
 ہیں۔
 Novels|Afsana|Articles|Books|Poetry|Interviews

(Neramag@gmail.com)

(انشا اللہ آپ کی تحریر ایک ہفتے کے اندر اندر ویب پر پوسٹ کر دی جائے گی۔ مزید تفصیلات

کیلئے اوپر دیئے گئے رابطے کے ذرائع کا استعمال کر سکتے ہیں۔

شکریہ ادارہ: نیو ایر میگزین